



DECLARATION

I, **SAREER AHMAD BHAT**, hereby declare that the research embodied in the present thesis entitled, “**NIDA FAZLI: FIKR O FANN**” submitted by me under the supervision of **Dr. Md. Zahidul Haque** is a bonafide research work for the award of **Doctor of Philosophy** in Urdu from the **University of Hyderabad**. I also declare to the best of my knowledge that it has not been submitted in part or full to this or any other University or Institution for the award of any degree or diploma. I hereby declare that my thesis can be deposited in Shodganga/INFLIBNET.

Date:.....

Place: Hyderabad

Sareer Ahmad Bhat

Reg. No. 16HUPH07



CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled, “**NIDA FAZLI : FIKR O FANN**” submitted by **SAREER AHMAD BHAT** bearing Enrolment Number **16HUPH07** in partial fulfilment of the requirements for the award of **Doctor of Philosophy** in the School of Humanities, Department of Urdu is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

The thesis is free from plagiarism and has not been submitted previously in part or full to this or any other University or Institution for the award of any degree or diploma.

Papers related to this thesis have been:

A. Published in the following publications:

1. Nida Fazli Ki Ghazliya Shairi in Quarterly, Aks-E-Adab, Aurangabad, Vol:08, Issue:26, Pages 27-29, Jan-Mar-2019. (ISSN:2320-6519)
2. Basheer Badr Ki Shairana Asas in Kitabi Silsila Punjab, Malerkotla, Vol:01, Issue:03, Pages 133-136, July-2019. (ISBN:978-81-939310-7-3)

B. Presented at the following Conferences:

1. International Seminar on “Indian Religion, Philosophy & Literature” 25th to 27th February 2019, Banaras Hindu University, Banaras, India.
2. Two day National Seminar on “Sir Syed: Ahwal, Afkar Aur Asr-e-Jadeed” 26th to 27th March 2019, Satavahana University, Karimnagar, Telangana State.

Further, the student was exempted from doing coursework (recommended by Doctoral Committee) on the basis of the following courses passed during his M.Phil. Programme and the M.Phil. Degree was awarded.

S.No.	Course Code	Course Title	Credits	Result
01	UR701	Research Methodology	4.00	Pass (B+)
02	UR702	Practical Criticism	4.00	Pass (B)
03	UR721	Textual Criticism	4.00	Pass (B)
04	UR780	Dissertation	12.00	Pass (A)

Supervisor

Head of the Department

Dean School of Humanities



DEPARTMENT OF URDU
SATAVAHANA UNIVERSITY
Karimnagar - T.S



Two Day National Seminar On
Sir Syed: Ahwal, Afkar aur Asr-e-Jadeed

دو روزہ قومی سیمینار بحوالہ: سر سید: احوال، افکار اور عصر جدید

Sponsored By: National Council for Promotion of Urdu Language

certificate

This is to Certify that Saeed Ahmad Bhat University of Hyderabad.
Participated in the Two day National Seminar held on 26th & 27th March 2019

He/She Presented the Paper Titled حیات سر سید احمد خاں بلوچی شکرانی مدظلہ العالی

Dr. M.VARA PRASAD
Principal UCA&SS

Dr. NAZIMUDDIN MUNAWAR
Head & Seminar Director



काशी हिन्दू
विश्वविद्यालय



BANARAS HINDU
UNIVERSITY



अन्तर्राष्ट्रीय संजोष्टी

بین الاقوامی سیمینار

“भारतीय धर्म, दर्शन और साहित्य”

موضوع: ہندوستانی مذاہب، فلسفہ اور ادب

International Seminar on "Indian Religion, Philosophy & Literature"

25 - 27 February 2019

Certificate

This is certify that Prof./Dr./Ms./Mrs./ Saeer Ahmad Bhatt R. Sch
Dept of Urdu University of Hyderabad participated and presented his/her paper
entitled Allama Iqbal: Falsafa - e - Khudi aur Falsafa - e - Ishq
in the 3 day International Seminar on "Indian Religion, Philosophy & Literature"
and contributed towards the success of the seminar.

Mos

Organizing Secretary

Dr. Mosharraf Ali

Department of Urdu, BHU

Aftab

Convener

Prof. Aftab Ahmad Afaqui

Head, Department of Urdu, BHU



♦ Organized By: **Department of Urdu** Faculty of Arts, Banaras Hindu University

53 کلام بشیر چراغ بشیر چراغ

گوشہ تنقید و تحقیق

- 103 مقبول فیروزی شیخ العالم مجدد ریثیت
- 106 سید معظم راز ”بلے میں دبا موسم“ کا شاعر: اعظم راہی
- 112 محمد لطیف میر حالی، ترقی پسند ادب کے بنیاد گزار
- 117 ڈاکٹر محمد یوسف وانی عرفان احمد خان کی ناول نگاری (”مہوش“ کے حوالے سے)
- 124 ڈاکٹر محمد سلیمان ناول برف آشنا پرندے میں کشمیر کا کردار
- 130 ڈاکٹر پرویز احمد پالہ کشمیر کے فارسی ادب میں سائف کا مقام
- 133 سریر احمد بٹ بشیر بدر کی شاعرانہ اساس
- 137 محمد الطاف ملک جموں و کشمیر میں اردو افسانہ
- 140 آزاد ایوب بٹ کشمیر میں غیر افسانوی نثر جدید منظر نامہ
- 144 سجاد احمد نجار حکیم منظور کی شاعری میں کشمیر
- 148 ڈاکٹر رینو بہل افسانہ کستوری غزلیں

- 155 وصال کھلر | 154 مصداق اعظمی
- 156 اقبال احمد نذیر (نعم بغزلیں)

گوشہ افسانچہ نگاری

- 157 مضمون اردو افسانچہ نگاری: ایک مطالعہ محمد فاروق

افسانچے

- 163 ارشد صدیقی | 161 رونق جمال
- 167 ڈاکٹر نذیر مشتاق | 165 رحیم رضا
- 171 محمد علیم اسماعیل | 169 محمد رفیع الدین مجاہد
- 139 سالک جمیل براڑ | 173 سراج فاروقی

کتابی سلسلہ

3

پنج آب

گوشہ بشیر چراغ

مدیران

سالک جمیل براؤ | غلام نبی کمار

U.G.C. Approved 42266 ISSN 2320-6519

سرزمینِ وحی اورنگ آبادی (دکن) سے جاری ہونے والا معیاری رسالہ

قاریوں کے ایکشن کے
ماہنامہ اورنگ آباد (۸۰)

(اُردو)

عکسِ ادب

جنوری تا مارچ ۲۰۱۹ء

اورنگ آباد



ڈاکٹر عقیلہ سید غوثی

عورت کی زندگی کے روشن اور تاریک پہلوؤں پر شریفاذہ از سے
روشنی ڈالنا چاول کے دانے پر قل اللہ کی آیات مرقوم کرنے کے برابر ہے۔

ندافاضلی: فکر و فن

مقالہ برائے

ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو)

نگراں

ڈاکٹر محمد زاہد الحق

اسوسیٹ پروفیسر، شعبہ اردو

یونیورسٹی آف حیدرآباد، تلنگانہ

مقالہ نگار

سریر احمد بٹ

رجسٹریشن نمبر: 16HUPH07



شعبہ اردو

اسکول آف ہیومانٹیز

یونیورسٹی آف حیدرآباد، گچی باؤلی، حیدرآباد، تلنگانہ۔ ۵۰۰۰۴۶

۲۰۲۰ء

NIDA FAZLI: FIKR O FANN

**A Thesis Submitted to the University of Hyderabad in Partial Fulfilment
of the Requirements for the Award of
*DOCTOR OF PHILOSOPHY***

IN

URDU

By

SAREER AHMAD BHAT

Enrolment No. 16HUPH07

Supervisor

DR. MD. ZAHIDUL HAQUE

Associate Professor, Deptt. of Urdu

University of Hyderabad



DEPARTMENT OF URDU

SCHOOL OF HUMANITIES

University of Hyderabad, Gachibowli, Hyderabad,

Telangana-500046

2020

فہرست

03-07	پیش لفظ:
08-43	باب اول: نَدَافِضلی کے حالاتِ زندگی اور شخصیت
	☆ حالاتِ زندگی
	☆ شخصیت
44-103	باب دوم: نَدَافِضلی کی نثری (علمی و ادبی) خدمات
	☆ نثر نگاری
	☆ تراجم
104-283	باب سوم: نَدَافِضلی کی شاعری کا فکری و فنی مطالعہ
	☆ نَدَافِضلی کی غزلیں
	☆ نَدَافِضلی کی نظمیں
	☆ اردو دوہے کی روایت
	☆ نَدَافِضلی کے دوہے
284-307	باب چہارم: نَدَافِضلی کا فلمی سفر
308-329	ماہِصَل
330-335	کتابیات

انتساب

اپنے فرشتہ صفت والدین اور اساتذہ کے نام
جن کے دامن تربیت میں اکتسابِ فیض کیا

﴿پیش لفظ﴾

﴿پیش لفظ﴾

اللہ تعالیٰ کی شانِ اقدس میں صد ہا شکر ادا کرتا ہوں جس کے فضل و کرم اور نظر عنایت کے صدقے مجھے اُمتِ محمد ﷺ میں پیدا کر کے شعور کی دولت اور عرفان و آگہی کے نور سے منور کر کے علم کے طفیل اس مقام پر پہنچا دیا ہے، جہاں ایک طویل مسافت طے کر کے میں اپنے مقالے کی تکمیلیت کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنے جا رہا ہوں۔

ادب اپنے دور کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس آئینے میں ہمیں خارجی ماحول اور زندگی کا بنتا بگڑتا ہوا عکس روز روشن کی طرح صاف نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خارجی عوامل ادیب و شاعر کی زندگی سے اس طرح جڑ جاتے ہیں کہ وہ کبھی حصولِ مسرت کا جو یا ہوتا ہے تو کبھی افسردگی اور غم کی تصویر بن جاتا ہے۔ وہ سماج سے فطری طور پر خود کو منسلک کر لیتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے آئینے میں پوری کائنات کا عکس دیکھتا ہے اور مسرت و غم کا محاسبہ کرتا ہے۔ وہ حیرت و غم کی دولت کو مساوی اصول پر سماج میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ شعر و ادب کا مقصد بالعموم یہ ہے کہ انسان کے جذبہ تجسس کو تسکین کے مواقع فراہم کیے جائیں اور مسرت و بصیرت میں اضافہ ہو۔ فن کار اپنے تجربات و مشاہدات کی سطح پر داستانِ زندگی اور رودادِ کائنات کی پیش کش میں ان اسرار و رموز کی نشان دہی کرتا ہے جن کا تعلق حیات و کائنات کے مسائل سے وابستہ ہے۔ شاعر و ادیب کا ذہن جب تخلیق کی جانب راغب ہوتا ہے تو وہ اپنے افکار و خیالات کو شعر و ادب کے قالب میں ڈھالنے کے لیے موزوں و مناسب الفاظ و استعارات کا انتخاب کرتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کی تخلیق میں فنی اعتبار سے وہ بلندی اور ہمہ گیری پیدا نہیں ہوگی جو اعلیٰ ادب کا طرہ امتیاز ہے۔

مجھے ابتدا ہی سے شاعری پر کام کرنے کی خواہش تھی۔ اس لیے میں نے جدید دور کے ایک اہم شاعر نذافا ضلی پر کام کرنے کا ارادہ کر لیا۔ نذافا ضلی کا شمار اردو کی ان بلند قامت و ہمہ جہت شخصیات میں ہوتا ہے، جنہوں نے اردو ادب کو مختلف حیثیتوں سے متاثر کیا ہے۔ وہ اپنی متنوع دل چسپیوں کی بدولت ادبی اور سماجی حلقوں میں کافی مشہور و معروف تھے۔ وہ بیک وقت نثر نگار بھی تھے اور ایک اچھے شاعر بھی، ایک گیت کار بھی تھے اور مترجم بھی۔ جس چیز کی وجہ سے وہ ادبی دنیا میں سب سے زیادہ جانے اور پہچانے جاتے ہیں، وہ ان کی شاعری ہے۔ شاعری میں ان کا اصل میدان غزل اور نظم ہے۔ ان کی اس ہمہ جہتی کا تقاضا تھا کہ ان کے فکر و فن کا تحقیق و تنقید کی روشنی میں مکمل جائزہ لیا جائے۔ چوں کہ تحقیق میں موضوع کے انتخاب کا مرحلہ کافی مشکل

ہوتا ہے۔ راقم نے اپنے نگراں ڈاکٹر محمد زاہد الحق صاحب، جن کی نگرانی میں پہلے ہی ایم۔ فل کا مقالہ بھی جمع کیا ہے، کے ساتھ ”ندا فاضلی: فکر و فن“ کے موضوع پر صلاح و مشورے سے کام کرنے کا منصوبہ بنایا۔ بعد میں پروفیسر حبیب نثار، سابق صدر، شعبہ اردو اور دیگر ڈاکٹورل کمیٹی ممبران کی رضامندی کے بعد میرے مقالے کا موضوع ”ندا فاضلی: فکر و فن“ طے پایا۔ میں نے اپنے نگراں کے مشورے سے اس مقالے کو چار ابواب میں منقسم کیا ہے، جو حسب ذیل ہیں:

باب اول: ”ندا فاضلی کے حالات زندگی اور شخصیت“ کے عنوان کے تحت ہے۔ اس باب کو دو ذیلی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ان کی پیدائش، خاندان، تعلیم و تربیت، شادی، اولاد وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے جب کہ دوسرے حصے میں ان کی علمی و ادبی سرگرمیاں، تصانیف، انعامات و اعزازات اور شخصیت کے اہم گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

باب دوم: ”ندا فاضلی کی نثری (علمی و ادبی) خدمات“ کے عنوان سے ہے۔ اس باب کو دو ذیلی عناوین میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ان کی نثر نگاری پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے جب کہ دوسرے حصے میں ان کے تراجم کا ذکر کیا گیا ہے۔

باب سوم: ”ندا فاضلی کی شاعری کا فکری و فنی مطالعہ“ پر مشتمل ہے۔ یہ اس مقالے کا اہم اور مرکزی باب ہے۔ اس باب کو چار ذیلی حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ان کی غزلیہ شاعری کے فکر و فن پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے جب کہ دوسرے حصے میں ان کی نظمیں شاعری کے فکر و فن پر گفت و شنید کی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں اردو دوہے کی روایت کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب کہ چوتھے حصے میں ندا فاضلی کی دوہا نگاری کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔

باب چہارم: ”ندا فاضلی کا فلمی سفر“ کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں ان کے گیت اور فلمی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی ماہیانگاری کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

ماحصل کے ذیل میں ندا فاضلی کی ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے فکر و فن پر معروضی نقطہ نظر سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اردو شعر و ادب میں موصوف کے مقام و مرتبے کا تعین کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مقالے کے آخر میں الفبائی ترتیب سے کتابیات کو شامل کیا گیا ہے اور دوران تحقیق جن رسائل و جرائد سے استفادہ کیا ہے، ان کو بھی درج کیا گیا ہے۔

اولین اخلاقی فرض کے تحت میں اپنے رفیق و شفیق والدِ محترم حاجی عبدالاحد بٹ صاحب اور والدہ محترمہ زینہ بیگم صاحبہ کا بہت ممنون ہوں جن کی شفقت و محبت اور تربیت نے میرے لیے اس مقام تک پہنچنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ بلکہ یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اس مقالے کی تکمیل میں میری محنت کے ساتھ ساتھ میرے والدین کی تاکید، یاد دہانی اور وقت پر کام کی تکمیل کا جذبہ بھی کارفرما رہا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں ابدی و عارضی دنیاؤں کی تمام خوشیاں عطا کرے اور مجھ پر ان کی شفقت کا سایہ برقرار رکھے (آمین)۔ اس کے علاوہ میں اپنے برادران بشیر احمد بٹ، مشتاق احمد بٹ اور نثار احمد بٹ صاحبان کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے ہر وقت تعلیم و تربیت کے معاملے میں بڑے بھائی ہونے کا کردار بہ درجہ اتم ادا کیا ہے۔ خاص کر بشیر احمد بٹ صاحب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے حوصلہ دیا، میرے ساتھ ساتھ میرے سایے کی طرح چلتے رہے، جہاں کہیں بھی میرے قدم ڈگمگائے وہ میرے ساتھ میری طاقت بنے رہے، مجھے کبھی مایوس نہیں ہونے دیا۔ وہ میرے ساتھ ایک مخلص دوست کی طرح پیش پیش رہے اور میری ہر جائز خواہش کو پورا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے (آمین)۔ میں اپنی اکلوتی بہن سائمہ بانو کا بھی شکر گزار ہوں جس نے ہمیشہ میری کامیابیوں پر خوشی و مسرت کا اظہار کیا اور اپنی دعاؤں میں مجھے ہمیشہ یاد رکھا۔ میں اپنے بھتیجوں آصف، محسن، شعیب، شاہد، مومن، منیب، عماد اور عزیز کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے دورانِ تحقیق میری مدد کی۔ خاص طور سے محسن اور آصف کا ممنون ہوں جنھوں نے پروف ریڈنگ کے سلسلے میں اپنا تعاون پیش کیا۔

میں اپنے نگراں محترم ڈاکٹر محمد زاہد الحق صاحب کا صمیم قلب سے ممنون ہوں اور احسان مندی کا اعتراف کرتا ہوں جنھوں نے موضوع کے انتخاب سے لے کر مواد کی فراہمی اور مقالے کی تکمیل تک نہایت ہی شفقت اور خلوص کے ساتھ میری قدم قدم پر رہنمائی اور نگرانی کی ہے۔ ان کی رہنمائی محض شعبے یا تحقیقی مراحل تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ نجی طور پر بھی انھوں نے ہر معاملے میں میری رہنمائی فرمائی ہے۔ وہ میرے آئیڈیل (Ideal) استاد رہے ہیں۔ ان کی نگرانی اور رہنمائی میں کام کرنا میرے لیے باعثِ فخر ہے۔ میں سابق صدر شعبہ اردو استاد محترم پروفیسر حبیب نثار صاحب کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے مجھے ہمیشہ اپنے علمی مشوروں سے مستفید کیا اور ضرورت آن پڑنے پر ہر وقت میری مدد و رہنمائی فرمائی ہے۔ ان کی فعال اور متحرک شخصیت نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔

میں شعبے کے صدر محترم پروفیسر سید فضل اللہ مکرم صاحب کے ساتھ ساتھ شعبے کے دیگر اساتذہ کا شکر گزار ہوں، جنہوں نے تحقیق کے دوران بالخصوص ڈاکٹر لکمیٹی میٹنگ میں نیک اور مفید مشوروں سے نوازا۔

میں اپنی ہم سفر حمیرا بٹ کا نہایت مشکور ہوں، جن کی قربت اور خلوص کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مجھے ہر وقت آگے بڑھنے کی تلقین کرتی ہیں اور مجھے ایک اچھے مقام پر دیکھنے کی خواہاں ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے تحقیق کے دوران میری ذہنی کیفیات کے اتار چڑھاؤ کو محسوس کرتے ہوئے حوصلہ اور ہمت افزائی بھی کی ہے۔

میں اپنے عزیز دوستوں میں آبرو ریاض، عشرت رسول، اسمائیل اور شبنم علی کا احسان مند ہوں جنہوں نے میرے مقالے کی پروف ریڈنگ (Proof Reading) میں کافی حد تک مدد کی اور قدم قدم پر میرا ساتھ دیا۔ میں اپنے دوستوں میں ڈاکٹر رافد اولیس بٹ، شبیر احمد بٹ، محمد وسیم بٹ، ناظم ظہور، ہلال احمد، اولیس احمد، ڈاکٹر محمد سرور لون، رئیس احمد، تابش امین، عمر اشرف، ڈاکٹر جمشید احمد ٹھوکر، گلزار احمد ماگرے، مشتاق فاروق، سجاد صوفی، مدثر بشیر، ڈاکٹر وسیم حسن، ڈاکٹر بلال احمد، ڈاکٹر سجاد احمد، ڈاکٹر اشفاق احمد، ڈاکٹر جاوید احمد، ڈاکٹر جنید احمد، ڈاکٹر شوکت احمد، منظور احمد، ڈاکٹر عاقب احمد، ڈاکٹر توفیق احمد وغیرہ کا بھی شکر گزار ہوں، جنہوں نے تحقیق کے دوران وقتاً فوقتاً ثمر بخش مشورے دیے ہیں۔ خاص طور سے ڈاکٹر رافد اولیس کا شکر گزار ہوں جن سے تحقیق کے دوران زیادہ قربت رہی ہے۔ تحقیق کے معاملے میں ان سے اکثر گفتگو ہوتی رہی ہے اور ہر وقت انہوں نے سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مفید مشورے دیے ہیں۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں ندا فاضلی کی شریک حیات محترمہ مالتی جوشی صاحبہ اور ان کی بیٹی تحریر فاضلی کا شکریہ ادا نہ کروں۔ انہوں نے تحقیق کے دوران ضرورت کے وقت میری مدد کی ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے آج میرا تحقیقی مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔

سریر احمد بٹ

20 نومبر 2020

باب اول:
نَدَافِضَلٰی کے حالاتِ زندگی اور شخصیت

﴿حالاتِ زندگی﴾

﴿شخصیت﴾

﴿حالاتِ زندگی﴾

کسی بھی فن کار کی شخصیت، زندگی، اس کے فکر و فن اور خدمات کا جائزہ لینے اور اس کی قدر و منزلت متعین کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے عہد، ماحول، معاشرتی، تاریخی اور ادبی حالات کا جائزہ لیا جائے۔ فن کار اپنے تجربات و مشاہدات کی سطح پر داستانِ زندگی اور رودادِ کائنات کی پیش کش میں ان اسرار و رموز کی نشان دہی کرتا ہے جن کا تعلق حیات و کائنات کے مسائل سے وابستہ ہے۔ شاعر و ادیب کا ذہن جب تخلیق کی جانب راغب ہوتا ہے تو وہ اپنے افکار و خیالات کو شعر و ادب کے قالب میں ڈھالنے کے لیے موزوں و مناسب الفاظ و استعارات کا انتخاب کرتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کی تخلیق میں فنی اعتبار سے وہ بلندی اور ہمہ گیری پیدا نہیں ہوگی جو اعلیٰ ادب کا طرہ امتیاز ہے۔ اردو شعر و ادب میں نڈا فاضلی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اردو کے ان چند خوش قسمت شاعروں میں سے ہیں جنہیں عوام و خواص میں یکساں اہمیت و مقبولیت حاصل ہے۔

خاندان:

نڈا فاضلی کے مطابق ان کے والد کے پاس ایک شجرہ تھا جس میں ”فاضل“ نام کے ایک شخص سے ان کے خاندان کی ابتدا ہوئی تھی۔ ”فاضلہ“ کشمیر کا ایک علاقہ ہے، جو ان کا آبائی وطن ہے۔ لیکن تحریری طور پر انھوں نے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ان کے سوانحی ناول ”دیواروں کے بیچ“ میں بھی اس حوالے سے انھوں نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ فاضل اور کشمیر کے تعلق کے حوالے سے وہ اپنے ایک انٹرویو میں قیاس آرائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”میرے والد کے پاس ایک شجرہ تھا۔ اس شجرہ کی ابتدا ایک فاضل نام کے شخص سے ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ فاضل صاحب کشمیر سے آئے ہوں۔ کیوں کہ وقت کے ساتھ مٹی کا سفر صدیوں سے جاری ہے۔ پتہ نہیں دو چار جزیریشن پہلے کون کیا تھا اور کیا نہیں تھا۔ بس زندگی یوں ہی چلتی رہتی ہے۔“¹

اسیم کاویانی نے اپنی کتاب ”نڈا فاضلی“ میں نڈا کے تخلص اور خاندانی پس منظر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

”گمان ہوتا ہے کہ مقتدی حسن نے جب اپنی شاعری کا آغاز کیا تو اپنے

تخلص ندا کے ساتھ فاضلی کی نسبت یوں جوڑ دی ہوگی کہ اس سے ایک فضیلت نمایاں ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ”فاضلہ“ کشمیر کے کسی علاقے کا نام نہیں ہے۔ ان کی زندگی میں جب کبھی ان کے خاندان کے کشمیری تعلق کی بات پوچھی گئی تو انھوں نے گول مول جواب ہی دیا تھا۔ ممبئی کے روزنامہ انقلاب کے لیے ذاکر خان ذاکر نے ان سے لیے گئے ایک انٹرویو میں (جو کہ ان کا آخری انٹرویو ثابت ہوا تھا) جب یہی سوال اٹھایا تو ندا فاضلی نے اپنے جواب میں کہا تھا:

وقت کے ساتھ ہے مٹی کا سفر صدیوں سے
کس کو معلوم کہاں کے ہیں، کدھر کے ہم ہیں
آدمی اور مٹی کا رشتہ صدیوں پرانا ہے۔ اس رشتے کو میں علاقے، مذہب
اور زبان سے جوڑنا نہیں چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ غالب کے انسان کا رشتہ
کشمیر سے بھی ہے، ایران سے بھی ہے، پاکستان سے بھی ہے، امریکہ
سے بھی ہے، انگلینڈ سے بھی ہے۔ میرے والد کے پاس ایک شجرہ تھا،
اس شجرہ کی ابتدا ایک فاضل نام کے شخص سے ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ
فاضل صاحب کشمیر سے آئے ہوں۔“ 2

راقم الحروف کا ماننا ہے کہ اگر واقعی ندا فاضلی کے والد کے پاس کوئی شجرہ تھا جس کی ابتدا فاضل نام کے شخص سے ہوئی تھی تو اس کا ذکر انھوں نے اپنی تحریروں میں کیوں نہیں کیا۔ دوسری بات یہ کہ دراصل فاضلہ نام کی کوئی جگہ کشمیر میں نہیں ہے۔ اس لیے جب بھی ان سے فاضلہ کے تعلق سے سوال کیا جاتا تھا تو وہ گول مول جواب دیتے تھے۔

والد:

ندا فاضلی کے والد کا نام مرتضیٰ حسن تھا۔ بعض محققین کے مطابق ان کی پیدائش قصبہ ڈبائی میں ہوئی جو علی گڑھ کے قریب ایک علاقہ ہے۔ پیشہ سے وہ سندھیا اسٹیٹ ریلوے میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے۔ ندا فاضلی ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کی تنخواہ اچھی خاصی تھی اور تنخواہ کے علاوہ اوپر کی آمدنی بھی آتی تھی۔ وہ رنگین مزاج اور فیشن پرست آدمی تھے۔ عیش و عشرت کی محفلوں میں بیٹھنا، طوائفوں کی صحبت

اور مجرے دیکھنا ان کا مشغلہ تھا۔ زیب النسا جو سندھیا دربار کی ایک مغنیہ تھی، سے ان کا خاص تعلق تھا۔
ندا فاضلی اپنے والد کا خاکہ درج ذیل الفاظ میں کھینچتے ہیں:

”میرے والد صاحب کافی رنگین مزاج ہیں۔ مجرے، مشاعرے اور
نئے پرانے شوق ہیں۔ گوالیار میں اپنے بہن بھائیوں سے دور تنہا رہتے
ہیں۔ ان تنہائیوں کو جوانی کے ہاتھوں خوب تقسیم کیا۔ کئی طوائفوں سے
شنا سائیاں ہیں۔ ایک سے تو سنتے ہیں دولڑکے بھی ہیں۔ لیکن ان کے
ناموں میں ان کا نام شامل نہیں ہے۔ گھر میں اچھی شکل و صورت کی
بیوی ہے اور ساتھ میں سندھیا دربار کی ایک مغنیہ کی زلف کے اسیر بھی
ہیں۔ اس مغنیہ کا نام زیب النسا ہے۔ ریڈیو سے کلاسیکی میوزک کے
پروگرام دیتی ہے۔“ 3

مرتضیٰ حسن نے اپنے دور کے صفِ اول کے شعرا میں جگہ بنائی تھی۔ وہ دعا تخلص استعمال کرتے
تھے۔ مرتضیٰ حسن کو داغ دہلوی کے جانشین نوح ناروی کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ ان کے تین شعری
مجموعے ”تصویر درد“، ”تاثیر درد“ اور ”تنویر درد“ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے شاعری کی مختلف
اصناف میں طبع آزمائی کی جن میں قطعہ، غزل، نظم، رباعی، گیت اور واسوخت شامل ہیں۔ ندا فاضلی اپنے
والد کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

”میرے والد دعا ڈبائیوی داغ اسکول کے نمائندہ شاعر تھے۔ داغ
اسکول سے متعلق شعرا کلام داغ کو سند کا درجہ دیتے ہیں۔“ 4

مرتضیٰ حسن نے زیادہ تر طویل بحروں میں شاعری کی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہندوستان
سے اپنی محبت کا اعتراف کیا ہے۔ ان کی شاعری کا نمونہ پیش خدمت ہے:

خاموش زبان ہو جاتی ہے ہر ظلم روا ہو جاتا ہے
جب سامنے وہ آ جاتے ہیں کیا جانے کیا ہو جاتا ہے

تکلیف کا رفتہ رفتہ سب احساب فنا ہو جاتا ہے
خود درد دوا بن جاتا ہے جب حد سے سوا بن جاتا ہے

دعا اب تک میرے دل میں وہی عظمت ہے لشکر کی
کہیں نقل سکونت سے وطن کی یاد جاتی ہے

مرتضیٰ حسن کی شادی 35 سال کی عمر میں امت الحبيب کی چھوٹی صاحبزادی جمیل فاطمہ سے ہوئی جو ان سے عمر میں دس سال چھوٹی تھی۔ جمیل فاطمہ دہلی کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ مرتضیٰ حسن کے والد کا نام سید علی حسن تھا۔ وہ ڈبائی میں رہتے تھے۔ مرتضیٰ حسن کی پیدائش 13 جون 1900 کو ڈبائی میں ہوئی تھی۔ انھوں نے ڈبائی سے تعلیم حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ سینٹرل ریلوے گوالیار کے دفتر میں کلرک کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس طرح ان کی آمد گوالیار ہوئی اور وہ مستقل طور پر وہاں مقیم ہو گئے۔ ان کے دو بڑے بھائی اور ایک بہن ڈبائی میں رہتے تھے۔ مرتضیٰ حسن کا انتقال 9 جنوری 1985 کو کراچی میں ہوا۔ تقسیم ہند کی لکیر اور ہجرت کی بد قسمتی نے نداء فاضلی کو اپنے والد کے جنازے میں شریک ہونے سے روکا۔ اس سانحے کا اثر ان کے باشعور ذہن پر پڑا جس کا اظہار انھوں نے اپنی نظم ”والد کی وفات پر“ میں کیا ہے۔ محمد یوسف رضانے اپنی کتاب ”نداء فاضلی: حیات و جہات“ میں اس واقعے کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

”جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو اس وقت ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سرحد پر ماحول کشیدہ تھا۔ جس کی وجہ سے نداء فاضلی اپنے والد کے جنازے میں شامل نہیں ہو سکے۔ اپنے والد کی موت کا ہر انسان کو غم ہوتا ہے اور وہ اپنے طریقے سے اس غم کا اظہار بھی کرتا ہے اور دل کو تسلی دینے کی کوشش کرتا ہے۔ نداء فاضلی نے بھی اپنے والد کی موت کے غم اور جنازے میں شریک نہ ہونے کے غم کو اپنی شاعری کے ذریعے ہلکا کرنے کی کوشش کی اور والد کے نام ایک نظم لکھی جس کا عنوان ”والد کی وفات پر“ ہے۔“ 5

والدہ:

نداء فاضلی کی والدہ کا نام جمیل فاطمہ تھا۔ مذہبی مزاج رکھنے والی جمیل فاطمہ دہلی کے ایک معزز اور شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ جمیل فاطمہ کی ایک بڑی بہن اور ایک بڑا بھائی بھی تھا۔ شادی کے وقت ان کی عمر 25 سال تھی جب کہ مرتضیٰ حسن 35 سال کے تھے۔

اس سلسلے میں محمد یوسف رضا اپنی کتاب ”ندا فاضلی: حیات و جہات“ میں لکھتے ہیں:

”مرتضیٰ حسن کی شادی 35 سال کی عمر میں امت الحیب کی چھوٹی صاحبزادی جو مرتضیٰ حسن سے دس سال چھوٹی تھیں، جمیل فاطمہ سے ہوئی تھی۔ وہ دہلی کے ایک باعزت اور سادات گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں بھی شعر و شاعری کا ذوق تھا اور خواتین کی نشستوں میں شرکت کرتی تھیں۔ فکر و سخن میں اتنی محو رہتی تھیں کہ اپنے سارے کام بھول جاتی تھیں۔ ان کے اشعار ماہنامہ ”عصمت“ یا ”رہنمائے تعلیم“ میں چٹنی کے تخلص سے شائع بھی ہوئے۔“ 6

جمیل فاطمہ کی شخصیت اور ذوق شاعری کے متعلق اسیم کاویانی اپنی کتاب ”ندا فاضلی“ میں رقم طراز ہیں:

”ندا کی والدہ جمیل فاطمہ دہلی کے ایک سید خاندان کی مذہبی مزاج کی خاتون تھیں۔ وہ اکثر گھر میں میلاد کی مجلس منعقد کیا کرتی تھیں اور کچھ شعر و شاعری کا ذوق بھی رکھتی تھیں۔ ندا کی خود نوشت سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ددھیال یا ننھیال کا کوئی بزرگ یا رشتے دار گوالیار میں بودو باش نہیں رکھتا تھا اور گھر میں جمیل فاطمہ کے پاس ایک نوکرانی کے سوا کوئی نہ تھا۔ مرتضیٰ حسن کی رنگین مزاجی اور ہمیشہ آدھی رات کے بعد گھر لوٹنے کی عادت نے ندا کی والدہ کو اختلاج قلب کی مریض بنا دیا تھا۔ وہ محلے کی عورتوں کے مشوروں سے تعویذ، گنڈے، وظیفے، درگاہ پر حاضری اور مرادوں کے روزوں وغیرہ سے اپنے شوہر کو بس میں کرنے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ ندا کی سوانح سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی والدہ ایک مظلوم اور صابر و شاکر خاتون تھیں۔ ان کی زندگی کا مقصد اپنے شوہر اور اولاد کی بہبودی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔“ 7

جمیل فاطمہ نے اس رشتے کو بخوبی نبھایا۔ ان کے لطن سے آٹھ اولادیں پیدا ہوئیں۔ جن میں پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں شامل ہیں۔ سب سے پہلے قمر طلعت پیدا ہوئیں۔ اس کے بعد مصطفیٰ حسن اور پھر ندا فاضلی پیدا ہوئے۔ جمیل فاطمہ نے اپنے بچوں کی پرورش احسن طریقے سے کی۔

بھائی بہن:

نڈا فاضلی کے چار بھائی تھے جن کے نام یوں ہیں، مصطفیٰ حسن، مجتبیٰ حسن، مبتدی حسن اور تسلیم فاضلی۔ اس کے علاوہ ان کی تین بہنیں بھی تھیں جن کے نام اس طرح ہیں، قمر طلعت، جاوید اور شاہینہ۔ قمر طلعت نڈا کی بڑی بہن تھی۔ بھائیوں میں مصطفیٰ حسن سب سے بڑے تھے۔ نڈا فاضلی کے بڑے بھائی مصطفیٰ حسن پاکستان شینگ کارپوریشن میں جنرل مینجر کے عہدے پر فائز تھے۔

تسلیم فاضلی نے پاکستان فلم انڈسٹری میں خوب نام کمایا۔ انھوں نے نہایت کم عمری میں فلمی نغمے لکھنے شروع کر دیے تھے۔ اس کے بعد بہت ساری فلموں کے لیے گیت لکھے۔ ان کے کچھ گیت بہت زیادہ پسند کیے گئے جن میں ”خدا کرے کہ محبت میں وہ مقام آئے، رفتہ رفتہ وہ میری ہستی کا سماں ہو گئے اور تجھے پیار کرتے کرتے میری عمر بیت جائے“ قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے پاکستان کی معروف اداکارہ نشوونگم کے ساتھ شادی کی تھی۔ تسلیم فاضلی کو پاکستانی فلم انڈسٹری کی جانب سے ”آئینہ“ (1976)، ”شبانہ“ (1977) اور ”بندش“ (1980) فلموں کے بہترین نغمے لکھنے پر ”نگار ایوارڈ“ سے سرفراز کیا گیا۔ ان کا انتقال 1982 میں کراچی میں ہوا۔

پیدائش:

نڈا فاضلی کا اصل نام مقتدی حسن ہے۔ لیکن وہ اردو شعروادب میں نڈا فاضلی کے نام سے مشہور ہوئے۔ نڈا ان کا تخلص ہے جس کے معنی ”صدایا آواز“ کے ہوتے ہیں۔ نڈا فاضلی کے نام سے مشہور ہونے والے مقتدی حسن کی تاریخ پیدائش میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ محققین ان کی تاریخ پیدائش 1940 لکھتے ہیں۔ جب کہ بعض کے نزدیک ان کی پیدائش 1938 میں ہوئی۔ دہلی بلدیہ کے اندراج میں بھی ان کی تاریخ پیدائش 1938 درج کی گئی ہے۔ ان کے اہل خانہ بھی ان کی تاریخ پیدائش 1938 بتاتے ہیں۔ راقم الحروف نے ذاتی طور پر نڈا فاضلی کی شریک حیات مالتی جوشی سے فون پر بات کر کے نڈا فاضلی کی تاریخ پیدائش کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بھی یہی بتایا کہ ان کی تاریخ پیدائش 1938 ہی درست ہے۔ بقول نڈا فاضلی ان کی پیدائش جمیل فاطمہ کی مرضی کے خلاف ہوئی۔ ان کی والدہ نے اسقاطِ حمل کی ہر ممکن

کوشش کی لیکن پھر بھی ان کی پیدائش روکنے میں ناکام رہیں۔ رواجِ زمانہ کے مطابق ان کی والدہ دہلی اپنے میکے آئی تھیں جہاں نندا فاضلی کی پیدائش ہوئی۔ نندا فاضلی اپنے سوانحی ناول ”دیواروں کے بیچ“ میں لکھتے ہیں:

”اس ولادت کی تاریخ دہلی کارپوریشن کے رجسٹر میں 12 اکتوبر

1938ء درج کی جاتی ہے۔“ 8

ایک اور جگہ نندا فاضلی اپنی پیدائش کے واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

”جمیل فاطمہ اب تیسرے بچے کی ماں بننے والی ہیں۔ دو کے بعد تیسرا

بچہ ایسی حالت میں مناسب نہیں ہے لیکن کیا کیا جائے۔ تین مہینے

پورے ہو چکے ہیں۔ ایسے کام چھپ چھپ کر ہی کیے جاتے ہیں۔ سنی

سنائی جڑی بوٹیوں سے ہی خدا کے کام میں دخل اندازی کی جاتی

ہے۔۔۔ ابھی یہ سلسلہ جاری ہے کہ ایک دن دہلی میں ان کے پانو

تلے سے آبائی گھر کی چھت کھسک جاتی ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ وہ صبح غسل

خانے سے باہر آئی ہے لیکن جیسے ہی پانو بڑھاتی ہے چھت دھسنے لگتی

ہے۔ وہ ٹوٹی چھت سے سیدھے نیچے فرش پر گرنے کو ہوتی ہے کہ ان

کے ہاتھ میں لوہے کا سر یا آجاتا ہے۔ اتفاق سے ان کے بھائی اس

وقت مکان کی مرمت کروارہے تھے، پتھروں کے گرنے کی آواز سے وہ

چونک کر اوپر دیکھتے ہیں اور اپنی بہن کو زمین و آسمان کے درمیان لٹکا ہوا

پاتے ہیں۔ وہ بانہیں پھیلا کر آگے بڑھتے ہیں اور اپنی بہن کو سر یا

چھوڑنے کو کہتے ہیں۔ کئی لوگ جمع ہیں، فرش پر ردی کے گدے، تولیے

بچھا دیے جاتے ہیں۔ بچوں کے رونے، چلانے اور عورتوں کی چیخ و پکار

میں وہ آخر بھائی کی بانہوں میں گر جاتی ہے، گرتے ہی بے ہوش ہو جاتی

ہے۔ فوراً اسپتال لے جایا جاتا ہے جہاں وقت سے پہلے ہی جمیل فاطمہ

اپنی مرضی کے خلاف تیسرے بچے کو جنم دیتی ہے۔ اس کا نام بڑے

لڑکے مصطفیٰ حسن کے قافیہ کی رعایت سے مقتدی تجویز ہوتا ہے۔ یہی

مقتدی حسن آگے چل کر خود کو قافیہ کی پابندی سے آزاد کر نندا فاضلی بن

جاتا ہے۔“ 9

جس طرح نندا فاضلی کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ اسی طرح ان کی جائے پیدائش کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ اگرچہ نندا فاضلی اپنے سوانحی ناول ”دیواروں کے بیچ“ میں اپنی جائے پیدائش کو دہلی لکھتے ہیں لیکن بعض محققین نے ان کی جائے پیدائش گوالیار قرار دیا ہے۔ امراتنی مہاراشٹر سے شائع ہونے والے سہ ماہی ”اردو“ ممبئی سے شائع ہونے والے کتابی سلسلہ ”اعتراف“ اور سیفی سروجنی کی کتاب ”نندا فاضلی کا تخلیقی سفر“ میں نندا فاضلی کی جائے پیدائش گوالیار بتائی گئی ہے۔ غلام ابن سلطان نے بھی اپنے مضمون ”نندا فاضلی: جانے والوں سے دلوں کا سلسلہ جاتا نہیں“ میں گوالیار کو ہی ان کی جائے پیدائش قرار دیا ہے۔ اپنی جائے پیدائش کے بارے میں نندا فاضلی یوں رقم طراز ہیں:

”ہر بچے کی پیدائش دہلی میں ہوتی ہے۔ وہ اب تیسرے بچے کی ماں

بننے والی ہے۔۔۔ فوراً ہاسپٹل لے جایا جاتا ہے جہاں وقت سے

پہلے جمیل فاطمہ اپنی مرضی کے خلاف تیسرے بچے کو جنم دیتی ہیں۔ اس کا

نام بڑے لڑکے مصطفیٰ حسن کے قافیے کی رعایت سے مقتدی تجویز ہوتا

ہے۔ یہی مقتدی حسن آگے چل کر قافیے کی پابندی سے خود کو آزاد کر کے

نندا فاضلی بن جاتے ہیں۔ اس ولادت کی تاریخ دہلی کارپوریشن کے

رجسٹر میں 12 اکتوبر 1938 درج کی جاتی ہے۔“ 10

ڈاکٹر زیبا محمود نے اپنے مضمون ”نندا فاضلی کا شعری اظہار“ میں نندا فاضلی کی جائے پیدائش دہلی کو قرار دیا۔ اسی طرح ڈاکٹر کلیم ضیاء نے بھی اپنے مضمون ”نندا فاضلی کی علمی و فلمی شخصیت“ میں دہلی کو ہی ان کی جائے پیدائش بتایا ہے۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق نندا فاضلی کی پیدائش 12 اکتوبر 1938 کو دہلی میں ہوئی۔ اس حوالے سے جب میں نے ذاتی طور پر نندا فاضلی کی اہلیہ مالتی جوشی سے ندا کی جائے پیدائش کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے بتایا:

”ندا صاحب دہلی میں 12 اکتوبر 1938 میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے

اپنی کتاب ”دیواروں کے بیچ“ میں اس کا ذکر کیا ہے۔“ 11

نَدافاضلی کو اپنے والدین سے ہمیشہ یہ شکایت رہتی تھی کہ وہ دوسرے بچوں کو ان سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ اس طرح وہ احساسِ کمتری کا شکار رہتے تھے۔ بچپن میں چڑچڑے پن، کمزور جسم اور خاموش طبیعت رکھنے والے نَدافاضلی کا بچپن کا نام ”بگی“ تھا۔ جسمانی طور پر کمزور ہونے کی وجہ سے وہ اکثر بیمار رہتے تھے۔ اس ضمن میں نَدافاضلی رقم طراز ہیں:

”ذرا سی محنت تھکا دیتی ہے اور موسم کی ذرا سی تبدیلی سینے کو جکڑ لیتی ہے۔ گھر میں سب سے الگ تھلگ ہیں۔ اپنی ہر ضرورت کا اظہار خاموشی کی زبان میں کرنے کا عادی ہے اور یوں ہی نئی نئی غلط فہمیوں کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ کبھی ماں سے ناراض ہوتا ہے اور کبھی بلا وجہ بہن بھائیوں سے خفا ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ اس شک میں مبتلا رہتا ہے کہ والدین اس سے زیادہ دوسروں کو چاہتے ہیں۔“ 12

نَدافاضلی کا بچپن گوالیار میں گزرا۔ گوالیار میں وہ ایک پرانے طرز کے کشادہ مکان میں رہتے تھے۔ کئی کمروں پر مشتمل یہ گھر محلے کی عورتوں کا مرکز تھا۔ خاص کر صبح سویرے آس پاس کی ساری عورتیں ان کے گھر کے صحن میں جمع ہوتی تھیں۔ اس کی وجہ ان کے صحن کا نل تھا۔ پورے محلے میں صرف ان کے گھر میں نل تھا۔ گھر کے آس پاس سبز پیڑ اور ان پر چھکتے پرندے ان کو ہر وقت مسرور رکھتے تھے۔ اس منظر کی عکاسی اسیم کا ویانی اپنی کتاب ”نَدافاضلی“ میں یوں کرتے ہیں:

”گوالیار کی نئی سڑک پر واقع ان کا ایک بڑے دالان اور آنگن والا، کئی کشادہ کمروں پر مشتمل اونچی دیواروں کا پرانا گھر تھا۔ اس گھر میں دائیں بائیں کئی دروازے تھے۔ آنگن میں ایک گھنا املی کا درخت تھا، جس میں بارہ مہینے کھٹے کٹارے جھولتے رہتے تھے۔ صدر دروازے کے پاس ایک چوڑے پیٹ والا نیم کا درخت تھا۔ مکان کے پچھواڑے ایک تنگ گلی تھی، جس کے خاتمے پر ایک کنواں تھا۔ محلے بھر میں صرف ان ہی کے مکان میں پانی کا نل لگا ہوا تھا، جس پر ان کے مکان کے قریب کی کوئی ذات کی بستی کی لڑکیاں اور عورتیں سویرا ہوتے ہی اپنے اپنے گھر کے لیے پانی بھرنے چلی آتی تھیں۔ ایک طرح سے اپنے گھر کے املی اور نیم کے پیڑ اور ظاہر ہے ان کی شاخوں پر چھکتے پرندوں سے

نڈا کا بچپن ہی سے گہرا تعلق ہو گیا تھا۔“ 13

نڈا فاضلی کا بچپن بڑے ہنگامہ خیز ماحول میں گزرا۔ انھوں نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ افرا تفری اور سیاسی انتشار کا زمانہ تھا۔ پورے ملک میں سیاسی انتشار اور ہلچل کا زمانہ تھا۔ ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورا بھارت مذہبی، علاقائی اور تہذیبی لڑائی سے دوچار تھا۔ ہندوستانی لوگ تقریباً اپنی دو سو سالہ آزادی کی لڑائی کا ثمر آور حل چاہتے تھے اور اس کے قریب بھی آ گئے تھے۔ جہاں ایک طرف آزادی قریب تھی وہیں دوسری طرف ہندوستان کے بیچ ایک خونی لکیر کھینچ رہی تھی جس نے ہندوستان کے ہر فرد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہندوستان کے ہر فرد کے ساتھ نڈا فاضلی اور ان کا خاندان بھی اس آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ ان سب حادثات کا اثر پوری زندگی ان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری پر بھی پڑا۔

تعلیم:

نڈا فاضلی نے ابتدائی تعلیم (پانچویں جماعت تک) حضورات اسکول مادھو گنج، گوالیار سے حاصل کی۔ اسکول جانے سے پہلے وہ بیم نامی خاتون کے پاس قرآن پڑھنے جاتے تھے۔ اس کے بعد ان کا داخلہ وی سی ہائی اسکول میں کر دیا گیا۔ جہاں سے انھوں نے 1955 میں میٹرک کا امتحان تیسرے درجے (Third Division) میں پاس کیا۔ نڈا فاضلی کا رجحان پڑھائی کی طرف زیادہ نہیں تھا لیکن والدہ کے اصرار کی وجہ سے وہ پڑھائی کی طرف مائل ہوئے۔ ان کی والدہ انھیں ڈاکٹر بنانا چاہتی تھیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ان کا داخلہ وکٹوریہ کالج میں سائنس اسٹریم میں کر دیا گیا۔ سائنس میں دو سال لگا تار ناکام ہونے کے بعد ان کا شعبہ بدل کر آرٹس کر دیا گیا۔ اسی دوران کچھ وجوہات کی بنا پر اس کالج کا نام تبدیل کر کے رانی لکشمی بائی رکھا گیا۔ اس کالج میں اردو بھی ایک مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا تھا۔ جب کالج میں اردو پڑھنے والے طلباء کی تعداد میں کمی آنے لگی تو اس کالج سے اردو بھی ختم ہو گئی۔ اس طرح ان کو بی اے میں ہندی لینا پڑی۔ انھوں نے 1961 میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے وکرم یونیورسٹی اجین سے اردو اور ہندی میں ایم اے کی تعلیم مکمل کی۔

نَدا فاضلی ملازمت کی تلاش میں گوالیار کو خیر باد کہتے ہوئے صنعتی و تجارتی شہر ممبئی چلے آئے۔ ممبئی میں وہ روزگار کے سلسلے میں کئی برسوں تک جدوجہد کرتے رہے۔ اس کے بعد چھوٹے موٹے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے، اردو اور ہندی رسائل میں لکھنے لگے اور جزوقتی (Part Time) ملازمتیں کرنے لگے۔ نَدا فاضلی ممبئی کے کاروباری اور مسابقتی دباؤ سے تنھکے ماندے تاجروں کو اپنی خوش کلامی سے خوش کر کے اپنے معاشی مشکلات حل کرتے رہے۔

ماہنامہ ”شاعر“ میں نَدا فاضلی اعزازی طور پر بہ حیثیت معاون مدیر خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ وہ ”دھرم یگ“ اور ”نفت روزہ“ ”بلٹن“ میں کالم نویس اور تبصرہ نگاری بھی کرتے رہے۔ بدری کالج والا نے انھیں اپنے فلمی اخبار ”رس نٹ راج“ کے ہندی ایڈیشن کے لیے کم اجرت پر اسٹنٹ کے طور پر رکھ لیا تھا۔ لیکن جب ان کو نَدا فاضلی سے بھی کم تر اجرت پر کام کرنے والا مل گیا تو انھوں نے نَدا کو وہاں سے نکال دیا۔ چند مہینے بھگوت ساہے نائٹ کالج گوالیار میں انگریزی پڑھاتے رہے۔ دہلی میں روزگار کی تلاش میں کچھ مہینے گزارے لیکن کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔

بدری پرشاد کی سفارش پر نَدا فاضلی کو Irrigation Office میں تین مہینے کے لیے کلرک کی نوکری مل گئی۔ سلام مچھلی شہری کی مدد سے ان کی مالی دشواریوں میں کمی واقع ہوئی۔ شاہد علی خان کے توسط سے نَدا فاضلی کو مکتبہ جامعہ میں ایک کام مل گیا تھا جو صرف ایک گھنٹے کا ہوتا تھا۔ اس کے عوض انھیں دو سو چار (204) روپے ماہوار ملتے تھے۔ انھوں نے سردار جعفری کے جریدے ”گفتگو“ میں مختصر مدت تک کام کیا۔ یہاں انھیں کام زیادہ کرنا پڑتا تھا اور اجرت کم ملتی تھی۔ اس ضمن میں اسیم کاویانی اپنی کتاب ”نَدا فاضلی“ میں لکھتے ہیں:

”انھوں نے (نَدا فاضلی) سردار جعفری کے جریدے ”گفتگو“ میں مختصر

مدتی ملازمت کی تھی جہاں ان کے کاموں میں انگریزی مواد کے ترجمے،

سردار کی منشا کے مطابق تبصرہ نگاری، جریدے کی چھپائی کی نگرانی، اس

کی پیکنگ اور اسے ڈاک خانے کے سپرد کرنے تک کے کام شامل

تھے۔ اس پر بھی ان کا ڈیڑھ سو روپیوں کا مختانہ انھیں بیس تیس اور پچاس

روپیوں کی قسطوں میں دیا جاتا تھا۔“ 14

”گفتگو“ میں نَدا فاضلی نے صرف چھ (6) مہینے کام کیا۔ اس کے بعد انھوں نے خود کو اس رسالے

سے الگ کر لیا۔ جب ان کو کوئی مستقل کام نہیں ملا تو انھوں نے مشاعروں میں شرکت کی اور فلموں کے لیے گیت لکھنا شروع کر دیے۔ اس کام میں وٹھل بھائی ٹیل نے ان کا ساتھ دیا۔ اسی طرح فلم ساز کمال امر وہی نے بھی ان کو گیت لکھنے کی طرف مائل کیا۔ نڈا فاضلی نے فلم ”رضیہ سلطان“ کے لیے دو گیت لکھے اور اپنی شہرت کا لوہا منوایا۔ اس طرح وہ اپنی معاشی حالت سدھارنے میں کسی حد تک کامیاب ہوئے۔ نڈا فاضلی کو ملازمت راس نہیں آئی۔ انھوں نے ادب کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین بنایا تھا۔

شادی و ازدواجی زندگی:

نڈا فاضلی اپنے والد کی طرح کافی رنگین مزاج تھے۔ اپنے والد کی طرح ان کے بھی کئی معاشقے رہے۔ کبھی مس ٹنڈن کے ساتھ، کبھی محمودہ کے ساتھ اور کبھی عشرت کے ساتھ عشق کیا۔ نڈا فاضلی کو دورانِ تعلیم مس ٹنڈن سے عشق ہو گیا تھا لیکن وہ حادثے کا شکار ہو گئی۔ ان کی موت کا صدمہ انھیں بہت دیر تک رہا۔ وہ پہلے کبھی محمودہ نامی ایک اسکول ٹیچر پر بھی مائل ہو گئے تھے لیکن جب نڈا فاضلی کی ماں (جمیل فاطمہ) تک یہ خبر پہنچی تو انھوں نے محمودہ کی تین پشتوں کی خرابیاں نکال کر ان کی محبت کا وہ باب ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔

نڈا فاضلی نے اپنے دوست بیر کمار کی بیوی شیدا سے بھی جنسی تعلقات بڑھائے تھے۔ شیدا پیشے سے ایک طوائف تھی لیکن بیر کمار اس کو بہت چاہتا تھا۔ دونوں گھر سے بھاگ کر ایک ساتھ رہتے تھے۔ جب بیر کمار کا انتقال ہو گیا تو شیدا نے پھر سے طوائف کا پیشہ اختیار کیا۔ شیدا اور نڈا فاضلی ایک دوسرے کے ساتھ جسمانی ضروریات پوری کرتے تھے۔

اس کے بعد نڈا فاضلی کی ملاقات عشرت سے ہوئی۔ وکٹوریہ کالج میں تعلیم کے دوران نڈا فاضلی اور عشرت کا عشق پروان چڑھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرنے کے باوجود الگ ہو گئے۔ ایک بار یہ طے پایا کہ دونوں گھر سے بھاگ کر شادی کر لیں گے۔ عشرت طے شدہ مقام پر پہنچ گئی لیکن نڈا فاضلی وہاں نہیں پہنچ سکے۔ عشرت کو ان کے نہ پہنچنے سے بہت زیادہ تکلیف ہوئی۔ نڈا فاضلی اور عشرت کا رشتہ کبھی بنتا گیا اور کبھی بگڑتا گیا۔ نڈا کی بڑی بہن نے اس رشتے کو استوار کرنے کی بہت کوشش کی۔ دونوں کا نکاح بھی کر لیا مگر نکاح کے کچھ دنوں بعد عشرت گوالیار چلی گئی اور اپنے ایک سینئر اسٹوڈنٹ سے شادی کر لی۔ اس

طرح نڈا فاضلی اور عشرت کا بنتا بگڑتا رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

نڈا فاضلی اور عشرت کی ناکام شادی کے بعد وہ مالتی جوشی سے اپنی قربتیں بڑھانے لگے۔ مالتی جوشی گجراتی فلموں کی مشہور اداکارہ تھیں۔ جب ان دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی تو مالتی جوشی اپنی آواز میں ان کی غزلیں ریکارڈ کرنا چاہتی تھیں۔ اس طرح ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا اور وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ انھی دنوں نڈا فاضلی بیمار ہوئے تو ان کی ساری دیکھ بھال مالتی جوشی نے بڑی اپنائیت کے ساتھ کی۔ جب نڈا فاضلی اور مالتی جوشی کی قربتوں کی خبر اس کے گھر پہنچی تو وہ مخالفت پر اتر آئے۔ مالتی جوشی ان باتوں کی پرواہ کیے بغیر ان کے ساتھ رہنے کے لیے تیار ہو گئیں۔ اس حوالے سے محمد یوسف رضا اپنی کتاب ”نڈا فاضلی: حیات و جہات“ میں لکھتے ہیں:

”نڈا سے مالتی کی قربتوں کی خبر جب مالتی کے گھر پہنچی تو ان کے گھر والے ان سے بہت خفا ہوئے اور وہ اس کی مخالفت پر اتر آئے۔ لیکن مالتی نے ان کی باتوں کو نہیں مانا اور ایک روز وہ اپنے ساتھ کچھ کپڑے لے کر نڈا فاضلی کے گھر آ گئیں اور دونوں بیوی شوہر کی طرح رہنے لگے۔ کچھ دن کے بعد جب ان کے اس رشتے کی خبر چاروں طرف پھیلی تو لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔“ 15

اس طرح نڈا فاضلی اور مالتی جوشی کا رشتہ ہو گیا۔ نڈا اور مالتی نے اس رشتے کو بہ خوبی نبھایا۔ شادی کے سات برس بعد ان کے گھر میں ایک ننھی بچی نے جنم لیا جس کا نام ”تحریر فاضلی“ رکھا گیا۔

اولاد:

نڈا فاضلی اور مالتی جوشی کی ازدواجی زندگی کامیابی سے بسر ہوئی۔ شادی کے سات سال بعد یعنی 1999 میں ان کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام ”تحریر فاطمہ“ رکھا گیا۔ یہ نام کچھ روز کے بعد ”تحریر فاطمہ“ سے ”تحریر فاضلی“ ہو گیا۔ تحریر کی پیدائش سورت (گجرات) میں ہوئی۔ ان کی پرورش ممبئی میں ہوئی۔ انھوں نے کملا دیوی انٹر کالج سے بارہویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ آج کل وہ گریجویشن کے دوسرے سال میں ماس میڈیا اینڈ ورٹائزنگ (Mass Media Advertising) کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

شاعری کا آغاز:

نَدافاضلی کو شاعری کا فن وراثت میں ملا تھا۔ ان کے گھر پر اکثر شعری نشستوں کا انعقاد ہوتا تھا جس سے ان میں شعری ذوق پیدا ہوا۔ اسی ذوق نے ان میں شعر کہنے کا ہنر پیدا کیا۔ انھوں نے محض 13 سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ ان کے ابتدائی اشعار کی اصلاح ریاض جیوری کرتے تھے۔ ریاض جیوری اسکول میں ان کے استاد تھے۔ اسکول جاتے وقت نَدافاضلی اپنے استاد سے گفتگو کے دوران اشعار سنایا کرتے تھے۔ نَدافاضلی کے ابتدائی اشعار کا نمونہ درج ذیل ہے:

قدر الفت میں ستم گر نے نہ جانی میری
ہائے دل ہائے جگر ہائے جوانی میری

وفائیں تم کیے جاؤ جھنائیں ہم کیے جائیں
تمہیں وہ کام آتا ہے ہمیں یہ کام آتا ہے

و کٹوریہ کالج (گوالیار) میں طالب علمی کے زمانے میں ان کی ہم جماعت لڑکی (مس ٹنڈن) کا اچانک انتقال ہو جاتا ہے۔ نَدافاضلی اس حادثے کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس شدید کرب کا اظہار وہ شاعری میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کو مناسب الفاظ نہیں مل پاتے۔ اسی زمانے میں ایک ڈوبتی ہوئی شام وہ کسی پہاڑی پر واقع ایک مندر سے سورداس کے بھجن کو سنتے ہیں۔ بھجن کے بول کچھ اس طرح کے تھے:

”مدھو بن تم کت رہت ہرے

ورہ ویوگ شیم سندر کے ٹھاڑھے کیوں نہ جرے

کون کاج کھڑے رہے بن میں، کیوں نہ اُکٹی پرے“

(مدھو بن تم کیسے ہرے بھرے ہو۔ میں تو اپنے شیم کے فراق میں جل رہی ہوں اور تم پر کوئی اثر نہیں ہے۔ میری طرح تم بھی اس آگ میں کھڑے کھڑے کیوں نہیں جل گئے۔ تمہارے اس طرح کھڑے رہنے کا کیا کارن ہے۔ اتنے بھاری غم میں تم جڑ سے کیوں نہیں اکھڑ گئے۔)

نَدافاضلی نے لکھا ہے کہ بھجن کے یہ بول آہستہ آہستہ اس کے ذہن کی گانٹھ کھولنے میں معاون ثابت ہوتے رہے۔ غم کے نام الگ الگ ہوتے ہیں لیکن ان کی کسک ایک سی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں نَدافاضلی طراز

ہیں:

”مدھوبن کے پیڑ، پھول خاموشی سے رادھا کے درد کو سنتے ہیں اور
شرمندہ ہو کر اداس ہو جاتے ہیں۔ انسان اور فطرت کا یہ مکالمہ جس میں
چرند، پرند، پیڑ اور انسان ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھ دار ہیں،
نندا کو چونکا تا ہے۔ اس بھجن کے بول دھیمے دھیمے اس گانٹھ کو کھولنے لگتے
ہیں جو کئی دنوں سے اس کے ذہن میں کہیں اکجھی ہوئی تھی۔ اسے لگتا ہے
مس ٹنڈن کے کالج سے اچانک غائب ہو جانے اور رادھا کے شام
سے بچھڑنے میں کوئی ان دیکھا رشتہ ہے۔ اپنی ظاہری شباهتوں کے
پیچھے ہر دکھ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔“ 16

اس بھجن سے متاثر ہو کر نندا فاضلی کئی مہینے خاموش رہنے کے بعد کئی نظمیں کہتے ہیں۔ انہی نظموں میں
ایک نظم کے دو مصرعے ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں:

سائے کو چھونا سائے کو کھونا ہے
سندرتا کا پیار جنم کا رونا ہے

نندا فاضلی کی پہلی تخلیق نظم ”سندرتا“ تھی جو ماہنامہ ”سریتا“ کے اردو ادیشن میں شائع ہوئی۔ اسی
دوران انھوں نے کچھ گیت بھی لکھے جو دھرم ویر بھارتی کے ہندی رسالے ”دھرم یگ“ میں شائع ہوئے۔
یہی گیت بعد میں ”تلاش“ اور ”تخلیق“ جیسے جریدوں کی زینت بنے۔

تصانیف:

نندا فاضلی نے نثر و نظم دونوں میں طبع آزمائی کی۔ وہ اردو اور ہندی میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔
انھوں نے اردو شاعری میں سات (7) اور اردو نثر میں پانچ (5) کتابیں تحریر کی ہیں۔ اس کے علاوہ ہندی
میں بھی ان کی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ نندا فاضلی کی کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے:

اردو شاعری:

(1969)

(1) لفظوں کا پُل

(1978)

(2) مورناچ

- (3) آنکھ اور خواب کے درمیان (1986)
 (4) کھویا ہوا سا کچھ (1996)
 (5) شہر میرے ساتھ چل (2004)
 (6) زندگی کی طرف (2007)
 (7) شہر میں گاؤں (کلیات) (2012)
 (8) سب کا ہے ماہتاب (2014)

اردو نثر:

- (1) ملاقاتیں (1986)
 (2) دیواروں کے بیچ (1992)
 (3) دیواروں کے باہر (2000)
 (4) چہرے (2002)
 (5) دنیا میرے آگے (2008)

ہندی تصانیف:

- (1) مورناچ
 (2) آنکھوں بھرا آکاش
 (3) کھویا ہوا سا کچھ
 (4) سفر میں دھوپ تو ہوگی
 (5) ہم قدم
 (6) ندافاضلی کی شاعری (انتخاب)
 (7) چندہ شاعری (گرکھی میں انتخاب)
 (8) تماشا میرے آگے (نثر)

انعامات و اعزازات:

نَدا فاضلی نے بھرپور اور مصروف ادبی زندگی گزاری۔ انھیں ان کی ادبی خدمات کے لیے بہت سے انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ 1998 میں ان کے شعری مجموعے ”کھویا ہوا سا کچھ“ پر انھیں ساہتیہ اکادمی انعام سے سرفراز کیا گیا۔ 2002 میں انھیں غالب ایوارڈ برائے نثر سے نوازا گیا۔ 2003 میں نَدا فاضلی کو فلم ”سُر“ کے بہترین نغمہ نگار کے لیے اسٹار اسکرین ایوارڈ (Star Screen Award) دیا گیا۔ 2003 میں ہی انھیں Bollywood Movie Award سے نوازا گیا۔ مدھیہ پردیش حکومت نے 2004 میں انھیں اپنے سب سے بڑے ادبی ایوارڈ ”شکھر سمان“ سے سرفراز کیا۔ 2013 میں نَدا فاضلی کو حکومت ہند کی طرف سے پدم شری (Padma Shri) سے نوازا گیا۔ نَدا فاضلی کو امیر خسرو ایوارڈ کے علاوہ میر تقی میر ایوارڈ بھی ملا۔ اردو اکادمی لکھنؤ کی جانب سے 2016 کا اول انعام مشترکہ طور پر نَدا فاضلی اور اجمل سلطان پوری کو دیا گیا۔ انھیں دہلی سے جے دیال ہارمونی ایوارڈ برائے شاعری سے بھی سرفراز کیا گیا۔ نثری کتاب ”ملاقاتیں“ پر انھیں ایم پی شائن ساہتیہ پریشڈ پرسکار دیا گیا۔ اس کے علاوہ ان کی شاعرانہ صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے مختلف ریاستوں نے انھیں انعامات و اعزازات سے نوازا جن میں مہاراشٹر، اتر پردیش، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، راجستھان اور بہار قابل ذکر ہیں۔

مشاعروں میں شرکت:

نَدا فاضلی کو شاعرانہ ماحول ورثے میں ملا تھا۔ ان کے گھر میں اکثر شعر و شاعری کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ان محفلوں سے ان میں شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ اس ذوق کو جلا بخشنے میں ریاض جیوری نے اہم رول ادا کیا۔ نَدا فاضلی جدوجہد کے دنوں میں چھوٹے موٹے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے اور اپنی شہرت کا لوہا منوانے میں کسی حد تک کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے ملکی و بیرون ملکی مشاعروں میں شمولیت کی۔ گورکھپور کے آل انڈیا مشاعرے میں ان کی شاعری کو کافی داد و تحسین سے نوازا گیا۔ اس مشاعرے میں انور جلال پوری نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انور جلال پوری نے نَدا فاضلی کو مدعو کرتے ہوئے کہا تھا:

”وہ (نَدا فاضلی) مشاعروں کی بھی عظمت ہیں اور ہمارے ادب کا بھی اعتبار ہیں۔ وہ نثر لکھ دیں تو چمکنے لگتی ہے، گفتگو وہ کر لیں تو مہکنے لگتی ہے،

شاعری کر دیں تو عظمت سی ٹپکنے لگتی ہے۔ یہ نڈافاضلی کا کارنامہ ہے جو ہمارے ادب کو اس وقت بہت ہی شگفتہ بنا رہے ہیں اور ہمارے ادب کو اپنا لہودے کر اس کو عالمی ادب کی صف میں کھڑا کر رہے ہیں۔“ 17

1988 میں نڈافاضلی نے انڈوقطر کے سالانہ مشاعرے میں شرکت کی۔ 1989 میں انھوں نے

جشن جمال الدین مشاعرے میں حصہ لیا جو دبئی میں منعقد ہوا۔ 1994 میں World Trade Center دبئی میں جشن کیفی اعظمی مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا، انھوں نے اس مشاعرے میں بھی شرکت کی۔ 1994 میں دبئی میں جشن محشر مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے میں بھی وہ شریک ہوئے۔ اس مشاعرے کی نظامت انور جلال پوری کر رہے تھے۔ 1996 میں انڈوقطر مشاعرے میں نڈافاضلی نے اپنی شاعری پیش کی۔ 1998 میں دہلی کے لال قلعے میں جشن آزادی کا مشاعرہ ہوا تھا جس میں دہلی کے وزیر اعلیٰ بھی موجود تھے اور بی جے پی کے اہم لیڈران بھی شریک ہوئے تھے۔ اس مشاعرے کا انعقاد دہلی اردو اکادمی نے کیا تھا۔ جب نڈافاضلی کو مدعو کیا گیا تو وہ مسکراتے ہوئے چہرے اور سنجیدہ آنکھوں سے وزیر اعلیٰ کو دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے ایک نظم پڑھی جس کا عنوان ”ایک قومی رہنما کے نام“ تھا۔ جیسے جیسے وہ نظم پڑھتے گئے وزیر اعلیٰ اور دوسرے لیڈران کے چہروں کا رنگ بدلنے لگا۔ جب نظم ختم ہوئی تو سامعین کی طرف سے انھیں کافی داد و تحسین ملی۔

نڈافاضلی نے جموں اور سری نگر میں بھی مشاعروں میں شرکت کی۔ جموں و کشمیر کے مشاعروں میں شرکت کے حوالے سے روندراکول نے ایک انٹرویو میں نڈافاضلی سے ایک سوال پوچھا تھا کہ وہاں (کشمیر) کے ادبی ماحول کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے نڈافاضلی نے کہا:

”میں جموں و کشمیر کے مشاعرے میں حاضر ہوا۔ کشمیر کا ایک قافیہ ہے ”شمشیر“ اور دوسرا ہے ”تحریر“۔ کچھ دنوں سے یہ ضرور ہے کہ ”شمشیر“ حاوی ہے لیکن میرا یقین ہے کہ لال دید جبہ خاتون اور شیخ العالم کی زمین ہمیشہ ”تحریر“ کے حسن سے رنگین رہی ہے اور آئندہ بھی حسین رہے گی۔ کشمیر کو ”زمین کی جنت“ کہا گیا ہے۔ جنت سے Bible میں بھی شیطان کو باہر کر دیا گیا تھا اور قرآن میں بھی اس کی نافرمانی کی سزا دی گئی تھی۔ میری دعا ہے کہ یہ دنیا کی جنت جسے ”کشمیر“ کہا جاتا ہے، اس

میں بھی شیطان کی حکمرانی کو بھی آگے نہیں بڑھنے دیا جائے۔“ 18

اس کے علاوہ نذافاضلی نے بہت سارے مشاعروں میں شرکت کی جن میں مشاعرہ مسقط، اندور مشاعرہ، جگجیت سنگھ مشاعرہ، جشن ہریانہ، مشاعرہ موراری باپو ممبئی، اورنگ آباد مشاعرہ، لاہور مشاعرہ، شام شعر مشاعرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ہیوسٹن کے عالمی مشاعرے میں نذافاضلی نے کہا تھا:

”زندگی صرف آنک یا لڑائی نہیں ہوتی، حسن کی انگڑائی بھی ہوتی ہے، عشق کی تنہائی بھی ہوتی ہے اور ہیوسٹن میں غزل سرائی بھی ہوتی ہے۔“

19

نذافاضلی شعر سنانے سے پہلے تمہید باندھنا نہیں بھولتے تھے۔ وہ بیشتر اوقات کلام کی تمہید میں کہے گئے جملوں سے مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ باپ کی موت پر کراچی نہ پہنچنے کا ملال، کراچی سے لوٹنے پر اسی فقیر کا ممبئی میں ملنا، فساد کے دنوں کے قصے اور شاعری کی تاریخ وغیرہ ان کے تمہیدی موضوعات ہوتے تھے جن کو وہ بار بار دہراتے تھے۔ نذافاضلی نے فروری 2016 کے پہلے ہفتے میں ”جشن لکھنؤ“ کے مشاعرے میں شرکت کی جو ان کا آخری مشاعرہ ثابت ہوا۔ انھوں نے مشاعروں میں شرکت کر کے اپنی شاعری کا لوہا پوری دنیا میں منوایا۔ اس کے ساتھ ساتھ سامعین کی طرف سے بھی ان کو کافی داد و تحسین ملی۔ مشاعروں میں نذافاضلی کے شعر پڑھنے کا انداز دوسروں سے بالکل منفرد تھا۔ وہ پہلا مصرع دوبار دہراتے تھے اور اپنے دونوں بازو اوپر اٹھا کر کندھے تک لے جاتے تھے۔ نذافاضلی ہندستان کی ادبی تنظیموں کے سرگرم رکن تھے۔ مشاعروں میں ان کی موجودگی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔

سیر و سیاحت:

نذافاضلی جب سن شعور کو پہنچے تو ان کے گھر کے سارے افراد ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے جس کی وجہ سے ان کے سامنے روزی روٹی کے مسائل پیدا ہوئے۔ تلاش روزگار اور مشاعروں کے سلسلے میں انھوں نے دہلی، بھوپال، کلکتہ، اندور، پنجاب، کشمیر، راجستھان، ممبئی جیسے شہروں کا رخ کیا۔ انھوں نے کبھی روزگار کے سلسلے میں اور کبھی مشاعروں کے سلسلے میں مختلف ریاستوں کا سفر کیا۔ ان کے یہاں مسلسل سفر کا احساس ہوتا ہے، جب انھیں احساس ہوتا ہے کہ وہ ٹھہر سے گئے ہیں تو وہ پھر نئی منزلوں کی تلاش میں نکل

پڑتے تھے۔

نڈا فاضلی کی شہرت و مقبولیت کے پیش نظر بیرونی ملکوں سے انھیں دعوت نامے آتے رہے۔ اس طرح انھوں نے بین الاقوامی سطح پر بھی اپنی پہچان بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے دنیا کے مختلف ممالک میں اردو ادب کی نمائندگی کی جن میں امریکہ کی مختلف ریاستیں، کناڈا کے مختلف مراکز، ملیشیا، بنگلہ دیش، لندن کے مختلف مقامات، پاکستان کے کئی شہر، سعودی عرب کے کئی مراکز اور جرمنی کے کئی مراکز شامل ہیں۔ ان ممالک کی سیر وہ مشاعروں کے سلسلے میں کرتے رہے۔ اس کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے کچھ لکھاریوں سے ان کے اچھے مراسم بھی تھے۔

انجمن التحریک سے وابستگی:

نڈا فاضلی کا شمار اردو کے ان جدید شعرا میں ہوتا ہے جنھیں ترقی پسند تحریک کے دم توڑنے کے بعد شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایک طرف ان کی شاعری روایت سے توانائی حاصل کرتی ہے تو دوسری جانب جدیدیت سے یاری بھی نبھاتی ہے۔ ایک طرف ان کی شاعری میں ترقی پسند تحریک کے اثرات دکھائی دیتے ہیں تو دوسری جانب اسی تحریک کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے خود کو کسی تحریک سے وابستہ نہیں کیا۔ پروفیسر اسرار اللہ انصاری اس ضمن میں لکھتے ہیں:

”نڈا نے جب جوانی کے دور میں قدم رکھا اور شعر و ادب میں اپنی پہچان بنانی چاہی تو اس وقت ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ بعد ازاں جدیدیت کا بھی انھوں نے استقبال کیا۔ نڈا نے ان تحریکات و رجحانات سے اکتساب فیض تو ضرور کیا مگر خود کو کسی ایک تحریک کا پابند بنا کر نہ رکھا اور اپنی راہیں ایسی متعین کیں جس میں ان رجحانات کی مستحسن خوبیوں کے ساتھ ساتھ نئی خوشبو بھی نظر آتی ہے۔ اس وجہ سے ان کی انفرادیت بہت جلد ادب میں واضح اور الگ دکھائی دینے لگی۔“ 20

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ نڈا فاضلی کی شاعری کو روایت، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی اصطلاحی خانہ بندیوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے ان تحریکات و رجحانات سے اکتساب فیض کیا۔

وفات:

نڈا فاضلی فروری 2016 کے پہلے ہفتے میں ”جشن لکھنؤ“ کے مشاعرے میں شرکت کے لیے لکھنؤ گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے لوٹے تو ٹھنڈ نے انھیں بری طرح جکڑ لیا تھا۔ دو دن تک وہ بخار اور زکام میں مبتلا رہے، اس کے بعد ان کی طبیعت مسلسل بگڑتی گئی۔ آخر کار ان کا انتقال 8 فروری 2016 کو ممبئی میں دل کا دورہ پڑنے سے ہوا۔ نڈا فاضلی 77 سال، 3 مہینے اور 27 دن کی عمر گزارنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہو گئے:

اس کو رخصت تو کیا تھا مجھے معلوم نہ تھا
سارا گھر لے گیا گھر چھوڑ کے جانے والا

انھیں ممبئی کے ورسوا قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ ان کی آخری رسومات ان کی بیوی، بیٹی اور کچھ دوستوں نے ادا کیں۔ مالتی جوشی نے بتایا کہ جب نڈا صاحب صبح کو حسبِ معمول اپنے وقت پر بستر سے نہیں اٹھے تو وہ انھیں جگانے کے لیے گئیں۔ ان کے ہلانے پر بھی انھوں نے کوئی حرکت نہیں کی تو ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ ڈاکٹر نے انھیں مردہ قرار دیا۔ ان کی قبر کے کتبے پر یہ شعر کندہ ہے:

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمین تو کہیں آسمان نہیں ملتا

نڈا فاضلی اپنی تحریروں اور اپنی شاعری سے ہمارے ذہن و دل میں اس طرح سے رچ بس گئے ہیں کہ صدیوں تک انھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ 9 فروری 2016 کو ہندوستان کے مختلف اخباروں میں ان کی موت کی خبر شائع ہوئی۔ ان کی موت پر ادبی حلقوں میں سوگ منایا گیا۔ ہندوستان کے وزیراعظم نریندر مودی نے ان کی موت پر اپنے غم کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

”نڈا فاضلی صاحب اب ہمارے بچ نہیں رہے۔ لیکن ان کی شاعری،

سنیما اور نثر میں ان کی خدمات ہمیشہ ہمارے درمیان رہیں گے۔ ان کا

نہ رہنا سچ مچ بے حد افسوس ناک ہے۔“ 21

ادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ فلمی دنیا نے بھی اپنے اپنے انداز میں نڈا فاضلی کو خراج تحسین پیش کیا۔ مشہور گلوکارہ لتا منگیشکر نے اپنے غم کا اظہار اس انداز میں کیا:

”آج مشہور شاعر نذرا فاضلی صاحب کا انتقال ہوا۔ اس بات کا مجھے بہت دکھ ہے۔ اللہ انھیں جنت عطا فرمائے، یہ میری دلی دعا ہے۔“

22

سونیا گاندھی، رابل گاندھی، امیتا بھ بچن اور دیگر شخصیات نے بھی نذرا فاضلی کی وفات پر گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ عامر فاروقی نے ان کی موت پر بہت افسوس کیا۔ انھوں نے ایک نظم ”نذرا فاضلی: ابھی تم سانس لیتے ہو“ لکھ کر انھیں خراج تحسین پیش کیا:

نذرا فاضلی: ابھی تم سانس لیتے ہو

سنا ہے موت تم کو آگئی ہے

بنا سوچے / بنا سمجھے

کسی نے یہ خبر / یوں ہی اڑائی ہے

تمہیں یہ موت / چھو بھی نہیں سکتی

تمہارا جسم ٹھنڈا ہے / مگر تم سانس لیتے ہو

ہمارے ساتھ چلتے ہو / کبھی دوہے میں ڈھلتے ہو

کبھی نظموں کے مصرعوں سے / ہمیں آواز دیتے ہو

تمہاری موت کی سچی خبر / جس نے اڑائی تھی

وہ جھوٹا تھا / وہ جھوٹا تھا

غزل میں تم / غزل کے بانگین میں تم

خلوص و امن میں ہو تم / دلوں کو جوڑنے میں تم

جہاں انسانیت کا ذکر ہوتا ہے / وہاں ہو تم

یہ کس نے کہہ دیا کہ موت تم کو آگئی ہے

تمہارے ذہن سے نکلی ہوئی خوشبو

کئی ذہنوں میں روشن ہے

وہیں پر تم بھی زندہ ہو / وہیں پر تم بھی زندہ ہو 23

نذرا فاضلی کی رحلت کے ساتھ ہی اردو دنیا میں سناٹا چھا گیا ہے۔ ادب کی فضا سو گوار ہو گئی۔ وہ اپنے

آخری ایام تک مشاعروں سے جڑے رہے۔ انھوں نے ہندو مسلم ا یکتہ کے لیے بہت کام کیا۔ نڈافاضلی کو ان کی شاعری کی بدولت ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

﴿شخصیت﴾

شخصیت کی ایک جامع و مانع تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ سادہ الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی انسان کی شخصیت اس کی اکتسابی و غیر اکتسابی خصوصیات کا مجموعہ ہے۔ اکتسابی صفات میں انسان کی علمی سطح، اس کا پیشہ، اخلاق و آداب، گفتگو، تہذیب، اور اس کی فکر و غیرہ شامل ہیں۔ غیر اکتسابی صفات میں ہمارا رنگ، نسل، شکل و صورت، جسمانی ساخت اور ذہنی صلاحیت وغیرہ شامل ہیں۔ امریکی ماہر نفسیات Gordon Allport شخصیت کی تعریف کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں۔

"Personality is the dynamic organization within the individual of those psychophysical systems that determine his characteristics behaviour and thought." 24

آکسفورڈ ڈکشنری میں شخصیت کی تعریف یوں کی گئی ہے:

”وہ صفت یا صفات کا مجموعہ جو ایک شخص کو دوسرے شخص سے ممتاز کرتا ہے۔ مخصوص ذاتی یا انفرادی کردار، خصوصاً جب وہ ایک نمایاں قسم کا ہو۔“ 25

شخصیت فرد کے ذہنی، جسمانی، شخصی برتاؤ، رویوں، اوصاف اور کردار کے مجموعے کا نام ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ شخصیت انسان کی ظاہری و باطنی صفات، نظریات، اخلاقی اقدار، افعال، احساسات و جذبات سے منسوب ہے۔ شخصیت کی تعمیر میں حسن اخلاق، حسن معمولات، سچائی و صداقت، تواضع و انکساری، عزم و حوصلہ اور سنجیدگی و برداشت جیسی صفات پائی جاتی ہیں۔

حلیہ:

نڈا فاضلی کا حلیہ کچھ اس طرح تھا، گورا چٹا رنگ، دراز قد، چھریا بدن، خوب صورت کھلتا ہوا چہرہ، مناسب آنکھیں اور ان پر چشمہ، باریک بھنویں، مناسب پلکیں، کشادہ پیشانی اور سب سے پُرکشش ان کے لمبے لمبے گھنے بال تھے جو پیچھے تک لٹکے ہوئے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے آگے کے بال جھڑ گئے

تھے۔ وہ داڑھی اور مونچھ رکھنے کے عادی نہیں تھے۔ ان کے ہونٹوں پر ہمہ وقت ایک خفیف سی مسکراہٹ رہتی تھی۔ ان کے حلیے کے بارے میں انور ظہیر خاں لکھتے ہیں:

”ندا فاضلی کا دہانہ چوڑا ہے، کندھے مضبوط ہیں، ہاڑا اہل پنجاب کا سا ہے،۔۔۔ سینہ فراخ اور دل بھی کسی صاحبِ خیر کی طرح فراخ ہے۔۔۔ گال نہ گول ہیں نہ گُلگُلہ، البتہ بھرے بھرے سے ہیں۔۔۔ سرخی مائل بڑی بڑی آنکھیں، مے نوشی اور شب بیداری کا خمار لیے ہوئے۔ آواز کھر دری مگر سماعت پر بار نہیں۔ کشادہ پیشانی بلکہ آدھا سر پیشانی میں شامل۔۔۔ چہرہ، داڑھی، مونچھ کی گراں باری سے عاری ہے۔“ 26

لباس:

ندا فاضلی لباس میں زیادہ تر گرتا پاجامہ پہنتے تھے۔ کبھی کبھی پینٹ شرٹ میں بھی ملبوس نظر آتے تھے۔ وہ مشاعروں میں بیشتر اوقات کوٹ پتلون پہن کر جاتے تھے۔ مالتی جوشی کے مطابق ندا فاضلی نے دو چار بار شیروانی بھی پہنی تھی۔ گلے میں سونے کی چین پہنا کرتے تھے۔ ایک کلائی میں سنہرے رنگ کی گھڑی اور دوسری میں طلائی بریسلیٹ پہنتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ دائیں ہاتھ کی انگلی میں یاقوتی انگوٹھی پہننے کے عادی تھے۔ اس حوالے سے پورن پتلیج لکھتے ہیں:

”دائیں ہاتھ کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی، کلائی میں سونے کا بریسلیٹ اور گلے میں سونے کی زنجیر۔ گہرے رنگ کا کرتا پہنے کبھی وہ بریسلیٹ والی کلائی کو گھماتے تھے تو کبھی گلے کی زنجیر پر اپنی انگلی گھماتے تھے۔“

غذا:

ندا فاضلی کھانے کے بہت شوقین تھے۔ وہ سبزی اور گوشت دونوں کھاتے تھے لیکن گوشت کھانا ان کو زیادہ پسند تھا۔ اپنے گھر میں ہی کھانا پینا پسند کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کھانے کے لیے ان کی کوئی خاص ضد نہیں ہوتی۔ وہ زیادہ تر مالتی جوشی کی پسند کا کھانا کھاتے تھے۔ جب Non-Veg کا من کرتا تو خود ہی بنا لیتے تھے۔ شامی کباب، سیخ کباب اور پراٹھا وہ چاؤ سے کھاتے، کھلاتے تھے۔ مچھلی کھانا بھی ان کو پسند تھا۔

اس کے علاوہ کبھی کبھی دوستوں کے ساتھ کھانا کھانے باہر بھی جایا کرتے تھے۔ وقار قادری نے ایک انٹرویو میں ان سے پوچھا تھا کہ ان کو کھانے میں کیا پسند ہے؟ انھوں نے جواب میں کہا تھا کہ ”بھوک میں ہر کھانا اچھا لگتا ہے۔“ راقم الحروف نے نذا فاضلی کی شریک حیات (مالتی جوتی) سے فون پر گفتگو کے دوران یہ سوال پوچھا کہ نذا فاضلی کس طرح کا کھانا پسند کرتے تھے؟ انھوں نے بتایا:

”کھانے میں ان کو سب کچھ پسند تھا۔ وہ Veg اور Non-Veg

سب کھاتے تھے۔ کبھی دوستوں سے کسی Dish کے بارے میں سنتے تو

فوراً وہاں جایا کرتے تھے۔“ 28

اندازِ گفتگو:

نذا فاضلی اپنے انداز سے سوچتے تھے اور عمدہ گفتگو کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں فن کاری زیادہ رہتی تھی۔ ان کی گفتگو میں وضاحت و صراحت بھی ہوتی تھی۔ وہ اپنی گفتگو سے دوسروں کو متاثر کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ انور ظہیر خاں اپنے مضمون میں ان کے اندازِ گفتگو پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”نذا فاضلی کو بات کرنے کا گرا آتا ہے، متاثر کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

دورانِ گفتگو وہ ایسے دل چسپ، انوکھے اور ادبی چاشنی سے پُر فقروں کا

بگھاڑ لگاتے ہیں کہ تیز، تیکھی، کڑوی اور کیلی بات بھی ذائقہ دار لگنے لگتی

ہے۔“ 29

عادات و اطوار:

نذا فاضلی سویرے چھ بجے اٹھ کر صبح کی سیر (Morning Walk) کرتے تھے۔ اردو، ہندی اور انگریزی کی کتابوں کا مطالعہ کرنا ان کی عادت تھی۔ چائے نوشی کے دوران میں اخبار پڑھنا ان کا معمول تھا۔ پورن پنکج ان کے عادات و اطوار کے بارے میں رقم طراز ہیں:

”نذا صاحب کا دن پڑھنے لکھنے اور محفلوں میں گزرتا ہے۔ وہ صبح اٹھتے

ہیں اور اپنے گھر سے تھوڑی دور یاری روڈ کے پارک میں آٹھ چکر

لگاتے ہیں اور پھر اپنے سات بنگلہ والے مکان پر آ جاتے ہیں۔ اپنی
پانچ سالہ بیٹی کے ساتھ کھیل کر چائے نوشی کے دوران ہندی اردو اور
انگریزی کے اخبار پڑھتے ہیں۔“ 30

نذا فاضلی صبح نہادھو کر ناشتہ کرنے کے بعد اپنے کام کاج میں جٹ جاتے تھے۔ کچھ کام فلموں
کا ہوتا تھا اور کچھ کام ادب سے متعلق ہوتا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ آدھا
گھنٹہ آرام کرنے کے بعد پھر سے پڑھائی لکھائی میں کھو جاتے تھے۔ مالتی جوشی کے مطابق پڑھنے لکھنے کے
علاوہ اور کوئی شوق ان کو نہیں تھا۔ رات میں ان کے گھر پر محفل جمتی تھی جس میں ادبی اور فلمی لوگ شامل ہوتے
تھے۔ ان محفلوں میں سنجیدہ بحثیں ہوتی تھیں اور ہنسی مذاق بھی ہوتا تھا۔ مذا فاضلی شراب کے عادی تھے۔
شادی سے پہلے بہت شراب پیتے تھے لیکن مالتی جوشی کے گھر میں آنے کے بعد شراب پینا کم کر دیا تھا۔ اس
کے علاوہ انھیں بیڑی، تمباکو اور پان کھانے کی عادت تھی لیکن بیٹی (تحریر) کی پیدائش کے بعد یہ سب انھوں
نے چھوڑ دیا تھا۔

مزاج و طبیعت:

نذا فاضلی کے مزاج میں سادگی اور طبیعت میں ٹھہراؤ تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے لوگوں کے ساتھ بھی
ایسے بیٹھتے تھے جیسے کسی امیر آدمی کے ساتھ بیٹھے ہوں۔ موقع محل کے حساب سے گفتگو کرنا ان کی طبیعت کا
جزو تھا۔ وہ بڑوں کا احترام کرتے تھے اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کی گفتگو عالمانہ
ہوتی تھی۔ تعصب و تکبر سے ان کی شخصیت کو سوں دور تھی۔ مالتی جوشی کے نزدیک وہ ملنسار اور Down to
Earth تھے۔ مذا فاضلی بہت نازک مزاج اور بہت حساس انسان تھے۔ وہ ہر بات کو منفرد ڈھنگ سے
سوچنے کے عادی تھے۔ انھوں نے کسی استاد شاعر سے شرفِ تلمذ حاصل نہیں کیا۔ ان کا مزاج شروع ہی سے
جدت پسند اور منفرد طبیعت کا مالک تھا۔ وہ بہت حساس تھے اس لیے ان کی روح کا اضطراب کبھی کبھی شدت
سے سامنے آتا تھا۔

مہمان نواز:

نَدّافاضلی میں خلوص، نیک نیتی، ایثار اور محبت کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ جب بھی کوئی ان سے ملنے جاتا تھا تو وہ خندہ پیشانی سے ان کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ان کی مہمان نوازی کے سب قائل تھے۔ دوست احباب کے علاوہ دیگر لوگ بھی ان کی مہمان نوازی کا اعتراف کرتے تھے۔ ان کے دوست جب ان کے گھر جاتے تھے، تو وہ ان کو اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی کھجری کھلایا کرتے تھے۔

صبر و تحمل:

نَدّافاضلی کی زندگی میں بہت سارے اتار چڑھاؤ آئے مگر انھوں نے کبھی بھی صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ انھیں اپنی زندگی میں کافی جدوجہد کرنا پڑی۔ خاندان کی پاکستان ہجرت کے بعد ان کو بہت ساری پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ انھیں ذریعہ معاش کے سلسلے میں دیگر ریاستوں کا سفر بھی کرنا پڑا لیکن کبھی بھی وہ ناامید نہیں ہوئے۔ ان کے اندر ہر غم برداشت کرنے کا مادہ پہلے سے ہی موجود تھا۔

بہ حیثیت انسان:

نَدّافاضلی ایک اچھے شاعر، نثر نگار، گیت کار اور مترجم تو تھے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ وہ خلوص و محبت کے پیکر اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کے مظہر تھے۔ وہ ہمیشہ پیار، محبت، اخوت، رواداری، ملنساری اور یکجہتی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ حسد، نفرت اور عداوت جیسی چیزوں سے وہ کوسوں دور تھے۔ بزرگوں سے عقیدت، بڑوں کا احترام، دوستوں سے محبت اور چھوٹوں کے لیے شفقت کرنا ان کا شعار تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے حب الوطنی، بھائی چارے اور امن کو فروغ دیا۔

نَدّافاضلی نے انسانیت کے درد کو اپنا درد سمجھ کر اظہار کے نئے پیرائے تراشے۔ وہ انسان کے اندر انسانیت کو دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ انسان کو مذہب اور فرقے میں تقسیم ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی شاعری انسان کو محبت اور بھائی چارگی پیدا کرنے کی طرف مائل کرتی ہے۔ ان کے نزدیک رنگ، نسل یا مذہب کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق کرنا روا نہیں ہے۔ اس ضمن میں ان کا یہ شعر دیکھیے:

کوئی ہندو، کوئی مسلم، کوئی عیسائی ہے
سب نے انسان نہ بننے کی قسم کھائی ہے

بہ حیثیت والد:

ندافاضلی اپنی بیٹی (تحریر) سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ایک دوست کی طرح پیش آتے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کو ”گڈیا“ کہہ کر پکارتے تھے۔ جب وہ مشاعروں کے سلسلے میں گھر سے باہر جاتے تو وہاں سے اپنی بیٹی کو لگا تار فون کرتے رہتے تھے۔ مشاعروں سے گھر لوٹنے پر وہ تحریر کے لیے مختلف تحفے لاتے تھے۔ راقم الحروف نے تحریر سے فون پر گفتگو کے دوران پوچھا کہ ندافاضلی بہ حیثیت والد کیسے تھے؟ انھوں نے بتایا:

"My dad was really good, with me he had a really friendly and soft nature. He was never strict to me. I was more close to him than my mom. My father calls me "Gudya" like it is my pet name. Whenever my dad used to go outside for Mushayiras for like one month or one or two days, he used to call me every single day one or two times, like what are you doing? How are you and what should i bring for you? He used to bring a lot of gifts, surprises for me like clothes, jewellery and chocolates."

31

حلقہ احباب:

ندافاضلی کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ ان کی شخصیت میں ایسی کشش تھی کہ سب ان سے متاثر ہو جاتے تھے۔ مکمل شکلا، دھیریندر استھانا، بنجے معصوم، پورن پنکج، حسن کاظمی اور شاہد مابلی سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ وہ مکمل شکلا کی کویتائیں بہت پسند کرتے تھے۔ سریندر پرکاش سے بھی ان کے تعلقات اچھے

تھے۔ اردو کے مشہور شاعر اور نغمہ نگار جاوید اختر ان کے اچھے دوست تھے۔ جگجیت سنگھ کے ساتھ ان کے گہرے مراسم تھے۔ جگجیت سنگھ نے ان کی کئی غزلوں کو اپنی آواز سے سجایا ہے۔ سلام بن رزاق بھی ان کے اچھے دوست تھے۔ ندافاضلی کے ملنے والوں میں چھوٹے بڑے شعراء، ادبا، سرکاری ملازم اور سیاسی کارکن غرض ہر قبیل کے لوگ شامل تھے۔ جوان سے ملتا وہ ان کی پرتاثر شخصیت کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر فخر الکرم اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

”ندا کا حلقہ احباب ان معنی میں وسیع تھا کہ ان کے ملنے والوں میں ہر قسم اور ہر قبیل کے لوگ تھے۔ ترقی پسند بھی اور جدیدیت کے حامل بھی۔ مذہب کے پاس دار بھی اور رند مئے نوش بھی، صوفی بھی اور عاشق بھی۔ چھوٹے بڑے شعراء اور ادبا کے ساتھ سرکاری ملازم اور سیاسی کارکن بھی۔ ان کی شخصیت بڑی ہی پرتاثر اور دلکش تھی کہ جوان سے ملتا تھا وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔“ 32

معاصرین:

ندا فاضلی کی شہرت کا آغاز ساٹھ کی نصف دہائی میں ہوا۔ پاکستان میں یہ زمانہ ساتھی فاروقی، عبید اللہ علیم، اطہر نفیس اور شکیب جلالی کے عروج کا ہے۔ ہندستان میں ان کے مد مقابل شہر یار، فضیل جعفری، زبیر رضوی، محمد علوی اور عادل منصور تھے۔ اس کے علاوہ ندافاضلی کے معاصرین میں جون ایلیا، احمد فراز، منیر نیازی، ظفر اقبال، بشیر بدر، مخدوم سعیدی، عرفان صدیقی، افتخار عارف اور بمل کرشن اشک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں نصرت امین اپنے مضمون ”ندا فاضلی کا شعری اظہار“ میں لکھتی ہیں:

”ندا فاضلی کے معاصر شعراء میں ساتھی فاروقی ہوں یا ظفر اقبال، شہر یار ہوں یا مخدوم سعیدی یا پھر عرفان صدیقی یا افتخار عارف، محمد علوی، بشیر بدر، عادل منصور یا کوئی اور ان کی شناخت کسی بھی طور گم نہیں ہو سکتی۔ وہ ان سب سے الگ نظر آتے ہیں۔ اپنی غزلوں میں بھی اور نظموں کے ساتھ دوہوں میں بھی۔ دورِ حاضر کی بدلتی ادبی قدروں کے تقاضے سے وہ خوب بہرہ ور تھے۔ انھوں نے جو کچھ بھی کہا اعتماد سے کہا۔“ 33

نَدَافِ ضَلٰی کی شاعری میں ہندستانی عناصر جس خوبی کے ساتھ استعمال میں آئے ہیں، وہ ان کے معاصرین میں کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ یارِ باش اور زندہ دل شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت میں وہ تمام اوصاف موجود تھیں جن سے کوئی بھی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ معاصر ادبی منظر نامے میں نَدَافِ ضَلٰی کی شخصیت اس لیے بھی منفرد ہے کہ انھوں نے ہندستانی تہذیب، وحدانیت، بھگتی اور تصوف کے فکری عناصر کو اپنی ذات میں سمولیا ہے۔

حواشی:

- 1۔ مسئلہ کشمیر برصغیر کا ناسور، ندافاضلی سے گفتگو، ڈاکٹر لیاقت جعفری، بے لاگ صحافت، ص: 40
- 2۔ ندافاضلی، اسیم کاویانی، ص: 29
- 3۔ دیواروں کے بیچ، ندافاضلی، ص: 10
- 4۔ میرا تخلیقی سفر، ندافاضلی، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 44
- 5۔ ندافاضلی: حیات و جہات، محمد یوسف رضا، ص: 32
- 6۔ ایضاً، ص: 30
- 7۔ ندافاضلی، اسیم کاویانی، ص: 11
- 8۔ دیواروں کے بیچ، ندافاضلی، ص: 13
- 9۔ زمیں جو کہیں دھوپ کہیں سایہ ہے، کنہیا لال نندن، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 15/16
- 10۔ دیواروں کے بیچ، ندافاضلی، ص: 12/13
- 11۔ فون پر انٹرویو، مالتی جوشی،، شام 5 بجے، یکم جون، 2019
- 12۔ دیواروں کے بیچ، ندافاضلی، ص: 13
- 13۔ ندافاضلی، اسیم کاویانی، ص: 12
- 14۔ ایضاً، ص: 24/25
- 15۔ ندافاضلی: حیات و جہات، محمد یوسف رضا، ص: 37
- 16۔ دیواروں کے بیچ، ندافاضلی، ص: 82
- 17۔ گورکھپور آل انڈیا مشاعرہ وکوی سمیلن
- 18۔ گفتگو ندافاضلی کے ساتھ، راندر کول
- 19۔ جشن ندافاضلی، عالمی مشاعرہ، ہیوسٹن
- 20۔ کثیر الجہات شخصیت کے مالک ندافاضلی، پروفیسر اسرار اللہ انصاری، نیا دور، ص: 111
- 21۔ ہندی روزنامہ، ہندستان، ص: 12
- 22۔ ایضاً

23۔ نذافاضلی: ابھی تم سانس لیتے ہو، عامر فاروقی، خبرنامہ، ص: 22

Personality: A Psychological Interpretation, Gordon W. 24

Allport, p28

25۔ آکسفورڈ یونیورسٹی، لندن

26۔ زندگی کی کشتی اور نذافاضلی، انور ظہیر خاں، مشمولہ اعتراف، ص: 133/134

27۔ جو تھے وہی رہے، پورن پنکج، مشمولہ اعتراف، ص: 211

28۔ فون پرائیویو، مالتی جوشی، شام 5 بجے، یکم جون، 2019

29۔ زندگی کی کشتی اور نذافاضلی، انور ظہیر خاں، مشمولہ اعتراف، ص: 134

30۔ جو تھے وہی رہے، پورن پنکج، مشمولہ اعتراف، ممبئی، ص: 212

31۔ فون پرائیویو، تحریر فاضلی، شام 3 بجے، 11 نومبر، 2019

32۔ چہرے ماضی و حال کے تضادات کا آئینہ، ڈاکٹر فخر الکریم، مشمولہ نذافاضلی، مرتب پروفیسر علی احمد

فاطمی، ص: 114

33۔ نذافاضلی کا شعری اظہار، نصرت امین، مشمولہ آج کل، ص: 20

باب دوم:
نڈافاضلی کی نثری (علمی وادبی) خدمات

﴿نثر نگاری﴾

﴿تراجم﴾

﴿نثرنگاری﴾

نڈا فاضلی کا شمار اپنے عہد کے نامور شعرا میں ہوتا ہے۔ اپنے معاصرین میں وہ اس اعتبار سے ممتاز ہیں کہ وہ نہ صرف ایک خوش فکر شاعر تھے بلکہ ایک صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ ان کی نثری خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اردو نثر میں ان کی پانچ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے نثری سرمائے میں دس نامور شعر اور ادب سے لیے گئے انٹرویوز کا مجموعہ ”ملاقاتیں“، دو جلدوں پر مشتمل خودنوشت ”دیواروں کے بیچ“ اور ”دیواروں کے باہر“، ان کے دور کے متوفی شعرا کا تذکرہ ”چہرے“ اور دیگر ہم عصر شاعروں، ادیبوں، فلمی شخصیات اور متفرق موضوعات پر لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ ”دنیا میرے آگے“ شامل ہیں۔

1. ”ملاقاتیں“

”ملاقاتیں“ نڈا فاضلی کی پہلی نثری تصنیف ہے۔ یہ کتاب 1986 میں منصہ شہود پر آئی۔ یہ کتاب 152 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اردو زبان و ادب کے دس نامور شعرا و ادبا سے اپنی ملاقاتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کتاب میں شامل دس شخصیات کے نام درج ذیل ہیں:

- | | | |
|---------------------|-------------------|------------------|
| (1) فراق گورکھپوری | (2) سردار جعفری | (3) اختر الایمان |
| (4) خواجہ احمد عباس | (5) جاں نثار اختر | (6) کیفی اعظمی |
| (7) علی جواد زیدی | (8) ساحر لدھیانوی | (9) باقر مہدی |
| (10) قاضی سلیم | | |

یہ کتاب دراصل انٹرویوز (INTERVIEWS) کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے یہ انٹرویوز ممبئی کے ہفت روزہ ”بلٹن“ میں شائع ہوتے تھے۔ نڈا فاضلی نے بعد میں ان انٹرویوز کو کتابی شکل دے دی۔ یہ کتاب اپنے لب و لہجے کے لحاظ سے نہ صرف منفرد ہے بلکہ اپنی اس پہلی نثری تصنیف سے ہی انھوں نے اردو داں حلقے میں اپنی نثر کا لوہا منوایا۔ وارث علوی نڈا فاضلی کی شاعری اور نثر دونوں کے مداح تھے۔ انھوں نے ایک خط میں لکھا ہے کہ یہ کتاب (ملاقاتیں) شگفتہ اور رواں نثر کی اچھی مثال پیش کرتی ہے۔

اس کتاب میں انھوں نے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی خوبیوں کو ہی بیان نہیں کیا بلکہ ان کی خامیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ یہ ملاقاتیں عام انٹرویوز سے کس طرح منفرد تھیں اس کے بارے میں سلام بن رزاق اپنے مضمون ”نڈا فاضلی کی دیگر معروف و مقبول نثری تصانیف اور دیواروں کے بیچ“ میں لکھتے ہیں:

”یہ ملاقاتیں عام انٹرویو سے اس لیے مختلف تھیں کہ ان میں مصنف نے رسمی گفتگو سے احتراز کرتے ہوئے مخاطب کے ساتھ ایک دانشورانہ مکالمہ قائم کیا ہے۔ انھوں نے ایک منجھے ہوئے آرٹسٹ کی طرح صرف پورٹریٹ بنانے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ایسے ماسٹر اسٹروک لگائے ہیں کہ شخصیت کی باطنی کیفیات کے چند گوشے بھی روشن ہو جاتے ہیں۔ مصنف مخاطب کی گفتگو کو من و عن بیان نہیں کرتا بلکہ ایک ماہر نفسیات کی طرح اس کا تجزیہ بھی کرتا چلتا ہے۔ ان ملاقاتوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے بڑے ادیبوں اور شاعروں کو عظمت کے آسن پر بٹھانے کی بجائے انھیں ان کی خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ بشری پیکر میں پیش کیا ہے۔ ان ملاقاتوں کو پڑھتے ہوئے قاری کے دل میں ان شخصیتوں کے لیے عقیدت سے زیادہ محبت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور وہ تمام شخصیتیں اپنی سی لگنے لگتی ہیں۔“ 1

اس کتاب میں نداء فاضلی نے مذکورہ بالا ادبا و شعرا کی نفسیات پر روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اشتہاروں کے ذریعے اس کی شہرت ہوئی اور ادبی حلقوں میں شور و غل پیدا ہوا۔ یہ کتاب شائع ہونے کے بعد کافی دنوں تک بحث کا موضوع بنی رہی۔ اس کتاب کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں نداء فاضلی نے سفاکانہ طور پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جس سے بہت سے لوگ خفا بھی ہو گئے۔ اس کتاب میں انھوں نے مشاہیر ادب سے جو سوالات قائم کیے ہیں ان سے ان مشاہیر کے فکرو فن اور نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس حوالے سے اسیم کا ویانی اپنی کتاب ”نداء فاضلی“ میں رقم طراز ہیں:

”ان انٹرویو نمائندہ مضامین میں ان مشاہیر سے ان کی حیات، فن، نظریات اور مسائل ادب کے سلسلے میں متفرق سوالات کیے گئے ہیں اور ان کے دیے گئے جوابات کے پہلو بہ پہلو ان پر نداء کا نقد و تبصرہ اور کہیں کہیں طنزیہ اشارے بھی ملتے ہیں۔ جس نے اس کتاب کو کافی دلچسپ بنا دیا ہے۔“ 2

نداء فاضلی جس دور میں ممبئی گئے، اس دور میں ادب، صحافت، مشاعرہ اور فلم تک قلم کے جتنے کاروباری یا نیم کاروباری پلیٹ فارم تھے، سب پر ترقی پسند قلم کاروں کا قبضہ تھا۔ نداء نے اپنی شاعرانہ تازہ

کاری، جرأت مندانه بے باکی اور محفلِ رندانہ کی محفلِ بازی سے ان قلم کاروں کو بہت جلد متوجہ کر لیا۔ قلم کاروں کا کھلا پن ہی دراصل اس کتاب کا مواد بنا۔ اس کتاب کی اشاعت نے نڈا فاضلی کو ادب میں راتوں رات مشہور کر دیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھیں ان قلم کاروں کی ناراضگی بھی مول لینا پڑی تھی۔ اس کے باوجود سردار جعفری، جاں نثار اختر، اختر الایمان، کپتی اعظمی اور ساحر لدھیانوی ان کی مدد کرتے رہے۔ جہاں انھوں نے ایک طرف اپنے رواں دواں اور بے تکلف پیرایے میں ان شخصیات کے حقیقی خدوخال ابھارے ہیں وہیں دوسری جانب اپنے مشاہدے کی گہرائی سے ان کے ارد گرد کے ماحول کی سچی تصویر بھی کھینچ کر رکھ دی ہے۔ انھوں نے کہیں کہیں ان شخصیات کے اسبابِ زندگانی یعنی خارجی اشیا سے ان کے اس دور کے کردار کو سمجھنے کا انوکھا طرز بھی اپنایا ہے۔ سردار جعفری کے بارے میں نڈا لکھتے ہیں:

”سیتا محل کے فلیٹ کا ایک کمرہ، آٹھ نومن کی کتابیں، دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی نیند، بکھرے ہوئے بہت سارے کالے سفید بال، 555 برانڈ کی سگریٹیں، فرش، کھڑکیاں، دیواریں، فرنیچر، ٹیلی فون، پنڈت نہرو کی تصویر، پدم شری کی دستاویز۔ سردار جعفری کتنی ساری چیزوں سے گھرے ہوئے رہتے ہیں۔ ان تک پہنچنے کے لیے اب بہت کچھ پھلانگنا پڑتا ہے۔ چیمبور سے سیتا محل کا راستہ تو خیر اتنا طویل نہیں، مگر ان کے کمرے سے ان تک پہنچنے کا راستہ اکثر بری طرح تھکا دیتا ہے۔“ 3

سردار جعفری نے نڈا فاضلی کو اپنے رسالے ”گفتگو“ میں کام کرنے پر مامور کیا۔ نڈا نے لکھا ہے کہ سردار جعفری کی شاعری کا لب و لہجہ خطابِ بیہ ہے۔ تفصیلی پھیلاؤ اس کی ضرورت بھی ہے اور عجیب بھی۔ اسی طرح فراق گورکھپوری کی شعری زبان کے بارے میں نڈا لکھتے ہیں:

”فراق کی شعری زبان کے ہر لفظ کی اوٹ میں ہندستان کا تہذیبی مزاج کروٹیں لیتا محسوس ہوتا ہے۔“ 4

نڈا فاضلی کی اس کتاب سے ایسے بہت سے اقتباسات پیش کیے جاسکتے ہیں جن سے ان کی انوکھی نثر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اختر الایمان کے بارے میں انھوں نے جو تبصرہ پیش کیا اس کو ادبی حلقے میں ناپسند کیا گیا۔ اختر الایمان سے پہلی ملاقات کے بارے میں نڈا رقم طراز ہیں:

”پہلی بار جب میں ان سے ملا تھا تو کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ تعارف

ہونے تک مجھے کچھ ایسا لگ رہا تھا کہ گھر کا کوئی بچہ ادھر سے گزرتے ہوئے صوفہ پر پھیلے ہوئے ان لنگی کرتا پہنے ہوئے صاحب کو ٹوک کر مہمانوں کو چائے پانی لانے کے لیے ضرور کہے گا۔“ 5

خواجہ احمد عباس کی کثیر الجہات عملی زندگی کو دیکھ کر نذا فاضلی کو اپنے گھر کے پچھواڑے کا وہ جنرل اسٹوریو یاد آتا تھا جس کا پارسی مالک اپنے جنرل اسٹوریو میں رکھے بے شمار چھوٹے بڑے ڈبوں میں سے گاہک کی ہر مطلوبہ چیز کسی نہ کسی ڈبے سے نکال کر دے دیتا تھا۔ نذا فاضلی خواجہ احمد عباس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

”عباس صاحب ادب سے سیاست اور فلم تک پھیلے ہوئے ہیں لیکن ہر جگہ وہ ٹکڑا ٹکڑا ہی نظر آتے ہیں۔ کہیں بھی پوری شخصیت کی جھلک نہیں نظر آتی۔ مختلف شعبوں میں اپنے آپ کو بانٹ کر عباس صاحب نے اپنی مصروفیات تو ضرور بڑھالی ہیں مگر کہیں بھی وہ متعلقہ شعبوں کے معیارات پر پورے نہیں اترتے۔ ہر جگہ وہ تماشائی کی طرح رپورٹنگ ہی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نظریں اشیا کی اندرونی تہوں میں اترنے کے بجائے ان کے اوپری خدو خال کو پڑھ کر لوٹ آتی ہیں۔“

6

اس کتاب کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ نذا فاضلی نے ان شخصیات کی شہرت و مقبولیت سے مرعوب ہوئے بغیر ان کے فنی سروکاروں اور نظریات زندگی پر بے باکانہ رائے زنی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان شخصیات کو اپنے کڑے سوالوں کے گھیرے میں لیا ہے۔ جاں نثار اختر کے حوالے سے نذا فاضلی اس کتاب میں لکھتے ہیں:

”ایسا لگتا ہے کہ جاں نثار اختر نے محسوس کم کیا ہے اور دیکھا زیادہ ہے۔ ان کے چیزیں دیکھنے کے ڈھنگ میں ایک نیا پن ہے۔ وہ بار بار کے دیکھے ہوئے مناظر کو جھاڑ پھونک کر کچھ اس طرح سامنے لاتے ہیں کہ انھیں دیکھنے سے طبیعت اوبتی نہیں۔“ 7

ساتر لدھیانوی نذا فاضلی کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ نذا اکثر ان کے بنگلے پر جایا کرتے تھے جہاں انھیں شام کی شراب اور رات کا کھانا ملتا تھا۔ اس کے عوض ان کو ساحر کی شاعری سننا پڑتی تھی اور

ساتھ ہی داد بھی دینا پڑتی تھی۔ ایک مرتبہ ندانے ساحر کی شاعری پر کمنٹ کیا تو دونوں میں بحث ہوئی۔ اس رات ساحر نے ان کو کھلائے بغیر ہی گھر سے نکال دیا لیکن ساتھ ہی ان کی جیب میں کچھ روپے بھی ڈال دیے۔ ساحر کی ناراضگی سے ان کو کئی مشاعروں میں شمولیت کرنے سے دور رکھا گیا۔ ساحر لدھیانوی کے بارے میں ندافاضلی رقم طراز ہیں:

”ماضی کی تلخ یادوں نے انھیں کسی حد تک Sadist بھی بنا دیا ہے۔

دوسروں کے منہ پر برا بھلا کہہ کر اور ضرورت مندوں کو بار بار اپنے گھر

کے بے مقصد چکر کٹوا کر انھیں اب سکون ملتا ہے۔“ 8

اس کے بعد ندافاضلی نے ساحر لدھیانوی کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ رومانی ذہن کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری کالج کے لڑکے لڑکیوں میں کافی عرصے تک مقبول رہی۔ اس تناظر میں یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

”ساحر بنیادی طور پر ہلکے پھلکے رومانوی ذہن کے شاعر ہیں۔ ان کا لہجہ

جوفیض کا تقلیدی رنگ لیے ہوئے ہے، نیم پختہ ذہنوں کے لیے خاص

دلکشی رکھتا ہے۔ ان کے یہاں نوجوانی کے کلنڈرے پن کا سیدھا سادہ

اور وضاحتی اظہار کالج کے لڑکے لڑکیوں میں ایک زمانے میں کافی

مقبول رہا ہے۔“ 9

علی جواد زیدی نے اپنے شعری مجموعے ”دیار سحر“ کے دیباچے میں لکھا تھا کہ وہ سماجی اور سیاسی تحریکوں کے صرف خاموش تماشاخی نہیں رہے بلکہ عملی جہاد بھی کیا ہے۔ ندافاضلی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اپنے ملک میں ان قربانیوں کی اپنی ایک اقتصادی اہمیت ہے، جس

سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ بہت سوں نے تو انھیں پرامیسری نوٹس کی

مانند مختلف سرکاری اداروں میں بھنا بھی لیا ہے، لیکن ادب میں بحث

صرف تخلیقی سطح پر ہی ہو سکتی ہے۔“ 10

فراق گورکھپوری، باقر مہدی اور قاضی سلیم کو چھوڑ کر دوسرے شعرا وادبا کے ساتھ ندافاضلی کا رویہ غیر روادارانہ اور کہیں کہیں جارحانہ ہو گیا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ممبئی آنے کے چھ سال بعد بھی ندافاضلی

رہائش و روزگار کا مسئلہ حل نہیں کر سکے تھے۔ جب کہ وہ لوگ شہرت و مقبولیت کے ساتھ دنیاوی آسائشیں بھی حاصل کر چکے تھے۔ باقر مہدی نے نذافاضلی کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کیا تھا۔ نذافاضلی دل و جان سے ان کی قدر کرتے تھے۔ انھوں نے باقر مہدی کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی شاعری کرب ناکوں کی ایک دستاویز مرتب کرتی ہے۔ اقتباس دیکھیے:

”یہ شاعری اجنبیوں کی بھیڑ میں گھرے ہوئے ایک ایسے باہری آدمی (Outsider) کی کرب ناکوں کی دستاویز مرتب کرتی ہے، جو ایک کرب سے دوسرے کرب تک لگا تار سفر کرتا جا رہا ہے۔ اس میں حرکت بھی ہے اور حرارت بھی۔“ 11

”ملاقاتیں“ میں نذافاضلی نے اس وقت کے بڑے شعرا پر تنقید کی تھی جس کی وجہ سے وہ عتاب کا شکار بھی ہوئے۔ جس پروگرام میں ان کو بلایا جاتا اس کا بانکٹ کیا جاتا تھا۔ کیفی اعظمی ان کو بدتمیز اور بیہودہ انسان مانتے تھے لیکن بعد میں ان کا رویہ تبدیل بھی ہو گیا۔ اس حوالے سے حسن کاظمی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

”ایک بار میں کئی دن نذافاضلی کے یہاں رہنے کے بعد واپس کیفی اعظمی صاحب کے یہاں جا کی کیڑ جو ہو پہنچا تو انھوں نے پوچھا، کہاں غائب ہو جاتے ہو؟ تو میں نے کہا نذا بھائی نے روک لیا تھا۔۔۔ فرمانے لگے کہ تمہارا نذا سے اتنا ملنا جلنا مجھے پسند نہیں ہے۔ وہ بہت بیہودہ اور بدتمیز انسان ہے۔ اس نے ہمیشہ اپنے بزرگوں کی پگڑی اچھالی ہے۔ میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔۔۔ میں نے کہا سلیم جعفری آپ کا جشنِ دہائی میں کرنے کے خواہش مند تھے۔ مگر آپ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ان کو جھٹک دیا تھا۔ نذا صاحب سلیم جعفری کو تسلی دے رہے تھے کہ کیفی صاحب بزرگ ہیں۔ آپ برا مت مانیے، ہم لوگ سمجھالیں گے۔۔۔ میں پوری ذمہ داری لیتا ہوں۔۔۔ یہ سنتے ہی کیفی صاحب ایک دم پکھل گئے۔ ارے میں تو ان کو بہت غلط سمجھتا تھا۔“ 12

نذافاضلی کیفی اعظمی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب ”ملاقاتیں“ میں لکھتے ہیں:

”کیفی اعظمی کی شاعری ظفر علی خان کے سیاسی شعور اور انیس کے
 رزمیاتی لب و لہجے کے امتزاج سے عبارت ہے۔ ”آخر شب“ کی تین
 چوتھائی سے زیادہ نظمیں ہنگامی موضوعات کو صحافتی انداز میں منظوم
 کرنے کی مشاقیوں کی نذر ہو کر رہ گئی ہیں۔“ 13

الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ نڈا فاضلی نے اپنی پہلی نثری کتاب میں اپنے اسلوب کی تازگی اور اپنے
 چونکا دینے والے سوالات سے لوگوں کو متوجہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کا اسلوب ایک اثر انگیز تخلیقی نثر
 کا حامل ہے۔ ادبی حلقے میں اس کتاب پر کافی بحث و مباحثہ ہوا۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب
 نڈا فاضلی کی ناقدانہ بصیرت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

2. ”دیواروں کے بیچ“

ندافاضلی نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔ انھوں نے اپنے منفرد اسلوب سے اردو نثر میں اضافہ کیا۔ انھوں نے نثر میں بھی شاعری کی طرح آسان اور سادہ الفاظ کے ذریعے اپنی بات پیش کی۔ ”دیواروں کے بیچ“ نثر میں ندافاضلی کی سب سے اہم تصنیف ہے جسے قارئین اور ناقدین نے یکساں طور پر سراہا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے جنم سے لے کر اپنے خاندان کے پاکستان ہجرت کرنے تک کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ اردو نثر میں یہ ان کی دوسری تصنیف ہے۔ ”دیواروں کے بیچ“ کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے ماہنامہ ”شاعر“ میں قسط وار چھپ کر اہل نظر سے داد پا چکی تھی۔

”دیواروں کے بیچ“ پر یہ اختلاف ہو سکتا ہے کہ یہ ناول ہے، سوانحی ناول ہے یا خودنوشت ہے۔ لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ یہ ایک دل چسپ اور فکر انگیز تصنیف ہے۔ ندافاضلی نے اس کتاب میں بڑی بے باکی سے نہ صرف اپنی زندگی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ سماج کے بعض نازک گوشوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی اپنے مضمون ”دیواروں کے بیچ“۔۔۔ ایک تجربہ“ میں لکھتے ہیں:

”ندا کی اس نثری تخلیق کو پہلی نظر میں خودنوشت ہی کہا جائے گا اور یہ ہے بھی خودنوشت ہی۔ لیکن ندا نے اپنے دل کش اسلوب، قوت مشاہدہ اور اپنی تہذیب، معاشرت و سیاست پر جذباتی گرفت سے اس کتاب کو اس قدر دل چسپ، بامعنی اور خلافت کی ان حدوں تک پہنچا دیا ہے جہاں سے اس پر ناول ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے اور یہ سچ ہے کہ اس کی ابتدا ناول کی طرح ہوتی ہے۔ ایک خودنوشت سوانحی ناول سے دور بھی ہوتا جاتا ہے۔ کتاب کے خاتمے تک قاری کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ کس صنف کی کتاب پڑھ رہا ہے، بس پڑھ رہا ہے اور ایک دوسری دنیا میں پہنچتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن کتاب کے خاتمہ کے بعد ایک خاص مقام پر قاری کو یہ فکر ستانے لگتی ہے کہ یہ کتاب جو اس نے ابھی ختم کی وہ اصلاً ہے کیا اور اسے کس خانہ میں رکھا جائے۔“ 14

”دیواروں کے بیچ“ 177 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب 1992 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی

ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے:

”سورج غروب ہو رہا ہے۔ ایک بے ہوش عورت کے گرد تین چار بچے
سہمے ڈرے بیٹھے ہیں۔ بڑی بہن اٹھ کر لالٹین کی چمکی صاف کر کے
روشن کرتی ہے۔ چاروں طرف چت کبریٰ روشنی پھیل جاتی ہے۔
سامنے اہلی کے درخت پر ایک ڈراؤنا بھوت روز کی طرح آج بھی آکر
بیٹھ گیا ہے۔ لمبے لمبے دانت، ٹیڑھے میڑھے ہاتھ پاؤں، ہوا سے
شاخیں ہلتی ہیں۔ تو اس کی گرم سانسیں بہت قریب محسوس ہوتی ہیں۔
دالان سے آنکھوں میں آتے بھی ڈر لگتا ہے۔ بڑی بہن بھوت کو دفع
کرنے کے لیے اندر سے قرآن شریف لا کر اسٹول پر رکھ دیتی ہے۔
بچوں اور بھوت کے درمیان اللہ کے کلام کی حد بن جاتی ہے۔ بھوت
میں اس حد کو پھلانگنے کی ہمت نہیں ہے لیکن جب بھی نظر اٹھتی ہے وہ اہلی
کی شاخوں سے جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔“ 15

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ کسی ناول کا آغاز ہو رہا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کی
وجہ یہ ہے کہ نڈافاضلی نے ماضی کو حال کے صیغے میں اور کہیں علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا ماضی ان
کے حال کی طرح زندہ و تابندہ ہے۔ ان کی زندگی میں ماضی کا رول ناقابل فراموش ہے۔

نڈافاضلی نے اپنی جدت پسندی سے بھولی ب سری یادوں کو ایک ناول کی صورت میں پیش کیا ہے۔
انہوں نے اس کتاب کو ان یادوں سے منسوب کیا ہے جو حال میں ستاتی ہیں، جب ماضی بن جاتی ہیں تو لبھاتی
ہیں۔ ممکن ہے حال سے ماضی بننے کے سفر میں ان یادوں میں کہیں کہیں وقت کی دوریاں شامل ہو گئی ہوں اور
یہ اب ویسی نہیں رہی ہوں جیسے پہلے تھیں۔ ان یادوں کا سلسلہ کافی طویل ہے، میں ایک ہی موڑ تک آ کر رک
سا گیا ہوں۔ نڈافاضلی نے اس کتاب کے آغاز میں میر تقی میر کا ایک شعر درج کیا ہے

آنکھ ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر

منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

نڈافاضلی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تنہائی میں گزارا۔ وہ شخص جس نے اپنی زندگی تنہا گزاری ہو اس
کے لیے انسانی رشتوں اور جذباتوں کی قیمت بڑھ جاتی ہے یا تنہائی سے اکتا کر خود غرض، بے حس اور سخت دل

بھی واقع ہو سکتا ہے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے اکیلے پن کو ٹوٹے پھوٹے اور وقت کے ہارے ہوئے یا حالات سے جو جھٹتے ہوئے انسانوں کے دکھ درد سے آباد کر لیا۔

نڈا فاضلی نے اس کتاب میں گوالیار کے قصبائی کلچر، وہاں کے گلی محلوں، اپنے والد مرتضیٰ حسن کی عیش پسندی کے ساتھ ان کے دور کی شعری محفلوں اور ممتاز ہم عصروں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں مندروں اور مسجدوں میں سجدہ کرنے والے عقیدت مند، خواجہ خانوں کی درگاہ میں منتوں کے دھاگے باندھنے والے شر دھالو، پنڈت، مولوی، قضائی، متولی، پہلوان، ٹیچر، ڈاکٹر، طوائف، کامریڈ، پیر، مرید جیسے رنگا رنگ کرداروں کا ذکر موجود ہے۔ یہ سب کردار اس معاشرے اور ماحول کے ساختہ پرداختہ ہیں۔ ان میں خیر و شر کی صفات یوں گھلی ملی ہیں کہ انھیں کسی ایک خانے میں ڈالنا ممکن نہیں۔ نڈا فاضلی نے اس کتاب میں گوالیار کی دل آویز تصویریں کھینچی ہیں۔ اس حوالے سے پروفیسر علی احمد فاطمی اپنے مضمون ”دیواروں کے بیچ۔۔۔ ایک تجربہ“ میں رقم طراز ہیں:

”نڈا نے گوالیار کو بڑے سلیقہ و ظرف سے پیش بھی کیا ہے اور وہاں کی صرف محفلوں کا ہی ذکر نہیں بلکہ تہذیب و معاشرت اور حد یہ کہ فرقہ واریت کو بڑے قریب سے دیکھا اور پیش کیا۔ جس سے نہ صرف گوالیار کی بلکہ اس عہد کے ہندوستان کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ اس تصویر میں صرف اردو والے ہی نہیں ہیں، صرف مسلمان بھی نہیں ہیں بلکہ پنڈت جی ہیں، پیرکار ہیں، رام نرائن ہیں، خلیل احمد اور بیجوے بھی ہیں۔ غرض یہ کہ کرداروں کی بھیڑ ہے اور ہر کردار کو نڈا نے اپنا کردار سمجھ کر پیش کیا ہے۔“ 16

نڈا فاضلی نے اپنا کردار خلق کر خود گذشت کو ناول کے فارم میں دیا ہے۔ نڈا کا کردار زیادہ جاندار، زیادہ دل چسپ اور زیادہ حرکی ہے۔ ”میں“ کی بجائے ”ماں“ اس کے لاشعور کے نہاں خانوں میں جاگزیں ہے جسے وہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی جھٹک نہیں پاتا کیوں کہ یہ احساس اس کے وجود میں جھلکتا رہتا ہے کہ وہ اپنی ماں کے خوابوں کی تعبیر نہیں بن سکا۔ اس کے علاوہ پیڑ، پھول اور پودے اس کے لیے انسانی ذلاتوں، مکاریوں، غرض مند یوں، نفرتوں سے بھری ہوئی دنیا سے تھوڑی دیر کے لیے فراغت کا سامان بھی بہم پہنچاتے ہیں۔ نڈا کے کردار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان سے کبھی مایوس نہیں ہوتا اور نہ ان سے زیادہ

توقعات رکھتا ہے۔ ان کے مطابق نفرت Situational ہوتی ہے، Situation بدلنے کے ساتھ اس کے رخ اور اس کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔

”دیواروں کے بیچ“ میں نڈا ایک آزاد روا اور آوارہ پنچھی کی طرح نظر آتا ہے۔ اقرار کی بجائے انکار اس کی شخصیت کا وہ رخ متعین کرتا ہے جسے ہر چیز بے وقعت نظر آتی ہے۔ وہ پانے کے لیے کھوتا نہیں ہے بلکہ کھونے اور پانے کے احساس ہی سے اپنی ذات کو پرے رکھ کر دنیا کا مشاہدہ ایک ایسے تماش بین کے طور پر کرتا ہے جو وجودی اور جسمانی سطح پر اس میں پوری طرح شامل بھی ہے اور روحانی اور ذہنی سطح پر اس سے علاحدہ بھی ہے۔

نڈا کا کردار عمر کے ہر باب میں تبدیلیوں سے گزرتا ہے۔ سیاست نے اسے گھروالوں سے دور کر دیا تھا۔ اس وجہ سے وہ سیاست سے ناراض نظر آتے ہیں۔ وہ کبھی خود کو دنیا دار سمجھتے ہیں، کبھی محفلوں میں تنہا ہو جاتے ہیں اور کبھی تنہائی کو انجمن سے آراستہ کر دیتے ہیں۔ کبھی نیم اور پپیل کے پیڑ تو کبھی املی اور مولسری کے درخت اس کے دم ساز بن جاتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ خارج و باطن کے تضاد میں خود کی تلاش کرتے ہیں۔ کبھی ”چیونٹے“ کے کچھ لمحے چراتے ہیں تو کبھی کوؤں کی رفاقت سے فیض اٹھاتے ہیں۔ اس حوالے سے نڈا لکھتے ہیں:

”انسانوں کے علاوہ کسی کے الگ الگ نام نہیں ہوتے۔ وہ سب اپنی قسم کے اعتبار سے ایک ہی نام سے جانے جاتے ہیں جیسے چیونٹا کہیں کا ہو وہ صرف چیونٹا ہوتا ہے۔ کبوتر صرف کبوتر ہوتا ہے۔ گائے دودھ دے یا قصائی کا گوشت بنے ایک نام سے پکاری جاتی ہے۔ شاید اس لیے ان میں موت کا ماتم اور پیدائش کا جشن نہیں ہوتا۔“ 17

نڈا فاضلی کی اہمیت و انفرادیت یہ ہے کہ وہ کہیں بھی خود کو بے مثال صلاحیتوں کا حامل نہیں قرار دیتے ہیں۔ احباب و اغیار کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے نہ تو بے جا خوشامد پسندی سے کام لیا ہے اور نہ ہی اپنی تحریر میں عصبیت کو جگہ دی ہے۔ ”دیواروں کے بیچ“ کے بعض کردار بہت کم عرصے کے لیے نمودار ہوتے ہیں لیکن ان میں کوئی ایک پہلو ایسا ضرور ہوتا ہے جو ان کے غیاب میں چلے جانے کے بعد بھی دیر تک ذہن میں گشت کرتا رہتا ہے۔ ہر آدھے ادھورے، ٹوٹے پھوٹے، غریب الوطن میں نڈا کو اپنی خانہ خرابی کی کوئی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے۔

اس کتاب میں بیرکمار اور شیدا کے کردار کو قاری آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا۔ انسانی درد مندی کیا ہوتی ہے اس کا درس نندا کو بیرکمار سے ملتا ہے جو مصیبت میں ہو کر بھی ان کی مدد کرتا ہے۔ نندا کو کالج کی فیس بھرنے کے لیے پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ بیرکمار گھر سے بے گھر ہو کر شیدا کے ساتھ رہتا تھا۔ جوے اور مار پیٹ کے جرم میں اسے کئی مہینے جیل میں گزارنا پڑتے ہیں۔ شیدا اس کی ضمانت کے لیے اپنے زیور بیچتی ہے۔ جب شیدا کی ملاقات نندا سے ہوتی ہے تو وہ اسے ایک لفافہ دیتی ہے جس میں اس کے کالج کی فیس ہوتی ہے۔ فیس کے ساتھ لفافے میں ایک خط بھی ہوتا ہے جس میں لکھا ہوتا ہے:

”نندا تمہارے کالج کی فیس میں دیے جا رہا ہوں۔ اس بیچ کوئی اور

ضرورت ہو تو شیدا سے کہہ دینا وہ پوری کر دے گی۔ اپنی پڑھائی کی

طرف دھیان دینا۔“ 18

شیدا کی کوشش کے باوجود بیرکمار کی ضمانت نہیں ہو پاتی۔ کچھ مہینے اس کا انتظار کرنے کے بعد وہ پیسے کمانے کے لیے پھر سے طوائف بنتی ہے۔ شیدا کے اس فعل سے بیرکمار کو بہت تکلیف ہوتی ہے اور کچھ دنوں بعد وہ خودکشی کرتا ہے۔ جب نندا ایک دن شیدا سے ٹکراتا ہے تو دونوں بیرکمار کی یاد میں جسمانی دویوں کو عبور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

”انہی دنوں میں اس (نندا) کی ملاقات بیرکمار کی طوائف شیدا سے ہوتی

ہے۔ بیرکمار کا کچھ دن سوگ منانے کے بعد اب وہ مستقل کوٹھے پر

بیٹھنے لگی ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں سونے چاندی کے گہنے اور

چہرے پر خوش حالی کی چمک ہے۔ شیدا اپنے مرحوم عاشق کو اتنا عرصہ

گزرنے کے بعد بھی بھول نہیں پائی ہے۔ وہ جب بھی نندا کے ساتھ

ہوتی ہے تو پرانی یادوں سے آنکھیں ضرور بھگوتی ہے۔ ان یادوں کے

سہارے وہ اکثر جسمانی دویوں کو عبور کرنے کے لیے مجبور ہوتے

ہیں۔ وہ پیشہ ور ہونے کے باوجود ان مشترک یادوں کے احترام میں نندا

سے فیس نہیں لیتی۔ وہ جب پیسے دینے پر اصرار کرتا ہے تو شیدا سنجیدگی

سے صرف اتنا کہتی ہے۔ ”تم میرے مرد کے دوست ہو۔ وہ (بیرکمار)

تمہیں بہت چاہتا تھا، میرے تمہارے بیچ گا ہکی کیسے ہوگی، گھر کے

لوگوں سے بھی کوئی لین دین کرتا ہے۔“ 19

نہا فاضلی نے اس کتاب میں اپنے والدین کے بارے میں بھی بے باک لہجہ اختیار کیا ہے۔ ایک طرف وہ اپنے والد مرتضیٰ حسن کی رنگین مزاجی کا ذکر کرتے ہیں تو دوسری جانب اپنی والدہ جمیل فاطمہ کی سادہ مزاجی کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ جمیل فاطمہ کے کردار میں ممتا کا تقدس اور نسوانی پاکیزگی کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ ایک مکمل اور آئیڈل مشرقی خاتون کے روپ میں ذہن پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ وہ صبر و رضا کی پتلی ہیں۔ وہ ازدواجی رشتے کو آسمان پر طے ہونے والا رشتہ سمجھتی ہیں۔ اسی لیے اپنے شوہر کی ساری بے اعتدالیوں کو ایک شریف اور صابر بیوی کی طرح سمجھتی ہیں۔

جمیل فاطمہ نہا کی روح میں رچی بسی رہتی ہیں۔ ان کی تاکیدیں، ان کے خواب، ان کی نمازیں، ان کی خاموشی، ان کی مسور کی دال میں لہسن کا بگھار وغیرہ ان کے ذہن میں ہر دم تازہ دم رہتا ہے۔ نہا جب اپنی والدہ کے انتقال کی خبر سنتا ہے تو اس کی نیند اڑ جاتی ہے اور وہ بے وقت کی نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔ والدہ سے آخری وقت نہ ملنے کا ذکر انھوں نے ایک خاص رواداری سے کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ اقتباس دیکھیے :

”جمیل فاطمہ کے انتقال کی خبر سے اس کی آنکھیں تو نہیں بھیگتیں لیکن جب وہ چراغ بجھا کر سونے کی کوشش کرتا ہے تو آنکھیں پلک سے پلک جوڑ کر بھی نیند سے دور رہتی ہیں۔ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے اور پھر اچانک باہر نکل کر وضو کرتا ہے اور بے وقت کی نماز پڑھنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ مسجد میں قیام کے دوران یوں تو ہر صبح کی اذان اسے بستر سے اٹھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ لیکن آج وہ نہ صرف اذان کا ہی انتظار نہیں کرتا بلکہ خدا اور انسان کے درمیان پیش امام کی قیادت کو بھی ضروری نہیں سمجھتا۔ ایسی محویت اس پر نہ اس سے پہلے طاری ہوئی تھی اور نہ بعد میں اس طرح محسوس ہوتی ہے۔ خدا آسمان سے اتر کر خوشبو کی طرح مسجد کے آنگن میں پھیل جاتا ہے۔ چاروں طرف اندھیرا روشن سا محسوس ہوتا ہے۔“ 20

مرتضیٰ حسن شاعر ہیں۔ وہ زندگی کو پوری آزادی سے جینے کے قائل ہیں۔ گھر میں خوب صورت بیوی ہوتے ہوئے بھی ان کی رنگین مزاجی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ شادی کے بعد بھی ان معمولات کو جاری رکھتے

ہیں۔ آخر میں مرتضیٰ حسن اپنی جوانی کی آزادہ روی چھوڑ کر درود و صلوٰۃ میں باقی عمر گزارتے ہیں۔ ان کی وفات پر نندا فاضلی اپنے غم کا اظہار ایک نظم میں یوں کرتے ہیں:

تمہاری قبر پر
میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا
تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اڑائی تھی
وہ جھوٹا تھا۔۔۔

تمہاری قبر میں میں دفن ہوں
تم مجھ میں زندہ ہو
کبھی فرصت ملے تو فاتحہ پڑھنے چلے آنا

(نظم: والد کی وفات پر)

عشرت اور نندا کا رشتہ شروع سے آخر تک بنتا بگڑتا دکھائی دیتا ہے۔ عشرت اپنے خاندان کی مخالفت کے باوجود نندا کے ساتھ مل کر گھر چھوڑنے کے لیے تیار بھی ہو جاتی ہے لیکن نندا اپنی پست ہمتی کے باعث وہاں نہیں پہنچتے۔ جب وہ روزگار حاصل کرنے میں ناکام رہے تو عشرت کا رویہ بدل جاتا ہے۔ عشرت سے نندا کا نکاح ہو جانے کے بعد بھی دونوں میں دوریاں اور محرومیاں بڑھ جاتی ہیں۔ وہ اپنے کالج کے ایک سینئر اسٹوڈنٹ سے قربت بڑھاتی ہے۔ دوسری جانب نندا اور مالتی ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔ نندا اور عشرت کے درمیان کچھ ایسی گرہیں پڑی ہوئی نظر آتی ہیں جنہیں قاری کھول نہیں پاتا۔ اس حوالے سے سلام بن رزاق لکھتے ہیں:

”دونوں ذہنی طور پر قریب ہیں، جسمانی طور پر بھی قریب آ جاتے ہیں۔
مگر ان دونوں کے درمیان وہ کون سی گرہ تھی جو آخر تک کھل نہیں پائی،
مصنف اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا۔ اس لیے عشرت کا کردار ایک
جیتا جاگتا کردار بننے کی بجائے صرف پرچھائیں بن کر رہ گیا ہے۔“

”دیواروں کے بیچ“ کے کرداروں میں خاندان کے ساتھ املی، پیپل اور نیم کا پیڑ، کنواں محلہ، بستی،

گھر سبھی شامل ہیں۔ اس میں ہر طبقے کے لوگ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سارے کردار اس سوانحی ناول کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کرتے ہیں جن میں مالتی جوتی، زبین، پجاری، خیر الدین، مس ٹنڈن، سنالی، سلام مچھلی شہری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سارے کردار حقیقی ہیں اس لیے مصنف نے انہیں حقیقت کی آنکھ سے دیکھا اور پرکھا تھا۔ مثال کے طور پر پجاری کا مورتی سے پھول اٹھا کر نندا کے ہاتھ میں رکھنا اور ان کے بیمار پڑنے پر عیادت کے لیے اس کے گھر جانا دھرم اور مذہب سے ہٹ کر انسانی رشتے کی عظمت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تقسیم کے بعد نئے پجاری کا نندا کو پہچاننے سے انکار کرنا اس بات کو بیان کرتا ہے کہ سیاست کی ایک لکیر نے زمین کے ساتھ انسانی قدروں کو بھی تقسیم کیا ہے۔

وطن کی تقسیم ہو جانے سے آبادی ادھر ادھر الٹ پلٹ جاتی ہے۔ کوئی کہیں رہ جاتا ہے کوئی کہیں، مستقبل کے سارے خواب ٹوٹتے بکھرتے نظر آتے ہیں۔ اسی اثنا میں نندا کا خاندان بھی بے گھری کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ گھر سے بھاگ جاتا ہے اور ان کا خاندان پاکستان منتقل ہو جاتا ہے۔

نندا فاضلی دہلی کا سرسری ذکر کرتے ہیں۔ ممبئی پہنچ کر وہ کئی صفحات اس شہر کے کردار پر خرچ کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا نصف حصہ ممبئی میں گزارا۔ ان کو دلی سے زیادہ ممبئی راس آتی ہے۔ وہ اس کی آزمائشوں پر پورا اترتے ہیں۔ گوالیار جیسے چھوٹے شہر اور ممبئی جیسے بڑے شہر میں جو تضاد ان کو نظر آتا ہے، وہ اسے اپنی تہذیب اور اس کے اجلے پن کو ختم نہیں ہونے دیتا۔ عروس البلاد شہر ممبئی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

”ممبئی بڑی گھمنڈی بستی ہے۔ یہ آسانی سے ہر ایرے غیرے کو منہ نہیں لگاتی، پہلے اپنے طور پر آزما تی ہے، راستوں پر کئی چپلیں گھسواتی ہے، بار بار دیواروں سے چھتیں ہٹاتی ہے، بنا مذہب کے کئی روزے رکھواتی ہے، جھوٹے دعوے کرتی ہے اور طویل فاصلے کراتی ہے، تھکن جب توڑ پھوڑ دیتی ہے تو تازہ دم کرنے کے لیے نیا وعدہ تھما دیتی ہے۔ ایک وعدے سے دوسرے وعدے تک ضرورتیں مسلسل مصروف رہتی ہیں۔ نہ وعدے ختم ہوتے ہیں نہ خواب مایوس ہوتے ہیں۔ یہاں کے خواب بھی پیپل کے درخت کی خاصیت رکھتے ہیں، اچھے برے ہر موسم میں کہیں بھی اگنا شروع ہو جاتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی کوئی ان دیکھا ہاتھ ڈھلان پر سورج کی گیند لڑھکا دیتا ہے اور ممبئی اس کے پیچھے بچوں کی طرح بھاگتی

ہے۔ بھاگتے لوگ تھک جاتے ہیں اور سورج روز کی طرح سمندر میں

اتر جاتا ہے۔“ 22

نذافاضلی نے اس کتاب میں سلام مچھلی شہری کا خاکہ بھی کھینچا ہے جو کفایت لفظی کا عمدہ نمونہ ہے۔ وہ سماج میں فن کار کی ناقدری کے بارے میں اکثر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ سماج کی اسی نا انصافی نے انہیں زیادہ شرابی بنا دیا تھا۔ وہ اسٹیج پر شعر کم سناتے تھے اور تماشا زیادہ دکھاتے تھے۔ کسی لفظ پر اچانک رک جاتے تھے اور سامعین سے سوال و جواب کیا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے مشاعرے میں ایک نظم پڑھی جس میں گھر کے سامان کی فہرست غلطی سے نکلی اور وہ کریم، ساڑی، گھی، ہیر پن، پوڈرو وغیرہ جیسی چیزوں کے نام گنوانے لگے اور سامعین اس کو بھی ان کی جدت سمجھنے لگے۔

”دیواروں کے بیچ“ میں نذافاضلی نے گاندھی جی کے قتل کو بھی زیر بحث لایا ہے۔ گاندھی جی کا قتل ہو جانے کے بعد مسلمانوں میں خوف پیدا ہو گیا تھا۔ جب قاتل کا نام ہندو بتایا جاتا ہے تو مسلمان راحت کی سانس لیتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

”30 جنوری 1948 کو برلا ہاؤس میں ہندوستان میں مسلمانوں کے بے آواز حادثات کے خلاف اٹھنے والا ہاتھ، رام کورٹمن کے روپ میں پہچاننے والے دن رات، ہمیشہ کے لیے ایک دبلے پتلے ادھ ننگے شریہ میں جلا کر راکھ کر دیے گئے ہیں۔ گاندھی جی کے قتل کی خبر ریڈیو سے نشر ہوتی ہے۔ خبر میں قتل کی تصدیق کی گئی ہے لیکن قاتل کا نام نہیں بتلایا گیا۔ مسلمانوں میں اس ادھوری خبر نے دہشت پیدا کر دی ہے۔ جیل فاطمہ کی نمازیں قاتل کے مسلمان نہ ہونے کے اپنے خدا سے دعا مانگتی ہیں۔ ریڈیو میں خدا کے حکم کو ٹالنے کی سکت کہاں، قاتل کا نام کافی تاخیر سے ہندو بتایا جاتا ہے۔ اس خبر سے مسلمان چین کی سانس لیتے ہیں۔ مسلمانوں کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے کو اس حادثہ نے کچھ اور دور کر دیا ہے۔“ 23

”دیواروں کے بیچ“ اسکرین پلے کی تکنیک میں لکھی گئی ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی پلاٹ نہیں ملتا مگر مصنف نے نذا کے بچپن سے لے کر جوانی تک کے بکھرے ہوئے واقعات کو جمالیاتی رنگ آمیزی کے ساتھ

مربوط کرنے کی سعی کی ہے۔ زبان و بیان پر مصنف کی گرفت کافی مضبوط ہے۔ وہ معمولی بات کو بھی غیر معمولی طور پر پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ چیونٹے کی تگ و دو کی جزئیات کو مصنف نے ایسی فن کارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ مصنف نے اس کتاب میں فلیش بیک، فلیش فارورڈ اور خود کلامی کی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ اس ضمن میں سلام بن رزاق رقم طراز ہیں:

”زمانہ حال کے صیغے میں ایک آدھ افسانہ تو لکھا جاسکتا ہے مگر اس صیغے

میں پوری کتاب کا مطالعہ قاری کو تھکا دیتا ہے۔ اس سے واقعات کی

روانی بھی متاثر ہوتی ہے۔ بعض جگہ خود کلامی کا سا گمان ہوتا ہے۔

در اصل تکنیک کے اعتبار سے مصنف تذبذب کا شکار معلوم ہوتا ہے۔

اس کے پاس زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کا انبار ہے مگر انہیں ناول

کے فارم میں ڈھالنے کے لیے جس معروضی نقطہ نگاہ کی ضرورت ہے وہ

مفقود ہے۔“ 24

”دیواروں کے بیچ میں مصنف نے اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کا ذکر سطحی طور پر کیا ہے۔ کتاب کا یہ حصہ قاری کو متاثر نہیں کرتا۔ ایک طرف زبان کی دل کشی کتاب کو دلچسپ بناتی ہے تو دوسری طرف مصنف کی نکتہ سنجی اور فقروں کی بلاغت قاری کو دعوت فکر بھی دیتی ہے۔ ان فقروں میں زندگی کی سچائیوں کا ذکر کرتے ہوئے نفاذ فاضلی نثر میں بھی شعری خصوصیات پیدا کر دیتے ہیں۔ اقوال سازی کی رنگ آمیزی نے ان کی نثر کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ چند اقوال پیش خدمت ہیں:

(۱) ”دوسرے کے غم کو بہانا بنا کر ہم اکثر اپنے ہی کسی غم کو روتے ہیں۔“

(۲) ”مذہب تو انسان کا ہوتا ہے۔ اینٹ پتھروں میں ذات پات کہاں ہوتی ہے۔“

(۳) ”زندگی ہی زندگی کی خوراک ہے۔“

(۴) ”پیڑوں میں ہندو مسلمان تھوڑے ہی ہوتے ہیں جو ایک شہر کو چھوڑ کر دوسرے شہر میں پناہ گزیر ہوں۔“

(۵) ”چہروں اور ناموں کے امتیازات زندگی کے واہے ہیں۔ حقیقت صرف مٹی ہے جس کا ہر جگہ ایک نام، ایک چہرہ اور ایک رنگ ہے۔“

”دیواروں کے بیچ“ اپنے اندر زبان کی ندرت اور اسلوب کی بے پناہ کشش رکھتی ہے۔ اس کتاب

میں ایک حزنِیہ کیفیت شروع سے آخر تک اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ اس کیفیت کے باعث اس میں شعریت بھی درآئی ہے۔ ندانے کہیں کہیں جو اشعار یا نظموں کے ٹکڑے اس میں بروئے کار لائے ہیں ان پر پیوند کاری کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ اردو کی خود نوشتوں یا سوانحی ناولوں میں یہ کتاب اپنے منفرد اسلوب اور بے باکانہ اظہار کے سبب کافی عرصے تک یاد رکھی جائے گی۔ دراصل یہ ایک مخلص انسان کی زندگی اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا کی روداد ہے۔ ندافاضلی کی یہ نثری کاوش بے حد دلچسپ، معلوماتی، فکر انگیز اور قابل مطالعہ ہے۔ اس کاوش سے ان کا ادبی منصب بلند ہوا ہے۔

3. ”دیواروں کے باہر“

نڈا فاضلی کا شمار دورِ جدید کے ممتاز و معروف شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے غزلیں، نظمیں، دوہے اور گیت لکھ کر عوام و خواص میں اپنی منفرد شناخت قائم کی۔ ان کے قلم سے سات (7) شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو نثر کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی۔ انھوں نے اپنے منفرد اسلوب سے اردو نثر میں اضافہ کیا۔ شاعری کی طرح ان کی نثر بھی بڑی دل کش، توانا اور موثر ہے۔

”دیواروں کے باہر“ نڈا فاضلی کا سوانحی ناول ہے۔ یہ اردو نثر میں ان کی تیسری تصنیف ہے۔ اس کی اشاعت 2000 میں ہوئی۔ یہ سوانحی ناول 239 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں انھوں نے اپنی پیدائش سے لے کر چھ دہائیوں تک کے اپنے تجربات و مشاہدات کا حال بیان کیا ہے۔ انھوں نے راوی بن کر اپنے بیانیے میں خود کو ضمیرِ غائب میں پیش کرنا پسند کیا ہے۔ ان کی سوانح میں بے جا مبالغے اور تصنع کا عمل دخل نہیں ملتا۔ اس ناول میں وہ کرداروں کے درمیان گوالیار کی گلیوں میں گھوم پھر کر تلاش و معاش کے سلسلے میں دہلی پہنچتے ہیں۔ اس ناول میں ان کے عہدِ طفلی سے لے کر عہدِ شباب اور خاندان کے پاکستان، ہجرت کرنے تک کا زمانہ ہے۔

”دیواروں کے باہر“ میں ان کی بے گھری کا دور، ممبئی شہر میں فکرِ معاش اور اپنی شناخت پانے کی طویل جدوجہد کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ دراصل یہ ممبئی کی پیچ در پیچ سماجی زندگی کا ایک دل چسپ مرقع بھی ہے اور انکشافِ ذات کا ایک معنی خیز اشارہ بھی۔ بقول شاہد ماہلی:

”دیواروں کے باہر ان کے پہلے مقبول سوانحی ناول ”دیواروں کے بیچ“ کا دوسرا حصہ ہے! اس دوسرے حصہ میں وہ دیواروں کے بیچ سے نکل کر دیواروں کے باہر آئے ہیں۔ اس میں ان کے سفر کا رقبہ کئی سمتوں اور زمینوں کا پھیلاؤ لیے ہوئے ہے۔ ”دیواروں کے بیچ“ کی طرح اس میں بھی نڈا فاضلی اپنے عہد کے تماشا بھی ہیں اور اس کے تماشا بھی ہیں۔ یہاں بھی وہ بہت سے جانے انجانے کرداروں کے اجتماع میں خود ایک کردار ہیں اور مہا بھارت کے سنجے کی طرح جو دیکھ رہے ہیں وہ دکھا بھی رہے ہیں لیکن اس فرق کے ساتھ پہلے وہ اپنا غم سنا رہے تھے اور اب اس غم کو اپنے دور کا آئینہ بھی بنا رہے ہیں۔ ”دیواروں کے باہر“

کے ذریعہ نڈا فاضلی نے ان حیرتوں کو روشن کرنے کی سعی کی ہے جنہیں

ہماری فیشن زدہ دانش مندیوں نے بجھا دیا ہے۔“ 25

”دیواروں کے باہر“ کے آغاز میں انھوں نے اپنے گھر کا ذکر کیا ہے۔ اس گھر کے لیے ان کو کافی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ تمام پریشانیوں سے گزرتے ہوئے آخر میں انھیں گھر مل ہی گیا۔ اس سوانحی ناول کی ابتدا ایک نظم سے ہوتی ہے جس میں گھر کا ذکر ملتا ہے:

جس گھر میں اب میں رہتا ہوں

وہ میرا ہے / اس کے کمروں کی آرائش

اس کے آنگن کی زیبائش / اب میری ہے

مجھ سے پہلے / مجھ سے پہلے سے بھی پہلے

یہ گھر کس کس کا اپنا تھا / کن کن آنکھوں کا پسینا تھا

کب کب اس کا کیا نقشہ تھا

یہ سب تو کل کا قصہ ہے / اس کا آج میرا حصہ ہے

آج کے کل بن جانے تک ہی

میرا بھی اس سے رشتہ ہے

اس گھر میں اب میں رہتا ہوں!

(دیواروں کے باہر، نڈا فاضلی، ص: 7/8)

نڈا فاضلی نے بڑی بے باکی کے ساتھ اس ناول کو تحریر کیا ہے۔ ان کی نظر عام لوگوں اور عام واقعات کو بھی خاص طرح سے دیکھنے کا ہنر رکھتی ہے۔ ایک طرف بھکاری، چائے والے، مزدور اور مظلوم عورتیں اس ناول کا حصہ ہیں تو دوسری جانب مصنف اور فن کاروں کے ساتھ ساتھ مشہور ہستیاں بھی اس ناول کا حصہ ہیں۔

ممبئی جیسے شہر میں ملک کے کونے کونے سے آنے والوں کے رہنے اور بسنے کے عمل کو جاننا اور ان کے ذہنی سفر سے گزرنا ہو تو ”دیواروں کے باہر“ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ نڈا نے جدوجہد کے دوران ممبئی میں کئی ٹھکانے تبدیل کیے۔ پالی ناکہ کا ہوٹل ہو یا مکتبہ جامعہ انھوں نے دونوں کا خاکہ بڑے دل چسپ انداز میں کھینچا ہے۔ اس حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

”پالی ناکہ کے اس ہوٹل میں سبھی فلم اسٹار گھر ہیں۔۔۔ اس ہوٹل میں

سب کے اپنے خواب چہرے ہیں۔ کوئی نغمہ نگار بننا چاہتا ہے، کوئی سنگیت کی دنیا میں تہلکہ مچانا چاہتا ہے، کوئی ہیرو، کوئی ولین ہے۔ لیکن سب مہینوں سے بے کار ہیں۔ گزر اوقات کے لیے ان میں سے بیشتر نے اپنے مزاج سے مختلف پیشے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جس کو ہیرو بننا ہے وہ لکنگ روڈ کی ایک بڑی ہوٹل میں ویٹر کا کام کرتا ہے۔ ولین باندہ سے گوشت لاکر گھروں میں سپلائی کرتا ہے۔“ 26

”دیواروں کے باہر“ کے مطالعے سے ندافاضلی کی ذات کے خالی پن اور تنہائی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اس میں انھوں نے 1965 میں ممبئی آنے کے بعد کے تمام حالات کو بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ان کے والدین اور باقی افراد خانہ پاکستان جانے کا فیصلہ کرتے ہیں لیکن ان کو یہ فیصلہ منظور نہیں ہے۔ وہ ہندوستان میں ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کا یہ فیصلہ ان کی زندگی میں اداسی اور خلش پیدا کرتا ہے جس کا ذکر ان کی تحریروں میں جا بہ جانظر آتا ہے۔ تقسیم ہند نے ان کی ذات کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ ملک و قوم کے ہر فرد پر اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ اس کے علاوہ زبان و ادب نے بھی اس کے اثرات قبول کیے۔ ”دیواروں کے باہر“ میں بھی ملکی تقسیم کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس ناول میں ندافاضلی نے اپنی شخصیت اور متعلقہ عہد کے تمام حقائق کو فکشن کے انداز میں اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ اس ناول کے ذریعے انھوں نے تنہائی، یاد ماضی، بچپن کے واقعات اور ذہنی خلفشار کو پیش کیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ان کی ذاتی زندگی کی نقاب کشائی کرتی ہے بلکہ دیگر کردار کہانی کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس تناظر میں حنا فردوس نے اپنے مضمون ”دیواروں کے باہر: ایک مطالعہ“ میں لکھا ہے:

”دیواروں کے باہر“ کے ذریعہ ندافاضلی کی ذاتی زندگی، والدین، عزیز واقارب، بچپن کے حالات، اخلاق و کردار، تعلیم و ملازمت کے لیے ان کی جدوجہد، فلم انڈسٹری سے وابستگی، مختلف فلموں اور کمال امر وہی کی فلموں کے لیے گانے لکھنا، سپر ہٹ اور اپنی شہرہ آفاق شناخت قائم کرنا، نڈا اور عشرت کے تعلقات، عشرت کی مجبوری اور دونوں کے رشتے کی کشیدگی، محمودہ سے دوستی، جمیل فاطمہ کا اعتراض، نڈا اور مالتی کی

ملاقات، بہن قمر طلعت کی مخالفت کے باوجود دونوں کا ازدواجی رشتے میں بندھنا، مگر گزرتے وقت کے ساتھ دونوں کے درمیان حائل نا معلوم خاموشی اور بے نام اداسی وغیرہ کے تفصیلی حالات کا علم ہوتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف نڈافاضلی کی زندگی کے مختلف جہات کی نقاب کشائی کرتی ہے بلکہ اور بھی دیگر کردار کہانی کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے

ہیں۔“ 27

”دیواروں کے باہر“ میں نڈافاضلی نے زماں و مکاں کے مسائل، فنا و بقا، تدبیر و تقدیر کے الٹ پھیر، وقت و حالات کی تبدیلی، انسانی جدوجہد، ماضی کے چھوٹے بڑے واقعات، زندگی کے مختلف مراحل اور تلخ و شیریں تجربات کے مختلف رنگوں کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس ناول میں ان کا اسلوب کافی جان دار نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے نامی انصاری اپنے مضمون ”دیواروں سے باہر۔۔۔۔۔ خودنوشت سوانح“ میں رقم طراز ہیں:

”نڈا کے جاندار اور توانا اسلوب نے اس کتاب کو اور زیادہ لائق مطالعہ بنا دیا ہے۔ سیکڑوں کی تعداد میں ہر سال چھپنے والی اردو کتابوں میں خال خال ایسی کتابیں ہوتی ہیں جن کو پڑھ کر ذہن و دل کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں اور میں اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انہیں خال خال کتابوں میں سے ایک کتاب ”دیواروں کے باہر“ بھی ہے۔“ 28

نڈافاضلی نے دورِ حاضر کی مصروف زندگی، اخلاقی بے راہ روی، افراد کی ظاہری محبت اور رشتوں کے تقدس کی پامالی کو موضوع بحث بنایا ہے۔ تعلیم، رہائش، ملازمت اور لباس غرض کہ اطمینان بخش زندگی کی آسائشوں کا انتظام کرنے میں انسان کی پوری زندگی یوں ہی گزر جاتی ہے۔ نڈافاضلی نے جس گھر، پہچان اور مقام کو بنانے کے لیے اپنے والدین، عزیز واقارب اور دیگر رشتے داروں سے دوری برداشت کی، ان کو حاصل کرنے کے بعد جب وہ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو یہ تمام رشتے ان سے دور ہو چکے ہوتے ہیں اور وہ تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں درج ذیل اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

”روٹی، گھر، کپڑے اور کتابوں کو ایک جگہ کرنے میں اسے بیس سال سے زیادہ لگ گئے۔ الگ الگ سمتوں کے ان باسیوں کی یکجائی کی مدت ہر ایک کے ساتھ مختلف ہوتی ہے۔ ان چند خوش قسمت افراد کے

علاوہ جن کو پیدائش سے ہی وراثت میں سب کچھ مل جاتا ہے، سبھی کو انھیں اکٹھا کرنے کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ کچھ بنے بنائے راستوں کے مسافر ہوتے ہیں، پیدا ہونا، تعلیم حاصل کرنا، نوکری کرنا، گھر بنانا، نڈا کو اس مروجہ ترتیب سے جینے کی سہولت حاصل نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے لیے جو راستہ منتخب کیا تھا یا حالات نے اسے جس راستے پر ڈال دیا تھا اس میں مقابلتاً زمین سخت اور آسمان دور تھا۔“ 29

نڈا فاضلی نے اس ناول میں ماضی کے واقعات کو حال کے صیغے میں بیان کر کے انھیں دوبارہ زندہ کیا ہے۔ ان کی حالیہ زندگی کے ساتھ ماضی ہمہ وقت چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ اسی لیے وہ ممبئی میں رہ کر بھی گوالیار میں نظر آتے ہیں۔ انھیں ممبئی کی مغرب زدہ تہذیب، نوجوان نسل میں اس کی اندھی تقلید، اخلاقی اقدار کی پامالی، مذہب سے بیگانگی، بے راہ روی، جھوٹی شان اور بے ایمانی کا احساس شدت سے ستا رہا تھا۔ انھوں نے کاروباری لوگوں کی بڑھتی آبادی اور تنگ پڑتی زمین اور زمین کو لے کر روز بروز بڑھتے جرائم اور موقع پرست سیاست دانوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل اقتباس ملاحظہ کریں:

”دھرتی پوجا کے اس دلش میں دھرتی کے ایمان کا ثبوت شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادیاں ہیں۔ ان آبادیوں میں پلتے جرائم ہیں۔ ان جرائم کی کوکھ سے پھوٹی سیاستیں ہیں، ان سیاستوں کے ہاتھوں بنے ہوئے داؤد ہیں، گاؤں ہیں، حاجی مستان ہیں اور ان سماج دشمن سے جڑی ہوئی سرکاری ہیں اور ان سرکاری شکنجوں میں لمحہ لمحہ ٹوٹتے بکھرتے عوام ہیں۔“ 30

نڈا فاضلی نے اس ناول کو مختلف کرداروں کے ذریعے آگے بڑھانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ان کرداروں میں جمیل فاطمہ (ماں)، عشرت (مگتیر)، قمر طلعت (بہن)، مالتی جوشی (بیوی) قابل ذکر ہیں۔ جمیل فاطمہ کا کردار اس ناول میں بار بار ابھر کر قارئین کے سامنے آتا ہے۔ جمیل فاطمہ کی نڈا سے شدید محبت، بچوں سے لگاؤ، اس کی انسان دوستی اور دردمندی کا جذبہ اس ناول میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔

عشرت اور نڈا کے رشتے میں بدگمانیوں اور شکایتوں کے باوجود ان کے اقربا دونوں کی شادی کرانا چاہتے تھے۔ نکاح ہو جانے کے بعد بھی دونوں میں دوریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور عشرت اپنے کالج کے زمانے

کے سینئر اسٹوڈنٹ کو اپنا جیون ساتھی بنا کر بھوپال منتقل ہو جاتی ہے۔ اس طرح کئی بار بنتا بگڑتا رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔

مالتی جوشی اور نندا فاضلی کی ملاقاتیں زور پکڑتی ہیں۔ گھر والے مخالفت پر اتر آتے ہیں۔ لیکن گھر والوں کی مخالفت کے باوجود وہ نندا کے ساتھ اپنا زیادہ وقت گزارتی ہے اور آخر کار دونوں کا رشتہ ہو جاتا ہے۔ جب بہت وقت تک دونوں ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پاتے تو نندا کہتے ہیں:

کچھ طبیعت ہی ملی تھی ایسی، جین سے جینے کی صورت نہ ہوئی
جس کو چاہا اسے اپنا نہ سکے، جو ملا اس سے محبت نہ ہوئی

31

نندا فاضلی نے اپنے ناول ”دیواروں کے باہر“ میں جواہر لال نہرو اور گاندھی جی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ گاندھی جی کو جواہر لال نہرو کے مقابلے میں زیادہ پسند کرتے تھے۔ ان دونوں لیڈروں کا تقابل کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

”نہرو ڈسکوری آف انڈیا لکھنے کے باوجود ہندستان سے اتنا واقف نہیں تھے جتنا گاندھی تھے۔ نہرو اپنے وقت کے کامیاب ترین وکیل موتی لال نہرو کے اکلوتے بیٹے تھے، آسائشوں میں پلے بڑھے تھے۔ مسائل کو کمروں میں دلیلوں اور فارمولوں سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ گاندھی ان کے برعکس زمین کے بیٹے تھے۔ زمین کے درد کو زمین بن کر پہچانتے تھے۔ نہرو کا دلش بڑے بڑے شہروں میں بڑی بڑی صنعتوں میں تھا اور گاندھی اسے ان چھوٹے چھوٹے، کچھڑے ہوئے علاقوں میں تلاش کرتے تھے جن میں تین چوتھائی دلش بستا ہے۔ لیکن دلش کے وکاس میں باپو کی سوچ کو ان کے جیون کال میں چرخہ اور سوت بنا کر الگ کر دیا جاتا ہے اور پنڈت نہرو کا ہندستان شہروں کے راستوں سے آگے بڑھتا جاتا ہے۔“ 32

نندا فاضلی نے اس ناول میں کچھ ادیبوں اور فن کاروں کے مزاج و کردار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان شخصیات میں راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، راہی معصوم رضا، سردار جعفری، اختر الایمان، ظانصاری، کمال امر وہی، جون ایلیا، وحید اختر، حسن نعیم، شاذ تمکنت، نیاز حیدر، عزیز قیسی، عزیز جاوید، اندیور اور تصدیق

سہاوری کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان شخصیات کے حالات و واقعات، ایک دوسرے کے متعلق ان کے خیالات و تعلقات، باہمی روابط، ہم عصروں میں موازنہ و مقابلہ اور خود نڈافاضلی کی ان کے بارے میں آرا اس ناول میں شامل ہیں۔ غرض اس ناول میں نڈافاضلی کا تنقیدی شعور بھی بڑا نکھرا، ستھرا اور جاندار نظر آتا ہے۔ انھوں نے ایک ایک، دود و فقروں میں کسی شاعر یا افسانہ نگار کے بارے میں جو نپنی تلی رائے ظاہر کر دی ہے وہ بعض اوقات طویل مقالوں پر بھی بھاری نظر آتی ہے۔ وہ راہی معصوم رضا کے بارے میں لکھتے ہیں:

”راہی خوش شکل، خوش لباس اور خوش مزاج انسان تھے۔ ایک زمانے

میں مشاعرہ کے مقبول شاعر بھی تھے۔ جس محفل میں ہوتے اپنی خوش

گفتاری سے مردوں سے زیادہ خواتین کو متوجہ کرتے۔ یوں تو داغ کی

طرح ان کے نامہ اعمال میں کئی پردہ نشینوں کے نام ہیں۔“ 33

نڈافاضلی اختر الایمان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ انھیں غالب سے عقیدت تھی۔ وہ غزل کے مخالف نظر آتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ غزل نے غالب کو وہ وقار نہیں بخشا جس کے وہ مستحق تھے۔ سردار جعفری اور کیفی اعظمی کو وہ شاعر ماننے سے انکار کرتے تھے۔ اقتباس دیکھیے:

”اختر الایمان نے شروع سے ہی جیون کو اپنے طور پر برتا ہے، اپنی طرح

سے جیا ہے۔ زندگی کی ترجیحات اور انتخابات میں بھی انہیں کی مرضی کا

دخل رہا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو انسان کی ضمیر کی آواز کہا ہے۔ ان

کے پاس اپنے اندر جھانکنے اور وجود کے تضادات کی پہچان کی آنکھ بھی

ہے جس نے ان کی فکر میں انفرادی لٹک اور اسلوب میں تازگی کی چمک

پیدا کی ہے۔ لیکن انھوں نے سماج اور فرد کے جبر یہ سمجھوتہ کو جس طرح

ایک سماجی قدر کے طور پر بار بار دہرایا ہے اور اسے زندہ رہنے کے لیے

ضروری ٹھہرایا ہے۔ اس سے ان کا شعری کردار فارمولائی اور معاشرہ کے

ایک بہت چھوٹے حصہ میں محصور محسوس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں زندگی کا

مقصد صرف زندگی کرنا ہے۔ اس کا رشتہ تاریخ، تہذیب اور وقت کے

تسلل سے کٹ کر یک رخا اور سمٹا ہوا لگتا ہے۔“ 34

نڈافاضلی نے اپنے دوست حسن نعیم کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ”دانا غزل“ ہیں۔ اسی طرح

میر تقی میر کو ”خدائے غزل“ اور غالب کو ”بابائے غزل“ کہا ہے۔ کمار پاشی سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ وحید اختر سے بھی نڈا کے تعلقات گہرے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ وحید اختر کے منہ پر دوسروں کے لیے ہمیشہ دو لفظ رہتے تھے، جاہل اور احمق۔ ایران سے ہندستان آرہے تھے کہ جہاز حادثہ کا شکار ہو گیا اور ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔ اس حادثہ کا اثر ان کے دل و دماغ پر پڑا اور شراب کی لت لگنے سے گردوں کا عارضہ ہوا اور اس دنیا سے چل بسے۔

جون ایلیا کی شخصیت اور شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نڈا لکھتے ہیں کہ انھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ پاپ سنگر کی طرح مشاعرہ پڑھتے تھے۔ شراب کم پیتے تھے لیکن نشہ کا احساس زیادہ دکھاتے تھے۔ جون ایلیا نے اپنی خداداد صلاحیت سے وہ کام نہیں لیا جس کی ان سے توقع تھی۔ ان کی شاعری کا فکری دائرہ محدود ہی سہی لیکن ان کے پڑھنے کا انداز نرالا تھا۔ وہ اپنی بیوی سے الگ ہو کر زندگی جی رہے تھے۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری کا رجحان رومانوی تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں مشترکہ تہذیب کا بٹوارہ نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے شعری مجموعہ ”شاید“ میں بنا انتخاب کے شاعری درج کی تھی جس سے ان کی شعری ذہانت پر کتاب کی ضخامت حاوی ہو گئی تھی۔ نڈا لکھتے ہیں:

”کتاب (شاید) وقت سے پہلے کھو گئی۔ بازار میں جاگتی رہی، جاگنے

والوں کے لیے سو گئی۔ نہ جون ایلیا نے اپنے آپ کو ڈھنگ سے پہچانا

اور نہ قارئین نے انہیں جاننے کی طرح جانا۔“ 35

کرشن چندر کو نڈا فاضلی ایشیا کا عظیم افسانہ نگار گردانتے ہیں۔ ان کی نثر میں شگفتگی ہے جو ان کے پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہے۔ وہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے۔ فلم انڈسٹری میں ناکامی کے بعد انھوں نے ادب سے اپنا رشتہ استوار رکھا اور ادب کو ذریعہ معاش بنالیا تھا۔

راجندر سنگھ بیدی کے بارے میں نڈا فاضلی لکھتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ادب کی مقامی چہل پہل سے دور نہیں ہونے دیتے۔ انھوں نے اگرچہ کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا وہ قابل ستائش ہے۔ انھوں نے انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کو وسیع تہذیبی تناظر میں دیکھا تھا اور یہی چیز ان کو افسانوی ادب میں ممتاز بناتی ہے۔

عصمت چغتائی کے بارے میں نڈا فاضلی نے لکھا ہے کہ انھوں نے مرد اور عورت کی برسوں پرانی سیماؤں کو گڈ مڈ کرنے کا جواہری تجربہ کیا ہے وہ ان کا ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ وہ مزاجاً باغی طبیعت کی علامت

ہیں۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا، محسوس کیا، اس کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں زندہ، بے باک اور بے تکلف زبان استعمال کی ہے۔ اس حوالے سے یہ اقتباس دیکھیے:

”انھوں نے جیسا دیکھا، جیسا محسوس کیا ویسا لکھا۔ انھوں نے زندگی کو زندگی کی آنکھوں سے دیکھا۔ کسی نظریہ یا عقیدہ کی کھڑکی سے اس کا دیدار نہیں کیا۔ اس کی چہل پہل میں شریک ہو کر، اس کے دکھ درد میں شامل ہو کر اسی کے محاورہ میں اسے بیان کیا۔“ 36

نڈا فاضلی سیاست کو برا سمجھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے یہ لوگ مذہب کے نام پر ہندو مسلم فرقہ واریت کو بھڑکاتے ہیں۔ کئی گھروں کے چراغ گل ہو جاتے ہیں، بستیاں ویران ہو جاتی ہیں اور بہت سوں کو بے عصمت کیا جاتا ہے۔ غرض انسانی تباہ کاریوں کی روایت سیاستوں کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے۔ سیاست کا مقصد لوگوں کو تقسیم کرنا ہوتا ہے۔ کبھی علاقوں کے نام، پر، کبھی مذہب کے نام پر اور کبھی اقتدار کے نام پر لوگوں کو تقسیم کرنا ہوتا ہے۔ نڈا فاضلی چوں کہ ملک کی تقسیم کے خلاف تھے۔ اس لیے وہ لکھتے ہیں:

”مذہب کی بنیاد پر برصغیر کی تقسیم ہوئی۔ اس تقسیم میں ایک لاکھ سے زیادہ آدمی دونوں ملکوں میں مارے گئے اور تقریباً بیس لاکھ بھیڑ بکریوں کی مانند دیس سے پردیس ہنکائے گئے۔“ 37

نڈا فاضلی نے بابر می مسجد کے انہدام اور اس کے پس پردہ سیاسی مفاد کو کھل کر پیش کیا ہے۔ انھوں نے 6 دسمبر 1992 کو وحشت اور دہشت کا بڑا حادثہ قرار دیا۔ اس دن شیوسینا کی ریلی ہو رہی تھی اور اس کے کارکنوں نے بابر می مسجد کو ڈھایا تھا جس سے ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے تھے۔ شیوسینا والے اس کو اپنی کامیابی قرار دیتے ہیں۔ نڈا فاضلی نے اس پورے واقعے کو اپنے ناول میں رقم کرتے ہوئے لکھا ہے:

”گھر جل رہے تھے، بے قصور مارے جا رہے تھے اور یہ سب کچھ پولیس کے سامنے، عدالت کی موجودگی اور سرکار کے اقتدار میں ہوتے ہوئے ہو رہا تھا۔ یہ تو سب جانتے تھے کہ جو ہوا یا جو ہو رہا ہے اس کا قصور وار کون تھا۔ لیکن چھ دسمبر کے اتنے سر، اتنے ہاتھ اور اتنے چہرے تھے کہ کسی ایک سر، کسی ایک ہاتھ یا کسی ایک چہرہ سے اس کی شناخت مشکل

تھی۔“ 38

نَدَافَضلی نے اس ناول میں فن، فن کار اور فن کی تخلیق پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے فن کو قدرت کا چمٹکار قرار دیا ہے۔ فن کار اس کے اظہار اور معیار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ فن کی پہچان پر بحث کرتے ہوئے نَدَافَضلی لکھتے ہیں:

”فن کی تخلیق کی طرح فن کی پہچان کا مسئلہ بھی دو اور دو چار کی طرح سیدھا سادہ نہیں ہے، کافی پیچیدہ ہے۔ ایک ہی عہد میں اس کی پہچان کے زاویے الگ الگ ہوتے ہیں۔۔۔ اسی لیے ادب میں تنقید کی ہر سرپرستی فن کار کے لیے گمراہ کن ہوتی ہے۔ یہاں تخلیق کار کے لیے اپنے اعتبار اور معیار سے ہی روشنی پھوٹی ہے۔ کبیر اور نظیر کی مثالیں ادب تاریخ کی زندہ شہادتیں ہیں۔ نظیر برسوں با اعتباروں میں بے اعتبار رہے اور کبیر صدیوں تک ناقدین کی بے توجہی کا شکار رہے۔“ 39

نَدَافَضلی نے اپنے ناول میں فن کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری کے متعلق بھی قلم اٹھایا ہے۔ اپنی شاعری کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

”میری شاعری نہ صرف ادب اور اس کے پڑھنے والوں کے ادبی رشتے کو ضروری مانتی ہے، اس کے تہذیبی و سماجی حوالے کو اپنا معیار بھی جانتی ہے۔ یہ ایک طرح ادب کی اس روایت کی حمایت ہے جو ادب کی اشرافیہ کی پرانی حکمرانی سے آزاد کر کے اسے عوامی وقار عطا کرتی ہے۔ یہ شاعری بند کمرے سے باہر نکل کر چلتی پھرتی زندگی کا ساتھ نبھاتی ہے اور ان علاقوں میں بھی جانے سے نہیں ہچکچاتی جہاں روشنی بھی مشکل سے پہنچ پاتی ہے۔“ 40

آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نَدَافَضلی نے اس ناول میں ترقی پسندی، تقسیم ہند، جدیدیت، سیاست اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے تغیر زمانہ، بدلتی ہوئی انسانی سوچ، امیری غربتی کے مسائل، مذہبی عقائد، زندگی کے مختلف تقاضے وغیرہ جیسے مسائل کو استعاراتی اور علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی زبان نہایت شگفتہ اور اسلوب توانا اور جان دار ہے۔ نَدَافَضلی نے جس بے باکی اور ایمان داری سے فن کاروں اور مشہور ہستیوں پر قلم اٹھایا ہے وہ ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔

4. ”چہرے“

انسان کی شخصیت سکے کے دو پہلوؤں کی طرح ظاہر و باطن کے منطقوں میں بیٹھ رہتی ہے۔ سماجی زندگی میں انسان زیادہ تر اپنے حوالے سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ انسان کے ظاہر میں اس کا چہرہ، اس کے خدو خال اور اس کے سراپے کی تمہید بھی بنتے ہیں اور تفصیل بھی۔ ہر شخص اپنے ظاہر کے ساتھ اپنے باطن میں بھی جیتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے باطن تک لے جانے والے راستوں کا پتا ہر کسی کو نہیں بتاتا۔ اسی لیے بعض سراپا نگار کسی شخصیت کا سراپا ٹھیک سے بنانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سراپا نگار کسے تو کیا کرے؟ اس کا جواب نڈافاضلی کی کتاب ”چہرے“ کے مطالعے سے مل سکتا ہے۔ انھوں نے بڑی محنت اور لگن سے یہ چہرے بنائے ہیں۔ نڈافاضلی کی اس کاوش سے پورا سراپا سر سے پیر تک کھل اٹھتا ہے اور بولنے لگتا ہے۔

”چہرے“ نڈافاضلی کی چوتھی نثری تصنیف ہے۔ یہ کتاب 2002 میں معیار پبلی کیشنز، دہلی کے توسط سے منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب 216 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے مشاعروں کے شاعروں کے خاکے قلم بند کیے ہیں۔ اس میں انھوں نے یاد رفتگاں کے طور پر ایسے شاعروں کی زندگی کے حالات اور فن کے بارے میں لکھا ہے، جو اس کتاب کے تحریر کیے جانے کے وقت تک وفات پا چکے تھے۔ اس کتاب میں نڈافاضلی نے 23 شعرا کے خاکے تحریر کیے ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں:

- | | | |
|----------------------|---------------------|---------------------|
| (1) نوح ناروی | (2) ناطق گلاٹھوی | (3) نواب حکیم |
| (4) مولانا سہا مجددی | (5) شعری بھوپالی | (6) انور صابری |
| (7) شکیل بدایونی | (8) فیاض الدین فیاض | (9) خمار بارہ بنگوی |
| (10) شفا گوالیاری | (11) نریش کمار شاد | (12) محمد علی تاج |
| (13) اسد بھوپالی | (14) دل لکھنوی | (15) تاباں جھانسی |
| (16) اختر نظمی | (17) رازالہ آبادی | (18) فضل تابش |
| (19) کرشن ادیب | (20) کیف بھوپالی | (21) ریاض چوہری |
| (22) شمیم فرحت | (23) صابر دت | |

اس کتاب کی اشاعت سے قبل یہ مضامین ممبئی کے روزنامہ ”انقلاب“ میں قسط وار شائع ہو چکے

تھے۔ نداء فاضلی کے والد مرتضیٰ حسن (دعا ڈبا نیوی) گوالیار میں اکثر شعری نشستیں اور مشاعرے منعقد کیا کرتے تھے۔ ان کو بچپن ہی سے اس دور کے مشہور شاعروں کو قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا تھا۔ جب وہ بھوپال منتقل ہوئے تو وہاں کے مشہور شاعروں کو بھی دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں شامل زیادہ تر شاعروں کا تعلق گوالیار اور بھوپال سے ہے۔ بعض شعرا ایسے بھی ہیں جن سے ان کی پہچان دہلی اور ممبئی میں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ شعرا ایسے بھی ہیں جن سے وہ مختلف شہروں کے مشاعروں میں آشنا ہوئے تھے۔

نداء فاضلی کی کتاب ”چہرے“ ان شعرا کی شخصیات پر مشتمل ہے جو اپنے زمانے میں مشاعروں کی آبرو سمجھے جاتے تھے۔ ان مضامین کے توسط سے انھوں نے اردو زبان کی مقبولیت اور ادب و ثقافت میں مشاعروں کی اہمیت پر بڑی نکتہ رسی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ نداء کی دلچسپ اور پرکشش نثر نے ان شخصیتوں کی چمک دمک میں مزید اضافہ کیا ہے۔ اس حوالے سے وسیم بیگم اپنے مضمون میں لکھتی ہیں:

”چہرے میں نداء نے ایسی شخصیات کو موضوع بنایا ہے جو کبھی حال کی آبرو

تھے۔ اب ماضی کی گرد میں کھو چکے ہیں۔ دراصل یہ کردار اس دور کی

علامتیں ہیں جب ادب اور زندگی کا رشتہ دورِ حاضر کی طرح بازاری اور

کاروباری نہیں ہوا تھا۔“ 41

نداء فاضلی نے اپنی نثری کتاب ”چہرے“ میں مشاعرہ اور اس کے مقبول شاعروں کی سراپا نگاری فن کارانہ انداز میں پیش کی ہے۔ ان کے شعری مزاج کا پسندنا پسند کا اپنا ہی معیار اور پیمانہ ہے۔ ادب سے وابستگی ان کے خون میں شامل ہے۔ وہ ادب کے بے تکلف اور بے محابہ قاری ہیں۔ اس لیے ان کے سراپوں کو بے توجہی سے نہیں پڑھا جاسکتا۔ انھوں نے ”چہرے“ میں کرداروں کی ایسی کامیاب اور شگفتہ مرصع سازی کی ہے کہ بے اختیار داد دینا پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں زیرِ رضوی اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں:

”مشاعروں کے شاعروں کے تئیں نداء کے دل میں ایک ایسی انسانی

ہمدردی ہے جو کہیں بھی کسی کردار کے کپڑے نہیں اتارتی، اسے بدنام

نہیں کرتی، کچھ کے نہیں لگاتی اور اس کا پرزور قہقہوں سے مذاق نہیں

اڑاتی۔ ان کرداروں کی سراپا سازی کرتے ہوئے ان کا رویہ اس

کارٹونسٹ کا سا ہے جو اپنی محبوب اور پسندیدہ شخصیت کو کارٹون میں

ڈھالتے ہوئے ایک عجیب سی سرخوشی میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ پہلے خود
ہر سراپے سے کھیلتے ہیں، اس کے ساتھ ہنستے بولتے ہیں اور پھر اسے
قاری کے حوالے کر کے دور کھڑے ہو کر پوچھتے ہیں۔ کہئے جناب! انور
صابری اچھے لگے؟ دل لکھنوی پسند آئے؟ صابر دت نے اپنے پاپ کا
دھواں آپ پر پھینکا؟“ 42

اس دور میں مشاعرے اردو تہذیب کا اہم حصہ ہوا کرتے تھے اور مشاعروں کے سٹیج شاعروں کی سخن
سرائی، سامعین کی سخن فہمی اور قدر شناسی سے پر رونق رہا کرتے تھے۔ ندانے ان شاعروں کے سراپا، لباس،
حلیہ، مزاج و کردار، رنگِ سخن اور طرزِ ادائیگی کی تفصیلات کو اپنی کتاب میں بہت خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔
سراپے کے بیان میں ندامت گفنگی اور برجستگی سے کام لیتے ہیں جس سے ان کی سراپا نگاری ادبی بلندیوں کو چھو
لینے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ رازِ الہ آبادی کے کلام کا نقشہ کھینچتے ہوئے ندا لکھتے ہیں:
”۔۔۔ ان میں ایک مشہور نام رازِ الہ آبادی کا بھی تھا۔ کھکتی ہوئی تیز
آواز، لفظوں کو گھنگروؤں کی طرح ایک دوسرے سے پروتی ہوئی جب
مصرع کے اختتام تک پہنچتی تھی تو پورا ہال کھٹکنا اٹھتا تھا اور جب اسی
طرح پازیب کی طرح بجتا ہوا پورا شعر مکمل ہوتا تھا تو سارا مشاعرہ جگمگا
اٹھتا تھا۔ آواز کا حسن لفظوں پر سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتا تھا۔ شعر
کیسے بھی ہوں، وہ جب تک سناتے تھے، ہنگامہ مچاتے تھے۔“ 43

ندافاضلی ہر سراپے کو بڑے انوکھے پن سے سجاتے اور سنوارتے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں
مشاعرے کے سٹیج کو کلیدی اہمیت دی ہے۔ اس میں وہ بتاتے ہیں کہ شاعر کس طرح سٹیج پر آتے ہیں، کس
طرح بیٹھتے ہیں، شعر کس طرح سناتے ہیں اور کس طرح مشاعرے کو زیر و بر کر کرتے ہیں۔ وہ شاعر کے پڑھنے
کے انداز کو ایسی جزئیات اور منفرد لفظیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ شاعر کی ہر ادا، ہر انداز مجسم ہو جاتا
ہے۔ اس ضمن میں زیرِ رضوی اپنے مضمون ”چہرے۔۔ ایک قد آدم آئینہ“ میں لکھتے ہیں:
”نوح صاحب بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ آواز زیادہ بھاری نہ تھی لیکن ہاتھوں
کے اشاروں، آنکھوں کے گھماؤ کے ساتھ مصرعوں کو مناسب جگہوں پر
ٹھہرا کر آگے بڑھاتے تھے۔ ردیف قافیہ بولتے ہوئے ہوتے تھے۔
دوسرا مصرع آدھا پورا ہی ہوتا تھا کہ سامعین باقی کا حصہ بے ساختہ بول

پڑتے تھے۔“

”شعری بھوپالی آواز کے اتار چڑھاؤ سے جادو جگاتے تھے۔ ان کا ترنم دوسروں سے مختلف ہی نہیں ہوتا تھا، اس میں گائیکی سے زیادہ لحن کا حسن تھا۔“

”انور صابری آواز اور الفاظ کا فرق پہچاننے کے باوجود تا عمر الفاظ پر آواز کا ملمع چڑھا کر ہی مشاعروں کا کاروبار چلاتے رہے۔“

”نزیش کمار شاد تخت میں پڑھتے تھے۔ تیکھی، کراری آواز اور ہاتھ پاؤں کے چلانے کے انداز کے ساتھ جملے سازی اور چٹکے بھی ان کی شعر خوانی کا حصہ تھی۔ خود تماشا بن کر سامعین کو تماشا بناتے تھے۔ وہ کلام سناتے ہی نہیں تھے اسے دکھاتے بھی تھے۔“

”دل لکھنوی دوزانو ہو کر بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ وہ ہر شعر کے پہلے مصرعے کو بار بار دہراتے تھے۔ پہلے سروں میں اسے کھٹکھٹاتے تھے۔ اس کے بعد پہلے سے اونچے سروں میں سجاتے تھے پھر کان پر ہاتھ رکھ کر جب اسے تیسری بار اٹھاتے تھے تو ہارمونیم کے سارے پردوں کو پھلانگ جاتے تھے۔۔۔ جب وہ سدھی ہوئی آواز کو ذرا دھیمہ کر کے دوسرا مصرع ادا کرتے تھے تو سامعین اپنی نشستوں سے غبارے کی طرح ایک ایک فٹ اونچے اوپر اٹھ جاتے تھے۔“ 44

”چہرے“ میں ندانے کافی ہمدردانہ لہجہ اپنایا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ یہ اگلے وقتوں کے فن کاروں کا تذکرہ تھا اور ان میں سے کوئی بھی ان کا حریف نہیں تھا۔ انھوں نے اس کتاب میں کہیں کہیں طنز و مزاح سے بھی کام لیا ہے۔ انھیں جملہ سازی کا ہنر بہت زیادہ عزیز ہے۔ انھوں نے عموماً ایک معتدل، ہموار، رواں اور کہیں کہیں قافیہ آرائی سے اپنی بات کو آگے بڑھانے والا اسلوب اپنایا ہے، جو کہیں لطف دیتا ہے تو کہیں بناوٹ کا شکار نظر آتا ہے۔ ندانے اپنی کتاب ”چہرے“ میں رقم طراز ہیں:

”انور صابری صرف دیکھنے کی حد تک ہی مولیانہ تھے، ویسے طبیعت سے وہ بوہیمانہ تھے۔ ان کی شخصیت جدید و قدیم کے سنگم کی بہار تھی۔ اس میں وہ ادبی روایت بھی حصہ دار تھی جو جاگیر دارانہ عہد کی پیداوار تھی۔“ 45

”چہرے“ میں شامل شعرا کے خاندانی کوائف، معاشرتی احوال، فنی ارتقا اور ان کی نجی زندگی کی وارداتوں کی جو تفصیل نذا فاضلی نے فراہم کر دی ہے وہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ انھوں نے ان شعرا کے فکرو فن کے جائزے میں بڑی حد تک مثبت اور سلجھی ہوئی آرا کا اظہار کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس دور کے استاد شعرا کے طریق درس اور ذہنی رویوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس حوالے سے یہ اقتباس دیکھیے:

”نوح صاحب داغ کے کلام کے حافظ تھے۔۔۔۔۔ داغ کے علاوہ اور بہت سے دوسرے اساتذہ کا کلام بھی از بر تھا۔ وہ شعر گوئی کے لیے اسے ضروری سمجھتے تھے۔ بعد میں وہ خود بھی جسے شاعر بناتے تھے، اس سے استادوں کے کم از کم پانچ ہزار اشعار یاد کرنے کی مشقت کرواتے تھے۔ ان کے اس مشورے کی منطق پہلے تو سمجھ میں نہیں آتی تھی، لیکن بعد میں عمر کے ساتھ اس کی افادیت کا اندازہ ہوا۔ استادوں کے وہ شعر جو زبان و بیان سے درست، قافیہ و ردیف سے چست ہوتے تھے، جب دماغ کے خلیوں میں بس جاتے ہیں تو وہ نہ صرف شاعر کے شعر کی رہنمائی فرماتے ہیں، اسے وہ آداب بھی سکھاتے ہیں جو ادب کی تفہیم کی ضروری شرطیں ہیں۔“ 46

نذا فاضلی نے اس کتاب میں ”ناخدائے سخن۔۔۔ نوح ناروی“ کے عنوان سے ان کا خاکہ پیش کیا ہے۔ نوح ناروی ان کے والد مرتضیٰ حسن کے استاد تھے۔ ان دنوں استادی شاگردی محض ایک روایت نہیں تھی بلکہ رشتے کی عقیدت تھی۔ اس تناظر میں نذا اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”میری والدہ نے میری بڑی بہن کے لیے اپنی بڑی بہن کے مٹھلے بیٹے کا انتخاب کیا تھا۔ مگنی کی رسم کے لیے لڑکے کے ساتھ اس کی ماں گوالیار سے دہلی آئی تھیں۔ رسم کی ایک رات پہلے گفتگو کے دوران اس لڑکے نے دہلی کے کسی مشاعرے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ نوح صاحب کو پسند نہیں کیا گیا اور میں نے اور میرے ساتھیوں نے انہیں خوب ہوٹ کیا۔ ہونے والے داماد کے منہ سے اپنے استاد کی شان میں اس گستاخی پر اس وقت تو وہ خاموش رہے لیکن دوسرے دن انہوں نے

یہ کہہ کر مگنی توڑ دی کہ جو لڑکا میرے استاد کا احترام نہیں کر سکتا وہ میری بیٹی کے لیے کیسے موزوں ہو سکتا ہے۔ اس فیصلے کو نہ میری ماں کے آنسوں بدل سکے نہ لڑکے کی لگاتار معافی نے تبدیل کیا۔ وہ جیسے آئے تھے ویسے ہی چلے گئے اور دو زندگیاں قریب آتے آتے مختلف سمتوں میں مڑ گئیں۔“ 47

نوح ناروی کو بھی اپنے استاد داغ دہلوی سے ایسی ہی عقیدت تھی۔ وہ داغ کے کلام کے حافظ تھے۔ داغ نے ان کی اس خصوصیت کو دیکھ کر کہا تھا کہ ”کلام الہی کے حافظ تو بہت دیکھے تھے، آج کلام داغ کا حافظ بھی دیکھ لیا۔“ اس کے علاوہ دوسرے اساتذہ کا کلام بھی انھیں یاد تھا کیوں کہ وہ اسے شعر گوئی کے لیے لازمی مانتے تھے۔ وہ پابندی سے مقررہ وقت پر شعر کہتے تھے۔ شعر کہتے وقت وہ کرسی یا پلنگ پر بیٹھتے تھے اور حقے کی کشوں میں شعر مکمل کیا کرتے تھے۔ کبھی کسی خادم کو شعر تحریر کرنے کو کہتے تو کبھی خود شعر لکھتے تھے۔ نذا فاضلی نے نوح ناروی کی شعری خصوصیات، زبان کی سلاست اور فصاحت، ان کا ادبی قد، شعر گوئی، پڑھنے کا انداز اور ان کے مقطعوں کی اہمیت پر بڑے ہی دلکش انداز میں روشنی ڈالی ہے:

”نوح کی شاعری کا مجموعی مزاج زبان کی صنایع ہے۔ محاوروں کی رعنائی ہے اور قافیہ اور ردیف کی چوکسائی ہے۔۔۔ نوح صاحب اپنے انداز اور شعر کی ڈرامائی پیش کش کی وجہ سے مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔۔۔ نوح نے داغ کی زبان کو زیادہ سلیس اور بول چال کے قریب کیا ہے۔ ان کی شعری زبان سند کا درجہ رکھتی ہے۔ داغ نے ان کی اسی مہارت پر انہیں ”ناخدائے سخن“ کے لقب سے نوازا تھا۔“ 48

نوح ناروی کی مشاقی کا یہ عالم تھا کہ وہ شعر بھی نثر کی طرح لکھتے تھے۔ قدرت نے انھیں پیدائشی رئیس بنایا تھا۔ وہ پہلے مصرعے میں سے کبھی کبھی دوسرا مصرع بھی تراشتے تھے۔ اس ضمن میں چند ایک اشعار دیکھیے:

جگر کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے
جگر کی چوٹ اوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے

جو کچھ بھی ملا ہے ، وہ خدا ہی سے ملا ہے
جو کچھ بھی ملے گا وہ خدا ہی سے ملے گا

49

نَدَافاضلی نے نوح ناروی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بچپن سے ہی ثقلِ سماعت کے شکار تھے۔ اپنی کمزور سماعت کی وجہ سے وہ دوسروں کی سماعتوں پر شک کیا کرتے تھے۔
نَدَافاضلی نے نریش کمار شاد کا خاکہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اچھے شاعر بھی تھے اور ان کی نثر بھی رواں ہوتی تھی۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ عاشقانہ سرمستی، رندی و مے پرستی پر مشتمل ہے جس میں کبھی کبھی ان کے ہم عصر شعرا کی پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ ان کے لہجے کا بے باک کھلا پن اور چلبلا پن اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ نریش کمار شاد کے ہم عصروں میں ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری اور سلام مچھلی شہری کا شمار ہوتا ہے۔

ہندو پاک کے رسائل میں ان کے مضامین چھپتے رہتے تھے لیکن وہ اپنی تخلیقات سے زیادہ اپنی شخصیت کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ ذہانت، وراثت یا قدرت کی دین ہوتی ہے لیکن اس کو سنوارنے کے لیے جس محنت اور فراغت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی مہلت انھوں نے خود کو نہیں دی جس کا احساس انھیں خود بھی تھا۔ نریش کمار شاد شراب پینے کے عادی تھے۔ شراب نے انھیں شہرت بھی دی اور زحمت بھی دی۔ اس بارے میں نَدَافاضلی لکھتے ہیں:

”موٹر یا اسکوٹر کی مانند ان کے جسم کا انجن بھی بغیر الکوہل کے اسٹارٹ نہیں ہوتا تھا۔ شراب جو پہلے کبھی کبھی کا قصہ تھا، اب ان کی شخصیت کا لازمی حصہ تھی۔ اس شراب نے انھیں شہرت بھی دی اور زحمت بھی دی۔
شہرت اس طرح کہ ادبی گپ شپ میں ان کا نام بھی اختر شیرانی، میراجی، جگر مراد آبادی، عدم یا مجاز کی بلا نوشی کے سلسلے میں لیا جاتا تھا۔
اس کی زحمت کے ذیل میں ان کی ہڈیوں کے کئی فریکچر، فالج اور دوسری بیماریاں، ہاتھ پائیاں اور کئی ملازمتوں سے علاحدگیاں آتی

تھیں۔“ 50

صابر دت کے بارے میں نَدَافاضلی نے دو مشہور شخصیتوں (ساحر اور سنیل دت) سے

اپنا تخلص تراشا تھا۔ انھوں نے ساحر کے رومن ”H“ کو ”B“ سے بدل کر ”صابر“ بنایا تھا۔ جب کہ سنیل دت کے نام کا آخری حصہ یعنی ”دت“ کو صابر کے ساتھ جوڑ دیا تھا جس سے وہ صابر دت بن گئے۔

صابر دت کے نام سے تین شعری مجموعے ”پل دوپل“، ”موجِ عارض“ اور ”شجرِ اکیلا“ منسوب ہیں۔ ان کی شاعری میں کہیں روایت کی پاسداری نظر آتی ہے تو کہیں جدت طرازی سے بھی کام لیا ہے۔ ان کے پڑھنے کا انداز عجیب تھا۔ وہ ہر مصرعے کو بھاری آواز میں دہراتے تھے اور آخری لفظ پر سیدھی ٹانگ اٹھا کر زور سے اسٹیج پر پٹختے تھے۔ قطعات بھی اسی طرح پڑھنے کے عادی تھے۔ ایک بار کسی صاحب نے انھیں اس عمل سے روکنے کی تلقین کی تو انھیں غصہ چڑھا اور وہ خاموشی سے نیچے اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

صابر دت نے شادی نہیں کی لیکن ناکام محبتیں بہت کیں۔ ایک محبت کے جواب میں ٹوٹی ہوئی ہوائی چپل مل گئی تھی۔ ان کا کلام کئی گلوکاروں نے گایا ہے۔ ان کی نظم ”اک نجومی نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے“ کافی مقبول و مشہور ہوئی۔ نذا فاضلی نے لکھا ہے کہ اردو کا یہ غیر مسلم کردار اچانک ایک موذی مرض کا شکار ہو کر دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ صابر کا ایک قطعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

ہم جو کافر ہیں سب کی نظروں میں
سیڑھیاں مسجدوں کی چڑھتے ہیں
کون جانے تو مل ہی جائے ہمیں
آج ہم بھی نماز پڑھتے ہیں

نذا فاضلی نے کرشن ادیب کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک آوارہ مزاج انسان تھے۔ ان کی شاعری کو نڈا نے شخصی رومان اور اجتماعی ہیجان سے تعبیر کیا ہے۔ وہ ساحر لدھیانوی کی دوستی میں ترقی پسند بن تو گئے لیکن رومانی شاعری کی عاشقانہ شاخ پر ہی اپنا شعری معیار تعمیر کرتے ہیں۔ وہ ملکی تقسیم کو نہیں مانتے تھے۔ وہ بہ یک وقت دونوں ملکوں میں ایک ساتھ رہتے تھے۔ اس حوالے سے نڈا نے اپنی کتاب ”چہرے“ میں لکھا ہے:

”کرشن ادیب ان شاعروں میں تھے جو سیاست کی ملکی ولسانی تقسیم کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔ وہ اردو کے حوالے سے دونوں ملکوں کو غیر منقسم سمجھتے تھے۔ وہ بہ یک وقت دونوں ملکوں میں ایک ساتھ رہتے تھے۔ ان کا جسم ہندوستان میں رہتا تھا لیکن دماغ فیض، ابنِ انشا اور قتیل

شفائی کے پاکستان میں رہتا تھا۔ کرشن کا کلام بھی 'افکار'، 'اوراق'، 'تخلیق' اور 'سیپ' جیسے پاکستانی رسائل میں زیادہ نظر آتا ہے۔ ملکی ولسانی تقسیم کو نہ ماننے کی ضد نشے میں اکثر شدت اختیار کر لیتی تھی جس کی وجہ سے کبھی کبھی مقامی سیاسی لوگوں سے ہاتھ پائی بھی ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ امرتسر میں شراب کی محفل میں ناراض ہو کر وہ امرتسر کر اس کر کے واگھا کی سرحد پر پہنچ گیا تھا۔ جب سرحد کے محافظوں نے اسے روکنا چاہا تو وہ نشے میں چلانے لگا "آپ بکواس کرتے ہیں۔ یہ تقسیم جھوٹی ہے۔ فیض اور ساحر کی شاعری نہ تقسیم ہوئی ہے، نہ ہوگی۔ اے حمید اور کرشن چندر کے ناولوں کو سیاست نہیں بانٹ سکتی۔ بابا نانک اور بلبے شاہ ہماری سناجھی وراثت ہیں۔ یہ بٹوارہ محض سیاست ہے جو قابل ملامت ہے۔"

51

اس کتاب کے کئی شاعروں کی شہرت تو صرف ان کے دور کے مشاعروں ہی کے دم سے قائم تھی۔ سہا مجددی، اسد بھوپالی، تاباں جھانسیوی، فیاض الدین فیاض اور شمیم فرحت وغیرہ کا کلام تو ان کی زندگی میں کتابی صورت میں یکجا بھی نہیں ہو پایا تھا اور آج بھی ان میں سے کئی شاعروں کے شعری مجموعے عام طور پر دستیاب نہیں ہیں۔ ایسے میں نندا کی کتاب "چہرے" کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کی انھوں نے ان شاعروں کی شخصیت، فن اور سوانح کی تفصیلات کو سمیٹ کر اس کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔ آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اس کتاب میں جن چہروں کی تصویر کشی کی ہے ان میں چھوٹی چھوٹی باتوں میں حیرت انگیز نکتوں کی فراوانی، انسانی نفسیات کی گرہ کشائی، تقابلی اشاریے، دلچسپ مشاہدات، مزاح کی رنگینی اور چھیڑ چھاڑ وغیرہ کی چاشنی بڑے دلچسپ انداز میں ملتی ہے۔ نندا فضلی نے "چہرے" میں مشاعروں کے شاعروں کے خاکے اس طرح بیان کیے ہیں کہ جیسے ہم اپنی آنکھوں سے ان شاعروں کو دیکھ رہے ہیں۔

5. ”دنیا میرے آگے“

”دنیا میرے آگے“ نڈا فاضلی کی پانچویں اور آخری نثری تصنیف ہے جو 2008 میں معیار پہلی کیشنز دہلی سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب 160 صفحات پر مشتمل ہے۔ نڈا نے ہندی کے قارئین کے لیے ایک کتاب ”تماشا میرے آگے“ لکھی تھی جو 2006 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں ابتدائیہ کے علاوہ 31 مختصر مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر مضامین میں انھوں نے اپنے ہم عصر ادیبوں اور فن کاروں کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ اس کتاب میں شامل چند مضامین کا تعلق متفرق موضوعات سے ہے۔ نڈا فاضلی نے اس کتاب کا نام غالب کے ایک شعر سے اخذ کیا ہے۔ شعر دیکھیے:

باز پچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

”دنیا میرے آگے“ ان کی ہندی کتاب ”تماشا میرے آگے“ کا اردو ورژن ہے۔ اس کتاب میں بھی ابتدائیہ کے علاوہ 31 مضامین شامل ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کتاب کے اکتیس مضامین میں سے دو مضامین بدلے ہوئے ہیں۔ وہ اس طرح کہ ہندی اڈیشن میں شامل ایک تھے خمار بارہ بنکوی، اور ایک تھے انور صابری، کو ہٹا کر ان کی جگہ یہاں ’عصمت‘، چار حرفوں کا نام اور یادوں کا شہر (گوالیار) کو شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین کی فہرست درج ذیل ہے:

- | | |
|---|--|
| (1) دنیا میرے آگے (ابتدائیہ) | (2) زندگی حسابوں سے جی نہیں جاتی |
| (3) برباد کر دیتی ہے راہ میکدہ کی | (4) اتنا ہی سنگیت ہے جتنی تجھ میں آگ |
| (5) یہاں بول کو نہیں ملتا مول | (6) سنسار کے بازار میں سب ہیں بکاؤ |
| (7) تماشے میں چہرے پرانے پڑ جاتے ہیں | (8) زبان کے فیصلے توڑتا وہ ادیب |
| (9) زندگی کے ساتھ جھومتی گاتی ہے غزل | (10) ہم جو کھور ہے ہیں |
| (11) جوانی کی موج، آئی، اٹھی اور اتر گئی | (12) ہونے میں نہیں ہوتا ارادہ اپنا |
| (13) نظر بھر کے دیکھو اصل زندگی کے رنگ | (14) ویرانے میں ٹہلتی یادوں کی پرچھائیاں |
| (15) ایک تھے علی سردار جعفری | (16) جانے والوں کا انتظار نہیں کرتی بستیاں |
| (17) اب کہاں دوسروں کے غموں پر اداس ہونے والے | (18) ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی |

- (19) ایک تھے راجندر سنگھ بیدی
(20) ایک تھے کرشن چندر
(21) ایک تھے شکیل بدایونی
(22) خود اپنے آپ سے الجھو گے تو ٹوٹ جاؤ گے
(23) اپنے عکس میں کسی اور کی تلاش
(24) ایک تھے ویرندر مشر
(25) ایسا تھا ساہتیہ سنگم
(26) ایک تھے شمیم فرحت
(27) ایک تھے نریش کمار شاد
(28) عصمت۔ چار حرفوں کا نام
(29) یادوں کا شہر
(30) ایک تھے کرشن ادیب
(31) ترقی پسند غزل کی آواز، مجروح سلطان پوری (32) ایک تھے مکٹ بہاری سروج
- ”دنیا میرے آگے“ میں نندا فاضلی نے کچھ اپنی زندگی سے جڑے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ کچھ مضامین ایسے ہیں جو اردو شعر و ادب کی مشہور شخصیات کے بارے میں ہیں۔ انھوں نے بڑے بے باکانہ انداز میں ان شخصیات پر قلم اٹھایا ہے۔ اس کتاب کی وجہ تصنیف کے بارے میں وہ ”دنیا میرے آگے“ کے ابتدائی میں رقم طراز ہیں:

”تاریخ دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو راجاؤں اور بادشاہوں کے ہار جیت کے قصے دہراتی ہے اور دوسری وہ جو اس آدمی کے دکھ درد کا ساتھ نبھاتی ہے جو ہر دور میں سیاست کا ایندھن بنایا جاتا ہے اور جان بوجھ کر بھلایا جاتا ہے:

تاریخ میں محل بھی ہیں، حاکم بھی، تخت بھی
گم نام جو ہوئے ہیں وہ لشکر تلاش کر
میں نے ایسے ہی گم ناموں کو نام اور چہرے دینے کی کوشش کی ہے۔“

52

اگر دیکھا جائے تو اس کتاب کا زیادہ تر حصہ راہی معصوم رضا، علی سردار جعفری، عصمت چغتائی، ساحر لدھیانوی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی، نریش کمار شاد، امجد خان، کمال امر وہی، بھارت بھوشن اور آر۔ ڈی۔ برمن وغیرہ جیسی مشہور و معروف شخصیات پر مشتمل ہے۔ جب کہ گم نام اور کم مشہور اشخاص کا بہت کم تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایسے میں نندا فاضلی کا گم ناموں کو نام اور چہرہ دینے کا دعوا کچھ غلط ثابت ہوتا ہے۔

نہ افاضلی نے اس کتاب میں جن شخصیات پر مضامین لکھے ہیں۔ ان میں سے نصف میں انھوں نے خود کو دہرایا ہے کیوں کہ ان شخصیات کو انھوں نے زیادہ تفصیل سے ”دیواروں کے باہر“ اور ”چہرے“ میں پیش کیا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ متفرق موضوعات پر جو مضامین ہیں وہ نہ افاضلی کے فکر و فن کا پتا ضرور دیتے ہیں۔ ذیل میں ان کے ایک مضمون ”ہم جو کھورے ہیں“ کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے جو ان کی طبیعت کے میلان اور انداز فکر کو ظاہر کرتا ہے:

”مجھے بچے، پھول اور چڑیاں بہت پسند ہیں۔ میں نے کسی سیریل کے لیے ایک گیت لکھا تھا، اس کا مکھڑا تھا:

چھوٹی چھوٹی خوشیاں
چلتی رکتی راہ میں جیسے
بچے، پھول اور چڑیاں

آج کی دنیا میں جب کہ ہر چیز میں کھوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ انسان میں حیوان شامل ہو گیا ہے۔ پاکیزہ ندیاں میلی ہوتی جا رہی ہیں۔ محبت میں نفرت اور سیاست میں وحشت جڑتی جا رہی ہے۔ اگر کہیں تھوڑی سی اصلیت نظر آتی ہے تو وہ بچوں کی مسکراہٹ ہے۔ پھولوں کی کھلکھلاہٹ ہے۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ ہے۔ ان تینوں کی آپسی دوستی بھی بہت ہے۔“ 53

فضل تابش کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ وہ جدید ترقی پسند شاعر تھے۔ بات بات پر گونجتے قہقہوں کی اڑان ان کی پہچان ہے۔ اپنے ہم عمروں میں ان کے پاس سب سے زیادہ ہنسی کا خزانہ تھا جسے وہ جی کھول کر خرچ کرتے تھے۔ لگا تار ہنسنے سے ان کے چہرے کی شادمانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ نہ افاضلی نے ان کا ایک شعر نقل کیا ہے:

نہ کر شمار ہر شے گنی نہیں جاتی
یہ زندگی ہے حسابوں سے جی نہیں جاتی

بات بات پر ہنسنے والے فضل تابش ایک ناراض ذہن کے فن کار تھے۔ ان کی ناراضگی سیاست، مذہبی بھید بھاؤ اور انسان کے ہاتھوں انسانی شہادت سے تھی۔ ان کی شاعری نیکی اور بدی کی لڑائی میں عملی

ساجھے داری کی فن کاری تھی۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ کہانیاں بھی لکھیں، ڈرامے بھی لکھے، ناول بھی لکھے اور فلموں میں اداکاری بھی کی۔ ندافاضلی ان کی موت پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وہ (فضل تابش) بھوپال کی تہذیب، اس کی قدروں کا معیار تھے۔

یاروں کے یار تھے، محفل میں بڑے میخوار تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا

آخری تہقہہ اپنے گھر شیش محل کے ایک باہر والے کمرے میں اپنے

دوستوں کی سنگت میں لگایا تھا۔ اس رات وہ اتنا ہنسے کہ دوسرے دن

کے لیے ان کے پاس ہسنے کو کوئی تہقہہ نہیں بچا تھا۔ اس لیے وہ ہمیشہ کے

لیے خاموش ہو گئے۔“ 54

فضل تابش کے ساتھ وہ بھوپال ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا جو ایک خاص تہذیب، شاعری، شیر وانیوں اور پان کی دکانوں سے جانا اور پہچانا جاتا تھا۔

اسد بھوپالی (1921-1990) کے بارے میں ندافاضلی نے اپنی کتاب ”دنیا میرے آگے“ میں

لکھا ہے کہ انھوں نے ادبی شوق کی ابتدا بیت بازی سے کی۔ ان کی آواز میٹھی تھی۔ وہ بیت بازی کے مقابلوں

میں ترنم سے دوسروں کے شعر سناتے تھے اور ہر بار کامیاب ہو جاتے تھے۔ اسی میٹھی آواز نے انھیں

مشاعروں کا کامیاب شاعر بنادیا۔ اسی آواز سے وہ فلم انڈسٹری کے بند دروازوں کو کھولنے میں بھی سرخ رو

ہو گئے۔ انھوں نے متعدد گیت بھی لکھے۔ ان کے مشہور گیتوں میں ”ہنستا ہوا نورانی چہرہ“ سے ”کبو تر جا جا“

تک بہت سارے گیت کامیابی سے ہم کنار ہو گئے۔ ان کی غزل اور مترنم ادائیگی کو سامعین نے بہت پسند

کیا۔ بمبئی پہنچے تو انھیں شہرت بھی ملی اور مصیبت سے دوچار بھی ہونا پڑا۔ اس حوالے سے ندا لکھتے ہیں:

”بمبئی نے انھیں (اسد بھوپالی) شہرت بھی دی اور مصیبت بھی۔ انھیں

شہرت ملی اچھے گیتوں کے سبب اور مصیبت شراب سے ان کی دن بہ دن

بڑھتی چاہت کی وجہ سے۔ انھوں نے خوب کمایا لیکن اس کمائی کا بڑا

حصہ شراب و شباب پر لٹایا۔“ 55

فلمی دنیا نے جہاں انھیں بلند مقام عطا کیا وہیں شراب و شباب ان کی زندگی کے ناسور بن گئے

تھے۔ زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی بکھری بکھری رہی۔ اسی وجہ سے ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔ ان

کا ایک شعر ہے:

اسد کو تم نہیں پہچانتے تعجب ہے
اسے تو شہر کا ہر شخص جانتا ہوگا

محروح سلطان پوری کے بارے میں نذافاضلی نے لکھا ہے کہ وہ ترقی پسند غزل کی نئی اور معیاری آواز کا نام ہے۔ ان کی غزل نے سماج اور اس کے مسائل سے جڑ کر اس صنف کو نیا رنگ دیا ہے۔

نذافاضلی نے اس کتاب میں متفرق موضوعات پر جو مضامین لکھے ہیں وہ کافی دل چسپ ہیں۔ اپنے مضمون ”یہاں بول کو مول نہیں ملتا“ میں انھوں نے لکھا ہے کہ آج الفاظ کا بھاؤ بازار میں کم کیوں ہے؟ یہ مسئلہ اخلاقی کم اور سیاسی زیادہ بنا دیا گیا ہے۔ بازار میں کرکٹ، اداکاری، سیاست اور آواز کو بلندی پر بٹھا دیا گیا ہے۔ الفاظ کی اہمیت کو گھٹا دیا گیا ہے۔ فلموں میں الفاظ دینے والوں کو بے کاری کی چیز سمجھا جاتا ہے۔

میڈیا نے الفاظ اور قواعد کو برباد کر دیا ہے۔ میڈیا کے ساتھ الفاظ کو خراب کرنے میں لیڈروں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے الفاظ کو ان کے معنوں سے الگ کر دیا ہے۔ پارلیمنٹ میں تقریر کے دوران شعر سنائے جاتے ہیں جن کو وزن سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ غلط مصرعوں پر دوسرے ممبران تالیاں بجاتے ہیں۔ اسی طرح فلموں کی بات کی جائے تو گیت کاروں کا انتخاب ان کی صلاحیت پر نہیں بلکہ ڈائریکٹر کی پسندنا پسند پر کیا جاتا ہے جو خود زبان سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اسی مضمون میں نذافاضلی آگے لکھتے ہیں:

”فلموں سے باہر کی دنیا میں بھی شاعروں کا یہی حال ہے۔ جو غزل یا گیت کو اپنے تجربوں کی آگ سے جگمگاتے ہیں وہ جوتیاں چٹاتے ہیں اور جو اپنی اپنی آواز میں انھیں گاتے ہیں وہ انہیں گیتوں اور غزلوں کے سہارے ساری دنیا کی سیر فرماتے ہیں۔ شان سے اپنی پہلی سٹی کرواتے ہیں اور بازار سے جو کماتے ہیں اس میں سے بڑی بڑی کوٹھیاں بنواتے ہیں۔ قیمتی شراہیں چڑھاتے ہیں، امپورٹڈ کاریں چلاتے ہیں۔“ 56

غزل کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے نذافاضلی لکھتے ہیں کہ غزل ایک محبوب صنف ہے جو 750-700 سال کی بوڑھی ہونے کے باوجود جوان ہاتھ پیروں اور چمکتے دکتے بدن کے ساتھ ہر جگہ گھومتی جھومتی نظر آتی ہے۔ غزل ہر سیمہ اور ہر سرحد سے آزاد ہے۔ یہ ایک سیکولر صنف سخن ہے۔ غزل کی تاریخ ان معنوی قدروں کی تاریخ ہے جو ہر عہد میں انسانیت کا یقین ہے۔ دھرتی بھلے ہی مندر، مسجد، چرچ اور گردواروں میں تقسیم ہو لیکن غزل میں یہ ساری تقسیم تنظیم کا روپ لے لیتی ہے۔ غزل میں مذہبی سختی کی جگہ

صوفیانہ نرمی ہوتی ہے۔ یہ بھید بھاؤ کی جگہ بھائی چارہ سکھاتی ہے۔ نداء کے مطابق غزل کی تاریخ بہت لمبی چوڑی ہے۔ اس میں کئی ملکوں کی تہذیب شامل ہے۔ اس میں کئی صدیوں کا پھیلاؤ ہے۔ اس پھیلاؤ کو نداء فاضلی نے سمیٹنے کی کوشش اس طرح کی ہے:

”غزل عرب کے میدان میں اٹھلائی، ایران کے باغوں میں لہرائی اور وہاں سے چل کر جب گنگا اور ہمالہ کے دیس آئی تو اس کا حسن کچھ ایسا تھا جس کے ماتھے پر زرتشت کا نور تھا، دل میں گیتا تھی، ہاتھوں میں قرآن تھا اور اس کا نام سیکولر ہندستان تھا۔ غزل کے اس ابتدائی روپ کے پہلے ناظر صوفی نظام الدین کی درگاہ میں امیر خسرو تھے۔“ 57

نداء فاضلی نے اس کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ذوق کے مشہور شعر:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

کے عوض غالب انھیں اپنا دیوان دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اس ضمن میں ”دنیا میرے آگے“ کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

”غالب کے ہم عصر اور آخری مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر کے استاد ذوق کا ایک مشہور شعر ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

کہا جاتا ہے کہ غالب اور ذوق کی کبھی پٹتی نہیں تھی، لیکن اس شعر کو سن کر وہ کہنے پر مجبور ہو گئے اگر ذوق کا یہ شعر میرے کھاتے میں آجائے تو میں اپنا پورا دیوان انہیں دینے کو تیار ہوں۔ مگر غالب خوش قسمت تھے وہ نظام الدین میں واقع اپنی قبر میں دو ڈھائی سو سالوں سے اکیلے گہری نیند سو رہے ہیں۔“ 58

نداء فاضلی نے درج بالا اقتباس میں جو دعوا کیا ہے کہ ذوق کے شعر کے بدلے میں غالب اپنا پورا دیوان دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے، کچھ مناسب نہیں لگتا۔ کیوں کہ یہ دعوا مومن خان مومن کے شعر:

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

پر کیا جاتا ہے کہ ان کے اس شعر کے بدلے غالب اپنا پورا دیوان دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون سا دعویٰ صحیح ہے اور کون سا غلط؟ یہ بات تحقیق طلب ہے۔ اس اقتباس میں نذا فاضلی نے غالب کے انتقال کو ہوئے دو ڈھائی سو سال بتایا ہے۔ جو کسی بھی زاویے سے ٹھیک نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ کتاب 2008 میں منظر عام پر آئی تھی اور اس وقت غالب کے انتقال کو 139 سال ہو گئے تھے۔ یقیناً یہاں نذا فاضلی سے بڑا سہو ہو گیا ہے۔

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نذا فاضلی نے اپنی کتاب ”دنیا میرے آگے“ میں اپنے مخصوص انداز میں اپنے ہم عصر بزرگوں اور دوستوں کو ان کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ نہایت بیباکی سے بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جانے پہچانے فن کاروں کا ذکر اور نذا کے افسانوی انداز نے اس کتاب کو دل چسپ ہی نہیں یادگار بھی بنا دیا ہے۔

﴿تراجم﴾

ترجمہ کا نام ذہن میں آتے ہی ایک زبان سے دوسری زبان میں متن و مفہوم کی منتقلی کا منظر سامنے آجاتا ہے۔ تاہم اس منظر کے پیچھے ایک دشوار گزار عمل ہوتا ہے جس میں مترجم کو بڑی احتیاط سے راستہ طے کرنا ہوتا ہے۔ ترجمہ کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک تخصیصی نوعیت کا کام ہے۔ یہ نگینہ جڑنے کا فن ہے جو بڑی ریاضت اور مہارت چاہتا ہے۔ ایک زبان کے معانی اور مطالب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنا کہ اصل عبارت کی خوبی اور مطلب جوں کا توں باقی رہے۔ دونوں زبانوں پر یکساں قدرت کی ضرورت ہوتی ہے جو عام طور پر کم یاب ہوتی ہے۔

ترجمہ بنیادی طور پر انسانی سماج کی ایک لسانی اور علمی ضرورت ہے۔ بولیاں اور زبانیں اظہار خیال کا ذریعہ ہوتی ہیں اور رسم الخط اس کا مربوط اور منظم وسیلہ ہوتا ہے۔ مختلف زبانوں کے بولنے، سمجھنے والے دو افراد یا دو گروہوں میں تبادلہ خیال کا واحد ذریعہ ترجمہ ہی ہے۔ ترجمہ رواں اور عام فہم ہونا چاہیے تاکہ اظہار خیال اور تبادلہ خیالات کا اصل مقصد حاصل ہو۔ اس فعل کے لیے ضروری ہے کہ مترجم دونوں زبانوں پر عبور رکھتا ہو۔ پروفیسر ظہور الدین اپنی کتاب ”فن ترجمہ نگاری“ میں لکھتے ہیں:

”ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس کی وساطت سے کسی ایک زبان کے فن پارے کو دوسری زبان میں منتقل کر کے اس زبان کے قارئین کو اس تک پہنچنے کے موقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ اسے ایک ایسی کھڑکی قرار دیا جا سکتا ہے جس کے کھل جانے سے ایک ایسی دنیا کے دروازے ہم پر وا ہوتے ہیں جس سے ہم اس سے قبل بالکل واقف نہیں ہوتے۔ اس سے ہم نہ صرف متعلقہ فن پارے کی لسانی خصوصیات سے مستفید ہوتے ہیں بلکہ جس تمدن، قوم اور ملک کی وہ پیداوار ہوتا ہے، اس تک بھی پہنچتے

ہیں۔“ 59

اس بات سے ہم سب بہ خوبی واقف ہیں کہ ترجمہ نگار دونوں زبانوں سے واقف ہو۔ جس تحریر کا ترجمہ کرنا مقصود ہے اور جس زبان میں اسے ترجمہ کرنا ہے، ان دونوں سے جب تک ایک مترجم پوری طرح سے واقف نہیں ہوگا، ترجمے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک انداز فاضلی کی بات ہے، وہ اس فن میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انگریزی ادب سے ان کو ایک خاص انسیت تھی۔ انھوں نے جاپانی، روسی، پرتگالی، چینی، اٹلی، پولش اور مشرقی افریقہ کے شاعروں کی نظموں کا

ترجمہ کیا ہے۔ نظموں کا ترجمہ کرنے سے پہلے نڈانے ان شاعروں کا مختصر تعارف بھی پیش کیا ہے۔
جاپانی شاعر یوشی ساوگوزا کا تعارف پیش کرتے ہوئے نڈا لکھتے ہیں کہ وہ جاپان کے نئے شاعر
ہیں۔ ان کی پیدائش 1931 میں ٹوکیو میں ہوئی۔ یوشی کئی شعری مجموعوں اور نثری کتابوں کے خالق ہیں۔
”گھائل روح“ اور ”کانٹے دار سورج“ ان کے ایسے شعری مجموعے ہیں جن میں احتجاج کی لے موجود
ہے۔ ان کی شاعری سیاسی و سماجی جبر کے خلاف آواز بلند کرتی دکھائی دیتی ہے۔ نڈانے ان کی کئی نظموں کا
ترجمہ کیا ہے۔ چند مثال ملاحظہ فرمائیں:

”آج کی رات“

آج کی رات
میں کسی عمارت ساز کی طرح سوچ رہا ہوں
یہ ستارے
اور روشنی کی لکیریں
رات کے آسمانوں کے لیے موزوں ہیں
لفظوں کی تلاش
سونے کو سونے سے مٹانے کی آرزو
جھوٹ کو جھوٹ کے قریب لینے کی جستجو
میرے دوست
میں اپنی ہی آگ میں
دھیمے دھیمے جل رہا ہوں
میں خوابوں کی فکر میں محو
ایک منور لاش جھاڑیوں میں
میں غم زدہ ہوں نہیں معلوم
میرے چاروں طرف آگ
ایک تازہ کٹا ہوا سر رات کے آسمانوں کو الوداع کہہ رہا ہے
وقت کا دریا بہہ رہا ہے 60

اس نظم کے علاوہ نڈا فاضلی نے یوشی ساوگوزو کی نظم کا ترجمہ ”خواہش“ کے نام سے کیا ہے۔

”خواہش“

سنہری تلوار کا رخ سورج کی طرف ہے
 ٹھہرے ہوئے ستارے کے آئینے میں
 سیبوں کی فصل جھلکتی ہے
 ایشیا کے علاقے میں
 پر شور ہوائیں چلنے لگیں
 روح ایک پہیہ کی طرح بادلوں میں گھوم رہی ہے
 میری خواہش ہے
 آنکھوں کی پینائی کھو کر سورج بنوں، سیب بنوں
 لیکن بالکل ان جیسا نہیں۔۔۔ 61

سپردی دمونو کا شمار انڈونیشیا کے جدید شعرا میں ہوتا ہے۔ چار شعری مجموعوں کے علاوہ کئی تنقیدی کتابیں اور کئی کتابوں کے ترجمے بھی ان کے نام سے منسوب ہیں۔ جن میں ہمنگ وے کا ناول Old Man and the Sea بھی شامل ہے۔ نئے نئے تجربات اور مشاہدات پر ان کی بے شمار مختصر نظمیں ہیں۔ نڈافاضلی نے انڈونیشیا کے شاعر سپردی دمونو کی چند نظموں کے ترجمے کیے ہیں جن میں سے یہاں چند اقتباسات پیش خدمت ہیں:

ایک کمرہ میں ہم تین
 میں چاقو اور لفظ
 چاقو اس وقت چاقو ہوتا ہے
 جب اس کے لوہے پر کسی کا خون روتا ہے
 وہ چاہے میرا خون ہو
 یا لفظ کا 62

ایک اور نظم کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:
 مغرب کی سمت چلتے ہوئے
 صبح مغرب کی سمت چلتے ہوئے
 میں نے دیکھا

وہی گیس کا غبارہ ہے
جو تمہارے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا
جب تم بچے تھے 63

ندا فاضلی کے یہ ترجمے مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ انھوں نے ٹوم جانشن کی نظموں کے ترجمے سے پہلے ان کا تعارف بھی پیش کیا ہے۔ ٹوم جانشن کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ وہ امریکہ کے ایک ممتاز جدید شاعر ہیں۔ انھوں نے وکالت کو ذریعہ معاش بنایا لیکن چند برسوں بعد اس پیشے کو چھوڑ کر ادب سے وابستہ ہو گئے۔ تین شعری مجموعے ان سے منسوب ہیں۔ ندا نے ان کی چند نظموں کے ترجمے کیے ہیں جن میں انھوں نے وہی فضا پیدا کرنے کی سعی کی ہے جو ٹوم جانشن کی شاعری میں پائی جاتی ہے:

”انتظار“

جیسے درختوں کے پتے
بارش کی رم جھم میں تالیاں بجانے کا انتظار کرتے ہیں
یوں ہی جاگے ہوئے راستے
لا معلوم پیش بینی میں
کسی کی روشنی کے جگمگانے کا انتظار کرتے ہیں
نخ زدہ ہواؤں میں
تھوڑی سی حرارت کے لیے 64

ندا فاضلی نے ”عالمی شاعری“ کے نام سے ایک مضمون لکھا جس میں انھوں نے پرتگالی شاعر فرنانڈو پیسوا کی شخصیت اور نظموں کو زیر بحث لایا ہے۔ پیسوا کے بارے میں انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ایک شاعر، مترجم، ناقد اور نثر نگار تھے۔ وہ کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ ان کا تخلیقی ذہن بہت زرخیز تھا۔ وہ بہ یک وقت کئی ناموں سے کئی اسالیب میں لکھتے تھے۔ ان کے تخلیق کردہ ان ہم زادوں میں ابرکو، ریکارڈ اور اکو میر زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے یہ ہم زاد نہ صرف انداز اور کردار کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی فکری اور اسلوبی شناخت بھی نمایاں ہے۔ ندا نے اس مضمون میں پیسوا کا ایک قول نقل کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

”شیکسپیر نے ایک ہیملٹ تخلیق کیا تھا، میں نے بہت سے ہیملٹ

گڑھے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میرے کردار کسی ڈرامے کا حصہ
نہیں ہیں، ان کا اسٹیج میری شخصیت ہے، ان کی اداکاریاں میری فکری

جہات ہیں۔“ 65

پیسوا کی شاعری کے کئی چہرے اور کئی جہات ہیں۔ وہ کہیں فلسفی نظر آتا ہے، کہیں صوفی، کہیں ناستک
اور کہیں فطرت میں حیرت و استعجاب کو آشکار کرتا ہے۔ ان کی پیکر تراشی، استعارہ سازی اور بلند پروازی نے
ان کی شاعری کو ادبی دنیا کا نگار خانہ بنا دیا ہے۔ اندافاضلی نے ان کی کئی نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ نظم ملاحظہ
فرمائیں:

بے شمار زندگیوں کا مجموعہ

میری زندگی ہے!

پتہ نہیں میں جب سوچتا ہوں

تو کون مجھ میں سوچتا ہے

جب میں کچھ محسوس کرتا ہوں تو کون مجھ میں جھانکتا ہے

میں گویا ایک مقام ہوں

جہاں اشیاء خیالوں میں ڈھلتی ہیں

جہاں فکریں

نئے نئے روپ بدلتی ہیں

میرے اندر ایک نہیں

بہت سی روحیں ہیں

میرا تن ایک ہے

لیکن اس کی کئی سمتیں ہیں

کئی تہیں ہیں

ان مختلف رویوں کی بھیڑ میں

میں کہاں ہوں

لیکن میں جہاں ہوں

اپنے ہی ساتھ ہوں

اپنا قلم ہوں

اپنی بات ہوں 66

نڈافاضلی نے روم کے شاعر اپولونیر کی نظموں کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی زندگی کا زیادہ تر حصہ پہلی عالمی جنگ میں ہیبت ناک مورچوں پر گزرا۔ ان کے ذہن کی اختراعی صلاحیت اور تکنیکی انفرادیت فرانس کے ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔ Calligrammes اور Alcools ان کے شعری مجموعے ہیں۔ وہ اپنے ڈھنگ، تیور اور روپ سے شہری بناوٹ اور میکانیکی تہذیب کے کھوکھلے پن پر طنز کرتے ہیں۔

اپولونیر دنیا کو نڈر آنکھوں سے دیکھنے کے عادی تھے۔ خیالات ان کے ذہن میں آکر تصویر کا روپ دھار لیتے تھے۔ Calligrammes کی بیشتر نظمیں انھوں نے میدانِ جنگ سے پوسٹ کارڈ پر لکھ لکھ کر اپنے دوستوں کو بھیجی تھیں۔ انھوں نے یہ نظمیں تصویری فارم میں لکھی ہیں۔ برستے پانی کی دھاریں، دل اور تاج، دھواں چھوڑتا سگار، نیک ٹائی، فوارے سے چھوٹا پانی، رات کا آسمان وغیرہ ان کی اچھی نظموں کے علاوہ خوب صورت آرٹ کے نمونے بھی ہیں۔ نڈافاضلی نے اپولونیر کی تصویری نظموں کا ترجمہ کر کے اس فن میں بھی اپنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔

It's Raining

"It is raining women's voices as if they were dead even in memory, You also are raining down marvelous encounters of my life O little drops and these rearing clouds are beginning to whinny a whole world of auricular towns. Listen to it rain while regret and disdain weep an old fashioned music. Listen to the fall of all the perpendiculars of your existence."

نڈافاضلی نے اس نظم کا ترجمہ یوں کیا ہے:

”میرے کانوں میں ان عورتوں کی آوازیں برس رہی ہیں جواب
یادداشت سے بھی محو ہو چکی ہیں۔ بارش کے ننھے قطرو! تمہارے اندر
میری زندگی کی خوب صورت وارداتیں جھلک رہی ہیں۔ اڑتے بادلوں
نے میری سماعت کی اونگھتی بستیوں کو گنجا دیا ہے۔ برستی ہوئی برسات
سن، اس سے پہلے کہ ناکامی و مایوسی روایتی سنگیت کی دھاروں میں
برسنے لگے، اپنے وجود کے نیچے گرتی متوازی لکیروں کی آواز سن۔“

67

نذافاضلی نے ”دوسری عالمی جنگ کے بعد پولش شاعری“ کے نام سے ایک مضمون لکھا ہے۔ جس
میں انھوں نے بوگ ڈان چیکوسکی، ٹیڈ یوز روز وکس، الیکزینڈر رواٹ اور لیو پولڈ اسٹاف کی نظموں کا ترجمہ کیا
ہے۔ چیکوسکی پولش زبان کے اہم جدید شاعر ہیں۔ بچپن میں خاندان کے ساتھ جلا وطن ہوئے، چند برس
ایران اور کچھ عرصہ افریقہ میں پناہ گزینی کے عذاب جھیل کر لندن منتقل ہو گئے۔ موضوعات کے انتخاب اور
شعری زبان کی تراش خراش میں وہ انگریزی ادب سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ ان کی ایک نظم کا ترجمہ
نذافاضلی نے یوں کیا ہے:

میں جہاں پیدا ہوا ہوں
وہ میرا انتخاب نہیں ہے
میں گھاس میں کیوں نہیں پیدا ہوا
جو ریگستان کے علاوہ
ہر جگہ نظر آتی ہے
میں ہواؤں میں ہوا بن کر بھی پیدا ہو سکتا تھا
مگر یہ نہیں ہوا
بچپن سے ہی میں زنجیروں میں ہوں
انہیں زنجیروں کے ساتھ
میں اپنی تقدیر میں ہوں
میں جہاں ہوں
وہ میرا انتخاب نہیں

میں سمندر کی لہر کی صورت میں بھی تو پیدا ہو سکتا تھا۔۔۔

میں شاعر ہوں

میں اپنے لفظوں کا اسیر ہوں

میں ایک چلتی پھرتی زنجیر ہوں

مجھ کو پیدا ہی ہونا تھا

تو گھاس میں گھاس بن کر کیوں نہیں پیدا ہوا 68

اسی مضمون میں نندا فاضلی نے آگے روز و کس، الیکزینڈرواٹ اور لیو پولڈ اسٹاف کی نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ روز و کس کی شاعری آگ، بارود اور انسانی خون کی بے حرمتی کی تصاویر کا البم ہے۔ روز و کس شاعر ہونے کے علاوہ نقاد اور ڈرامہ نگار بھی ہیں۔

الیکزینڈرواٹ کا شمار پولش زبان کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ واٹ کی آخری دور کی شاعری ان کی ابتدائی شاعری کی طرح صرف تجربہ برائے تجربہ نہیں ہے۔ اس میں فکری وسعت، جدید حسیت اور اعتدالی حرارت بھی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری قارئین سے قربت کا احساس بھی دلاتی ہے۔

لیو پولڈ اسٹاف متحرک ذہن کے انسان تھے۔ وہ وقت کے ساتھ نہ صرف خود بدلتے رہے بلکہ ہر دور کے جوانوں کے بدلتے اقدار کو بھی لبیک کہتے رہے۔ ان کی شاعری میں لفظ اور موضوع ہر تخلیق کے ساتھ رنگ روپ بدلتے نظر آتے ہیں۔ ان کے منظوم تراجم جوانھوں نے اطالوی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں سے پولش میں کیے ہیں۔ ان کی وجہ سے شعر فہمی کا نیا منظر نامہ ترتیب ہوتا ہے۔ نندا فاضلی نے ان کی ایک نظم کا ترجمہ کیا ہے جو درج ذیل ہے:

”تین چھوٹی بے نام بستیاں“

اتنی چھوٹی

کہ تینوں مل کر ایک بھی بن سکتی تھیں

نقشہ میں نہیں ہے ان کی کوئی پہچان

خاموش

امن پسند افراد کی یہ بستیاں

جنگ میں ہو چکی ہیں بے نشان

بے خبر، بے فکر دوستو

تم ان بستیوں کا خیال کیوں نہیں کرتے

وہ ذہنی طور پر کتنے مفلس ہوتے ہیں

جو کبھی کوئی سوال نہیں کرتے 69

نذافاضلی نے ”مشرقی افریقہ کی جدید شاعری“ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں انھوں نے مشرقی افریقہ کے بہت سے شاعروں کی نظموں کا ترجمہ کیا ہے جن میں کلف لبوا، جوزف کیری، لیونگ، جون ایس میٹی، امین قاسم، یوسف قاسم، ہنری مارلو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح روس کے ایک ممتاز شاعر یوتوشینکو کی شاعری کو بھی زیر بحث لا کر ان کی نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ اٹلی کے ممتاز جدید شاعر اینٹونیو پورٹا کی نظموں کا ترجمہ کرنے کے علاوہ لاطینی امریکہ کے نوبل انعام یافتہ شاعر آکٹیو پاز کی نظموں کا ترجمہ بھی بہ خوبی انجام دیا ہے۔

ترجمے کا فن ایک مشکل فن ہوتا ہے۔ شاعری کا ترجمہ کرنا تو اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لیے مطالعہ کافی وسیع ہونا چاہیے۔ چوں کہ نذافاضلی کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اس لیے وہ اس مشکل فن میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے مذکورہ بالا شاعروں کی نظموں کا ترجمہ بڑی مہارت سے کیا ہے۔ ان ترجموں میں انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ ان میں اصل زبان کی چاشنی برقرار رہے۔ نذافاضلی کے اس پہلو پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔

حواشی:

- 1۔ نَدَافِ ضَلٰی کی دیگر معروف و مقبول نثری تصانیف اور دیواروں کے بیچ، سلام بن رزاق، نیا دور، ص: 37
- 2۔ نَدَافِ ضَلٰی، اسیم کاویانی، ص: 56/57
- 3۔ ملاقاتیں، نَدَافِ ضَلٰی، ص: 26
- 4۔ ایضاً، ص: 14
- 5۔ ایضاً، ص: 38/39
- 6۔ ایضاً، ص: 55/56
- 7۔ ایضاً، ص: 75
- 8۔ ایضاً، ص: 117
- 9۔ ایضاً، ص: 121
- 10۔ ایضاً، ص: 90/91
- 11۔ ایضاً، ص: 135
- 12۔ اپنے عہد کا ایک درویش صفت اور قلندرانہ مزاج شاعر: نَدَافِ ضَلٰی، حسن کاظمی، نیا دور، ص: 56
- 13۔ ملاقاتیں، نَدَافِ ضَلٰی، ص: 106
- 14۔ دیواروں کے بیچ۔۔۔ ایک تجزیہ، پروفیسر علی احمد فاطمی، مشمولہ اعتراف، ص: 260
- 15۔ دیواروں کے بیچ، نَدَافِ ضَلٰی، ص: 7
- 16۔ دیواروں کے بیچ۔۔۔ ایک تجزیہ، پروفیسر علی احمد فاطمی، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 141
- 17۔ دیواروں کے بیچ، نَدَافِ ضَلٰی، ص: 106
- 18۔ ایضاً، ص: 94
- 19۔ ایضاً، ص: 127
- 20۔ ایضاً، ص: 116
- 21۔ نَدَافِ ضَلٰی کی دیگر معروف و مقبول نثری تصانیف اور دیواروں کے بیچ، سلام بن رزاق، نیا دور، ص: 38
- 22۔ دیواروں کے بیچ، نَدَافِ ضَلٰی، ص: 130

- 23 ایضاً، ص: 52
- 24 دیواروں کے بیچ۔۔۔۔ ایک جائزہ، سلام بن رزاق، مشمولہ نڈافاضلی، مرتب پروفیسر علی احمد فاطمی، ص: 49
- 25 دیواروں کے باہر، نڈافاضلی، فلیپ
- 26 دیواروں کے باہر، نڈافاضلی، ص: 12
- 27 دیواروں کے باہر: ایک مطالعہ، حنا فردوس، کتاب نما، ص: 51
- 28 دیواروں سے باہر۔۔۔ خودنوشت سوانح، نامی انصاری، مشمولہ اعتراف، ص: 250
- 29 دیواروں کے باہر، نڈافاضلی، ص: 8
- 30 ایضاً، ص: 67
- 31 ایضاً، ص: 102
- 32 ایضاً، ص: 67
- 33 دیواروں کے بیچ، نڈافاضلی، ص: 136
- 34 دیواروں کے باہر، نڈافاضلی، ص: 171
- 35 ایضاً، ص: 118
- 36 ایضاً، ص: 150
- 37 ایضاً، ص: 194
- 38 ایضاً، ص: 203
- 39 ایضاً، ص: 197
- 40 ایضاً، ص: 197/198
- 41 نڈافاضلی اور ہندستانی مشترکہ تہذیب، وسیم بیگم، سہ ماہی فکر و تحقیق، ص: 77
- 42 چہرے۔۔۔ ایک قد آدم آئینہ، زبیر رضوی، سہ ماہی اردو، ص: 104
- 43 چہرے، نڈافاضلی، ص: 156
- 44 چہرے۔۔۔ ایک قد آدم آئینہ، زبیر رضوی، مشمولہ نڈافاضلی، مرتب پروفیسر علی احمد فاطمی، ص: 21/22

- 45 چہرے، ندافاضلی، ص: 58
- 46 ایضاً، ص: 10
- 47 ایضاً، ص: 9/10
- 48 ایضاً، ص: 12/13
- 49 ایضاً، ص: 14
- 50 نریش کمارشاد، ندافاضلی، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 250
- 51 چہرے، ندافاضلی، ص: 177
- 52 دنیا میرے آگے، ندافاضلی، ص: 10
- 53 ایضاً، ص: 54
- 54 ایضاً، ص: 15
- 55 ایضاً، ص: 20
- 56 ایضاً، ص: 30
- 57 ایضاً، ص: 52
- 58 ایضاً، ص: 28
- 59 فن ترجمہ نگاری، پروفیسر ظہور الدین، ص: 9
- 60 ندافاضلی کا تخلیقی سفر، سیفی سرونجی، ص: 161/162
- 61 ایضاً، ص: 163
- 62 ایضاً، ص: 166
- 63 ایضاً، ص: 166
- 64 ایضاً، ص: 167
- 65 عالمی شاعری، ندافاضلی، مشمولہ اعتراف، ص: 425
- 66 ایضاً، ص: 426
- 67 اپولو نیئر کی تصویری نظمیں، ندافاضلی، شاعر، ص: 58

68 دوسری عالمی جنگ کے بعد پولش شاعری، ہدافاضلی، مضمولہ اعتراف، ص: 432

69 ایضاً، ص: 438

باب سوم:

ندافاضلی کی شاعری کا فکری و فنی مطالعہ

﴿ندافاضلی کی غزلیں﴾

﴿ندافاضلی کی نظمیں﴾

﴿اردو دوہے کی روایت﴾

﴿ندافاضلی کے دوہے﴾

﴿نَدَا فاضلی کی غزلیں﴾

نَدافاضلی جدید اردو شاعری کا ایک معتبر نام ہے۔ انھوں نے نظم و نثر دونوں میں اپنے قلم کی سیاہی صرف کر دی۔ اس کے علاوہ انھوں نے فن ترجمہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔ اردو شاعری میں ان کے قلم سے سات مجموعے تحریر ہوئے جب کہ اردو نثر میں ان کی پانچ کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ہندی میں بھی ان کی کئی کتابیں منصہ شہود پر آچکی ہیں۔ نَدافاضلی کے شعری مجموعوں کی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے:

1. لفظوں کا پُل

2. مورناچ

3. آنکھ اور خواب کے درمیان

4. کھویا ہوا سا کچھ

5. شہر میرے ساتھ چل

6. زندگی کی طرف

7. سب کا ہے ماہتاب

1. ”لفظوں کا پُل“

”لفظوں کا پُل“ نَدافاضلی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت 1969 میں ہوئی۔ اس مجموعے کو معیار پبلی کیشنز، دہلی نے منظر عام پر لایا۔ یہ مجموعہ 127 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کا پیش لفظ نَدافاضلی نے ”حرفِ اول“ کے نام سے لکھا ہے۔ یہ مجموعہ انھوں نے ماریہ، نادیہ اور دیدہ ور کے نام منسوب کیا ہے۔ یہ شعری مجموعہ غزلوں، نظموں اور گیتوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں غزلوں کی تعداد 11، نظموں کی تعداد 67 اور گیتوں کی تعداد 9 ہے۔ اس مجموعے میں کوئی بھی دوہا موجود نہیں ہے۔ نَدافاضلی نے اس مجموعے کے آغاز میں دو اشعار درج کیے ہیں جو اس طرح ہیں:

نئی نئی پوشاک بدل کر موسم آتے جاتے ہیں

پھول کہاں جاتے ہیں جب بھی جاتے ہیں لوٹ آتے ہیں

صدیوں صدیوں وہی تماشہ ، رستہ رستہ لمبی کھوج

لیکن جب ہم مل جاتے ہیں کھو جاتا ہے جانے کون
اس مجموعے کی پہلی نظم ”دو کھڑکیاں“ ہے جب کہ پہلی غزل ”نیل گنگن میں تیر رہا ہے، اجلا اجلا پورا
چاند“ ہے۔ اس مجموعے میں ان کے سن شعور سے لے کر عہدِ جوانی تک کے مشاہدات و محسوسات شامل
ہیں۔ یہ زمانہ ان کی گوالیار اور بھوپال میں گزاری ہوئی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مجموعے میں قصبائی
زندگی اور مظاہر قدرت سے ان کی قربت و محبت کا کھل کر اظہار ملتا ہے۔ نذا فاضلی نے اپنے پہلے مجموعہ کلام
ہی سے اپنے بیانیے کی دیسی بوباس اور لب و لہجے کی انفرادیت کے باعث ادب شناسوں کی توجہ حاصل کر لی
تھی۔

2. ”مورناچ“

”مورناچ“ نذا فاضلی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ معیارِ پہلی کیشنز، دہلی کی وساطت سے
1978 میں اشاعت پذیر ہوا۔ یہ مجموعہ 114 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں 28 غزلیں، 31
نظمیں اور 19 گیت موجود ہیں۔ اس مجموعے میں بھی کوئی دوہا شامل نہیں ہے۔ انھوں نے اس مجموعے کے
آغاز میں لکھا ہے:

”جب بھی گھر سے باہر جاؤ
تو کوشش کرو۔۔۔۔۔ جلدی لوٹ آؤ
جو کئی دن گھر سے غائب رہ کر
واپس آتا ہے
وہ زندگی بھر پچھتا رہا ہے
گھر۔۔۔۔۔ اپنی جگہ چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔“

اس مجموعے کی پہلی غزل ”تنہا ہوئے خراب ہوئے آئینہ ہوئے“ ہے اور پہلی نظم ”ممبئی“ ہے۔ شہر کی
زندگی کے سفاک ماحول اور معاشی زندگی کی سختیوں نے انھیں جو نارسائی اور تلخی بخشی تھی، اس کا اظہار اس
مجموعہ کلام میں ہوا ہے۔ اس مجموعہ کلام کا آغاز بے گھری کے دکھ سے ہوتا ہے۔ انھوں نے بڑے شہر کے
لوگوں کی تجارتی ذہنیت، بناوٹی زندگی اور ریاکاری کے اپنے مشاہدات کو اس مجموعے میں بیان کیا ہے۔

3. ”آنکھ اور خواب کے درمیان“

”آنکھ اور خواب کے درمیان“ نڈافاضلی کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کو معیار پہلی کیشنز دہلی نے 1986 میں شائع کیا۔ یہ شعری مجموعہ 90 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں غزلوں کی تعداد 27، نظموں کی تعداد 36 اور گیتوں کی تعداد 3 ہے۔ اس مجموعے کا انتساب نڈافاضلی نے اپنی چھوٹی بہن کی چھوٹی بیٹی ماریہ کے نام کیا ہے۔ انھوں نے مجموعے کے آغاز میں ایک شعر بھی درج کیا ہے:

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

اس مجموعے کی پہلی غزل ”سفر میں دھوپ تو ہوگی جو چل سکو تو چلو“ ہے جب کہ ”وقت سے پہلے“ اس مجموعے کی پہلی نظم ہے۔ نڈافاضلی کا یہ مجموعہ کلام ان کے سابقہ مجموعہ کلام کی ہی توسیع ہے۔ اقربا اور آبائی گھر سے پھڑنے کا غم اسی طرح پھیلا ہوا نظر آتا ہے جس طرح ان کے سابقہ مجموعہ کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت کے وقت نڈا نے کوئی بیس برس کی محنت اور عارضی ٹھکانوں کے بعد اپنا ایک گھر بنالیا تھا۔ بے گھری اور گھر کے درمیان کی یہ خلیج ان کے بہت سے زخمی احساسات سے بھری پڑی ہے۔ مجموعی طور پر اس مجموعے میں نظموں کی بہ نسبت غزلیں زیادہ اثر انگیز ہیں۔

4. ”کھویا ہوا سا کچھ“

”کھویا ہوا سا کچھ“ نڈافاضلی کا چوتھا شعری مجموعہ ہے جو 1996 میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے کی اشاعت معیار پہلی کیشنز دہلی نے عمل میں لائی۔ یہ مجموعہ 140 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں 19 غزلیں، 37 نظمیں اور 48 دوہوں کے علاوہ 1 گیت بھی شامل ہے۔ اس مجموعے کا آغاز انھوں نے ایک دوہے سے کیا ہے جو یوں ہے:

وہ صوفی کا قول ہو یا پنڈت کا گیان
جتنی بیتے آپ پر اتنا ہی سچ مان

اس مجموعے کی پہلی غزل ”کہیں چھت تھی دیوار و درتھے کہیں۔۔۔“ اور پہلی نظم ”شناخت کی دعا“ ہے۔ اس مجموعے میں پہلی بار نڈا کے کچھ دوہے بھی شامل ہیں جو مجموعی طور پر وحدت حق، فطرت پسندی، انسانیت اور

محبت کے پیغام کے حامل ہیں۔ اس مجموعے پر انھیں ”ساتھیہ اکادمی انعام“ ملا تھا۔

5. ”شہر میرے ساتھ چل“

”شہر میرے ساتھ چل“ نڈا فاضلی کا پانچواں شعری مجموعہ ہے جو 2004 میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے کی اشاعت معیار پہلی کیشنز دہلی نے عمل میں لائی۔ یہ شعری مجموعہ 102 صفحات پر مشتمل ہے جس میں 25 غزلیں، 26 نظمیں، 3 گیت اور 6 دوہے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اس مجموعے میں نڈا فاضلی نے 12 ماہیے بھی شامل کیے ہیں۔ اس مجموعہ کلام میں پہلی بار ان کے یہاں ماہیے میں طبع آزمائی کے نمونے ملتے ہیں۔ ان ماہیوں میں بھی انھوں نے اسلوب کا نیا پن قائم رکھا ہے۔ انھوں نے اس مجموعے کے آغاز میں دو اشعار درج کیے ہیں جو اس طرح ہیں:

شہر میں سب کو کہاں ملتی ہے رونے کی جگہ

اپنی عزت بھی یہاں ہنسنے ہنسانے سے رہی

(نڈا فاضلی)

سخن پروراں یک تے ہیں یک زیادہ

ولے ہو رہے منج زبان کا سواد

(غواصی)

اس مجموعے کا انتساب نڈا نے اپنی بیٹی تحریر کے نام کیا ہے۔ اس انتساب میں انھوں نے اپنی بیٹی کے لیے ایک شعر لکھا ہے جو درج ذیل ہے:

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو چار کتابیں

پڑھ کر یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں گے

اس مجموعے کا پیش لفظ شاہد ماہلی نے لکھا ہے۔ اس مجموعے کی پہلی نظم ”شہر میرے ساتھ چل“ ہے اور پہلی غزل ”بندرا بن کے کرشن کنہیا اللہ ہو“ ہے۔

6. ”زندگی کی طرف“

”زندگی کی طرف“ نڈا فاضلی کی شاعری کا چھٹا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت معیار پہلی کیشنز

دہلی نے کی۔ یہ مجموعہ 2007 میں منصہ شہود پر آیا۔ انھوں نے اپنے اس مجموعے کے پبلشر شاہد علی خاں کو اس مجموعے کا نام ”زندگی کی طرف“ ہی بتایا تھا لیکن انھوں نے اپنی گراں گوشتی کی وجہ سے اسے ”زندگی کی تڑپ“ سن لیا تھا اور اسی نام سے شائع بھی کر دیا تھا۔ نذا فاضلی کا کلیات ”شہر میں گاؤں“ جب شائع ہوا تو اس میں اس مجموعے کو ”زندگی کی طرف“ کے نام سے ہی شامل کیا گیا تھا۔ اس مجموعے میں 31 غزلیں، 14 نظمیں اور 10 دوہے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ 1 گیت بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کا انتساب نذا نے اپنے نام کیا ہے۔ اس مجموعے کے آغاز میں دو اشعار درج کیے گئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

سبھی کی نظروں سے غائب تھا جو، وہ حاضر تھا
کسی نے مڑ کر نہیں دیکھا آدمی کی طرف

ہر طرف ہر جگہ بے شمار آدمی
پھر بھی تنہائیوں کا شکار آدمی

اس مجموعے کی پہلی نظم ”نوح بہت روئے“ ہے۔ اس مجموعے میں نذا فاضلی نے امیر خسرو سے لے کر اپنے والد دعا ڈبائیوی تک 29 کلاسیکی شعرا کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ ان غزلوں میں صوفیانہ آہنگ کے ساتھ نذا نے نئے دور کے مضامین کو بھی آراستہ کیا ہے۔ ایک طرح سے اس مجموعہ کلام میں انھوں نے صنف غزل میں بھی اپنے مہارت فن کی مثالیں بہم پہنچا کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ نظم اور غزل دونوں ہی میں یکساں دسترس رکھتے ہیں۔ اسی طرح کچھ دوہے بھی ہیں جو جدید ڈکشن میں صلح کل اور انسانی اخوت کے ازلی پیغام کے حامل ہیں۔

7. ”سب کا ہے ماہتاب“

”سب کا ہے ماہتاب“ نذا فاضلی کی شاعری کا ساتواں اور آخری مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ کلام عرشیہ پہلی کیشنز دہلی نے 2014 میں منظر عام پر لایا۔ یہ مجموعہ 112 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ کلام ان کے کلیات ”شہر میں گاؤں“ میں شامل نہیں ہے۔ اس مجموعے کا دیباچہ انھوں نے ”میرا تخلیقی سفر“ کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس مجموعے تک آتے آتے ان کا سماجی شعور زیادہ پختہ اور متوازن نظر آتا ہے۔ اس مجموعے میں

غزلیں، نظمیں اور دوہے شامل ہیں۔ اس کتاب میں شامل دوہوں میں انھوں نے اپنے منفرد اور تازہ کار اسلوب میں لوگوں کو اپنے عمل اور بقائے باہم کی راہ پر قائم رہنے کا پیغام دیا ہے۔ ندافاضلی کے اس مجموعے میں دوہوں کی تعداد 22 ہے۔ اس مجموعے میں غزلوں کی تعداد نظموں سے زیادہ ہے۔ ان غزلوں میں زیادہ پھیلاؤ محسوس ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں انھوں نے فرد اور سماج کے رشتے کی معنویت کی ایک نکھری ہوئی فضا بھی دکھائی ہے۔ انھوں نے خود کو عام لوگوں کا جزو بنالیا اور اپنی بات میں اجتماعی شعور پیش کرنے کی سعی کی ہے:

سبھی سے دور کا یا پاس کا رشتہ نکل آیا
جسے بھی غور سے دیکھا وہی اپنا نکل آیا

”شہر میں گاؤں“

ندافاضلی کا کلیات ”شہر میں گاؤں“ کے نام سے 2012 میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت معیار پہلی کیشنز دہلی سے عمل میں آئی۔ ان کا کلیات 662 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ان کے 6 شعری مجموعے شامل ہیں۔ اس کلیات میں 6 شعری مجموعوں کے علاوہ ”کچھ اور“ کے نام سے 34 صفحات پر مشتمل غزلیں اور نظمیں بھی شامل ہیں۔ ”کچھ اور“ میں 19 غزلیں اور 8 نظمیں موجود ہیں۔ ندافاضلی کا آخری شعری مجموعہ ”سب کا ہے ماہتاب“ ان کے کلیات میں شامل نہیں ہے۔ کیوں کہ اس مجموعے کی اشاعت ”شہر میں گاؤں“ کے دو سال بعد عمل میں آئی۔ ”شہر میں گاؤں“ میں غزلوں کی تعداد 160 اور نظموں کی تعداد 219 ہے۔ گیتوں کی تعداد 36 ہے جب کہ دوہوں کی تعداد 64 ہے۔ اس کے علاوہ اس کلیات میں 12 ماہیے بھی موجود ہیں۔

غزل اردو شاعری کی مقبول صنفِ سخن ہے۔ رشید احمد صدیقی نے بجا طور پر اسے ”اردو شاعری کی آبرو“ کہا ہے۔ غزل میں دل کے حالات کی بہتر اور سچی ترجمانی کے علاوہ حیات و کائنات کے دیگر مسائل و معاملات کو بھی موضوعِ سخن بنایا جاتا ہے۔ اسی لیے یہ صنف اپنے آغاز ہی سے ممتاز و مقبول رہی ہے۔ غزل کی مخالفت بھی کی گئی مگر یہ مخالفت اس کی مقبولیت کا سبب بنی۔ غزل اپنے طویل سفر کے دوران مختلف نشیب و فراز سے نبرد آزما ہوئی۔ مختلف ادوار میں سیاسی و سماجی تغیرات نے اسے متاثر ضرور کیا لیکن اپنی فنی پابندیوں

کے باوجود غزل ہر دور میں شاعروں کی توجہ کا مرکز و محور بنی رہی۔

غزل میں ہجر و فراق کے قصوں کے ساتھ ساتھ زندگی کے مشکل سے مشکل فکر و فلسفے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ تہذیب و تمدن کی کشمکش اور تعمیر و ترقی کے مختلف ادوار میں غزل میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ غزل میں زمانے کے ساتھ بدلنے، ہر ضرورت کو پورا کرنے اور ہر نوع کے مضامین ادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ظاہری ساخت کے اعتبار سے غزل کے تمام مصرعے ایک ہی وزن اور ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔ غزل کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر شعر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔ اس میں ایجاز و اختصار ہوتا ہے۔ غزل عربی زبان کا لفظ ہے۔ عربی زبان سے یہ صنف فارسی میں آئی اور پھر فارسی سے اردو میں منتقل ہو گئی۔ غزل واحد صنفِ سخن ہے جو غمِ جاناں، غمِ دوراں اور غمِ ذات کو تخلیقی اظہار دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ غزل ایک داخلی صنفِ سخن ہے جس کی بنا پر شاعر اپنے اطراف کے ماحول، واقعات، واردات اور ذات و کائنات کے متعلق تمام باتوں کو محسوس کرتا ہے اور اپنی زبان اور الفاظ کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ غزل کا شاعر صرف انسانی جذبات و واقعات اور کیفیات کو ہی اپنی غزل کا موضوع نہیں بناتا ہے بلکہ تمام کائنات کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شاعر کے دل پر گزرنے والی کیفیات وہی ہوتی ہیں جو دوسروں پر بھی بیت چکی ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے پڑھنے اور سننے والے کو اس میں اپنی داستان سنائی دیتی ہے۔

غزل کا فن رمز و ایما کا فن ہے۔ اردو شاعری کا بہت بڑا ذخیرہ غزلیہ شاعری پر مبنی ہے۔ اس نے اپنا ایک مخصوص فکری و فنی نظام قائم کیا ہے۔ اپنے آغاز سے دورِ حاضر تک عصری تقاضوں اور تبدیلیوں کو اپنی ذات میں سموتے ہوئے عہد بہ عہد اس کا ارتقا ہوا ہے اور یہ عوام و خواص میں ہر دل عزیز رہی ہے۔ غزل کے اولین نقوش ہمیں امیر خسرو کے کلام میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اگرچہ ان کی زبان میں فارسی و ہندی کے اثرات نمایاں ہیں پھر بھی ان سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں ان کی غزل کے چند ایک اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

زِ حالِ مسکین مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں

کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کا ہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چوں عمر کوتاہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

(امیر خسرو)

امیر خسرو کے علاوہ دکن کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ نے غزل کی نشوونما میں نمایاں کردار ادا کیا۔ وجہی، نصرتی، غواصی، بحرئی، شاہی اور شوقی وغیرہ نے بھی غزل کی نشوونما میں اہم رول ادا کیا۔ اردو غزل کو استحکام بخشنے میں ولی دکنی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے غزل کے مضامین کو وسعت بخشی۔ ان کی غزلوں میں شیرینی، حلاوت اور سادگی و پرکاری جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے اردو غزل کو ایک نیا آہنگ، نیا لہجہ، نئی لے اور نئی آواز سے آشنا کیا ہے۔ اردو غزل کی روایت میں ولی دکنی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس ضمن میں چند ایک اشعار دیکھیے:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

(ولی دکنی)

شمالی ہند کے فارسی شعرا ولی کے کلام کو دیکھ کر اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے کلام سے متاثر ہونے والے شعرا میں شاہ حاتم، مظہر جان جاناں، خان آرزو، شاہ مبارک آبرو، شا کرناجی اور یک رنگ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس دور میں رعایت لفظی اور ایہام گوئی پر زیادہ توجہ صرف کی گئی۔ ولی سے ہوتے ہوئے غزل میر تقی میر اور مرزا محمد رفیع سودا تک پہنچتی ہے۔ یہ اردو شاعری کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔ میر تقی میر اس دور کے نمائندہ غزل گو ہیں۔ ان کی انفرادیت اس بات میں مضمحل ہے کہ وہ روایت سے وابستہ بھی ہیں اور اس سے الگ بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری مبہم احساس اور غیر واضح جذبے کو صورت عطا کرتی ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ بڑی سے بڑی بات کو تمام انسانی جذبول کے ساتھ ملا کر بیان کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا تجربہ ہمارا تجربہ، ان کی تنہائی ہماری تنہائی اور ان کا درد و غم ہمارا درد و غم بن جاتا ہے۔ ان کی شاعری انسانی رشتوں کی شاعری ہے۔ میر کے چند اشعار دیکھیے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہ شیشہ گری کا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

(میر تقی میر)

مرزا محمد رفیع سودا نے اپنی قادر الکلامی، زبان دانی اور زورِ بیان سے اردو غزل کو ایک نیا رنگ و
آہنگ دیا۔ ان کی غزلوں میں شگفتگی، نشاط و کیف اور طنز و مزاح کی چاشنی ہے۔ جذبہ و احساس کے مقابلے
میں ان کے یہاں تخیل کی بلند پروازی اور مضمون آفرینی زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے فارسی روایت کو
اردو میں ڈھالنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے

(سودا)

خواجہ میر درد بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں تصوّف و معرفت کو شامل
کر کے اردو غزل کو نئے منصب سے آشنا کیا۔ درد کی شاعری میں انسانی عظمت کے چراغ روشن نظر آتے
ہیں۔

جن کے سبب سے دیر کو تو نے کیا خراب
اے شیخ ان بتوں نے مرے دل میں گھر کیا

(درد)

اسی طرح مصحفی، رنگین اور انشا کے بعد ذوق، مومن اور غالب نے غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا
کیا۔ انھوں نے اس صنف کو اپنے خونِ جگر سے سینچا اور اپنی غزلوں میں نیا اندازِ بیان اور ندرتِ خیال پیدا
کیا۔ غالب کی شاعری میں جنس و جذبہ اور فکر و فلسفہ ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ ان کے
یہاں عشق کی مختلف کیفیات و واردات کے بیان کے ساتھ حسن کی نفسیات کی عکاسی بھی نظر آتی ہے۔ ان کا بڑا
کارنامہ یہ ہے کہ ان کے یہاں غزل اپنی تمام تر رنگارنگی کے ساتھ موجود ہے۔ ان کی غزل میں تہہ داری بھی
ہے اور مضمون آفرینی کا کمال بھی ہے۔ نیز ان کے یہاں زندگی کا حقیقت پسندانہ تصور بھی پایا جاتا ہے۔ اس
حوالے سے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے ؟

(غالب)

شاہ نصیر، بہادر شاہ ظفر، شیفتہ، داغ اور امیر مینائی نے غزل کو بطور صنفِ سخن بہت تقویت دی۔ داغ کی شناخت ان کا لب و لہجہ اور زبان ہے۔ شوخی اور شرارت، شگفتگی اور رعنائی ان کے اسلوب کی خصوصیات ہیں۔ امیر مینائی کے یہاں زبان پر قدرت حاصل ہونے کی وجہ سے ایک طرح کا نکھار اور ستھرا پن ملتا ہے۔ اس کے علاوہ غزل کی مروج علامتوں کے ذریعے انھوں نے عصری شعور کی بھی عکاسی کی ہے۔

غزل کا جدید دور حالی سے شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل کے موضوعات کو وسعت دینے اور اسے رسمی عناصر سے پاک کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی خیالات و جذبات کو غزل میں داخل کرنے پر زور دیا۔ حالی کے بعد اس دور کا سب سے بڑا نام علامہ اقبال کا ہے۔ انھوں نے جدید غزل کو ایک نئے تصور اور نئے فلسفے سے روشناس کرایا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے روایت سے اپنا رشتہ برقرار رکھتے ہوئے غزل کو نئے امکانات سے آشنا کیا۔ اقبال کے نظریہ حیات اور تصویرِ فن میں حرکت و عمل، جہد مسلسل، قوت اور توانائی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

(اقبال)

اصغر، فانی، حسرت، یاس یگانہ اور جگر مراد آبادی نے جدید غزل کو عوام و خواص میں مقبول بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ ترقی پسند تحریک کے دور میں ساحر لدھیانوی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، جاں

نثار اختر، علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری اور فراق گورکھپوری جیسے شعرا نے غزل میں نئے نئے موضوعات کو شامل کر کے غزل کی ایک نئی روایت قائم کی اور اسے نیا لہجہ دیا۔ ترقی پسند تحریک نے مادیت، مقصدیت، اجتماعیت اور خارجیت پر غیر معمولی زور دیا۔

آزادی کے بعد غزل نئے موضوعات سے روشناس ہوئی۔ اس کے بعد جدیدیت کا رجحان پیدا ہوا۔ جدیدیت ایک اصطلاح ہے جس کا چلن 1960 کے بعد ہوا۔ اس میں وجودیت، فردیت، انفرادیت اور وجدان کی اہمیت پر زور ملتا ہے۔ جدیدیت میں کسی نظریے کی پابندی نہیں ہوتی ہے بلکہ آزادی اس کا کلیدی سفر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فرد جماعت سے الگ اپنا ایک وجود رکھتا ہے۔ وہ جماعت کے اصولوں کا پابند نہیں ہے۔ جدیدیت کے تحت غزل میں نئے نئے تجربے کیے جانے لگے۔ اس دور کی غزل میں ایسے موضوعات در آئے جو پہلے کے شاعروں نے شامل نہیں کیے تھے۔ اس دور میں ناصر کاظمی، احمد فراز، منیر نیازی، بشیر بدر، عرفان صدیقی، عادل منصور، ظفر اقبال، مظہر امام، شہریار، محمد علوی، ندافاضلی، مخمور سعیدی وغیرہ کے نام قابل ستائش ہیں۔

ندافاضلی اردو شعر و ادب کا ایک ایسا نام ہے جو کسی تعارف یا تمہید کا محتاج نہیں ہے۔ ان کا شمار اردو کے ان جدید شعرا میں ہوتا ہے جنہیں ترقی پسند تحریک کے دم توڑنے کے بعد شہرت ملی۔ وہ اپنے وقت کے اہم تخلیق کار تسلیم کیے جاتے ہیں۔ زندگی نے ان سے سخت امتحانات لیے مگر وہ اپنی بے پناہ صلاحیت، بلند حوصلے اور بھرپور اعتماد کے سبب تمام امتحانات میں کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ ان کی شاعری ان کی زندگی سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ انھوں نے زندگی کو جس طرح جیا اور برتا اس کا اظہار اسی انداز سے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری دل کے بہت قریب محسوس ہوتی ہے۔ وہ شاعری میں اپنی زندگی کے تجربات عام آدمی کی زندگی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں موضوعات کا تنوع نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری بند کمروں سے باہر نکل کر چلتی پھرتی زندگی کا ساتھ نبھاتی ہے اور نا انصافیوں کے خلاف اپنی لے بلند کرتی ہے۔ اپنی شاعری کے حوالے سے ندافاضلی لکھتے ہیں:

”میری شاعری نہ صرف ادب اور اس کے پڑھنے والوں کے ادبی

رشتوں کو ضروری مانتی ہے، اس کے تہذیبی و سماجی حوالے کو اپنا معیار بھی

جانتی ہے۔ یہ ایک طرح ادب کی اس روایت کی حمایت ہے جو ادب

کو اشرافیہ کی پرانی حکمرانی سے آزاد کر کے اسے عوامی وقار عطا کرتی ہے۔ یہ شاعری بند کمرے سے باہر نکل کر چلتی پھرتی زندگی کا ساتھ نبھاتی ہے اور ان علاقوں میں جانے سے نہیں ہچکچاتی جہاں روشنی بھی مشکل سے پہنچ جاتی ہے۔ یہ ماں کی آنکھوں سے مسکراتی ہے۔ بہن کے آنچل میں سرسراتی ہے۔ بچوں کے ساتھ اسکول جاتی ہے۔ مزدوروں کے ہاتھوں سے بوجھ اٹھاتی ہے اور اس کے ساتھ سورج میں جھلکتی بھی ہے، برسات میں نہاتی بھی ہے اور وقت آنے پر نا انصافی کے خلاف انصاف کی آواز بھی اٹھاتی ہے۔“¹

نڈا فاضلی کے کلام میں احساس اور اظہار دونوں سطحوں پر جدت اور ندرت ہے۔ ان کی شاعری میں سادگی، سلاست اور نفاست کی کیفیت کا فرما ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں ہندوستانی تہذیب، گاؤں دیہات کا تصور، فرقہ وارانہ فسادات، اخلاقی قدریں، رشتوں کی پامالی، انسان کا ذہنی انتشار اور آفاقی منظر نامے کو پیش کیا ہے۔ نڈا کی غزلیہ شاعری کو جانچنے، پرکھنے اور سمجھنے کے لیے راقم الحروف نے ان کی غزلیہ شاعری کو مختلف موضوعات میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نڈا فاضلی نے اپنی غزلوں میں کس طرح کی زبان، اسلوب اور لہجہ اختیار کیا ہے، اس کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔

عشق و رومان:

عشق غزل کا بنیادی موضوع رہا ہے۔ غزل کی تمام تر رعنائی حسن و عشق میں مضمر ہے۔ یہی عشق غزل کی مقبولیت کا سبب ہے۔ عشق خواہ حقیقی ہو کہ مجازی، اس کائنات کو روشنی عطا کرتا ہے۔ یہی انسان کو جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ نڈا فاضلی کے یہاں عشق کی مختلف کیفیات کا بیان ملتا ہے۔ ان کی غزلیں عشق و رومان سے لبریز ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری کا مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عشق و محبت کے بغیر زندگی کا جشن منایا ہی نہیں جاسکتا۔ جب محبت کے گہرے بادل نمودار ہو جاتے ہیں اور برسنے لگتے ہیں تو پورا وجود اس میں بھیگ جاتا ہے۔ محبت کی بارش وجود میں پراثر تبدیلی پیدا کر دیتی ہے اور ماحول کو بھی خوب صورت وادی میں تبدیل کر دیتی ہے۔

کبھی بادل، کبھی کشتی، کبھی گرداب لگے

وہ بدن جب بھی سچے کوئی نیا خواب لگے

جب بھی کسی نگاہ نے موسم سجائے ہیں

تیرے لبوں کے پھول بہت یاد آئے ہیں

نہ افاضلی کی غزلوں کا فکری مرکز عشق ہے۔ چاہے وہ خدا سے ہو، ماں باپ سے ہو یا فطرت سے ہو، ہر جگہ عشق ہی عشق نظر آتا ہے۔ میر تقی میر نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے کہ ان کے والد عالم محویت میں فرمایا کرتے تھے:

”بیٹے عشق کرو، عشق ہی اس کا رخا نہ ہستی کا چلانے والا ہے۔ اگر عشق

نہ ہوتا تو نظام عالم قائم ہی نہ ہو سکتا تھا۔ بغیر عشق کے زندگی وبال ہے۔

عشق میں جی جان کی بازی لگا دینا ہی کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے۔

عشق ہی جلا کر کندن کر دیتا ہے۔ جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے۔

آگ میں سوزش عشق سے ہے۔ خاک میں عشق کا قرار ہے اور ہوا میں

اس کا اضطراب ہے۔ موت عشق کی مستی اور زندگی اس کی ہوشیاری ہے۔

دن اس کی بیداری اور رات اس کی نیند ہے۔“ 2

نہ افاضلی بھی اسی کے قائل ہیں۔ انھوں نے خدا کے ساتھ ساتھ اس کے بندے سے عشق کیا۔ خدا کی بنائی ہوئی اس کائنات، انسانی اقدار اور رشتوں سے بھی عشق کیا ہے۔ انھوں نے حسن و عشق کے موضوع پر بہت خوب صورت اشعار کہے ہیں۔ یہاں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے اردو غزل کو وسعت بخشی۔ اس ضمن میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

نہ جانے اب وہ کیسی ہو مگر جب اس کو دیکھا تھا

یقین ہے آج بھی کوئی حسیں ایسا نہیں ہوگا

چھ دن لگا کے اس نے سارا جہاں بنایا

تجھ جیسا اور کوئی پھر بھی کہاں بنایا

نہ افاضلی نے ان اشعار میں حسن و عشق اور رومان کی آمیزش سے ایک پر لطف فضا پیدا کی ہے۔ ان کی غزلوں میں رومانیت کی چاشنی ہے۔ اپنی زندگی کے اس پہلو پر وہ بے باکانہ اظہار خیال کرتے ہیں۔

صنفِ نازک کا ذکر کرتے ہوئے ان کا قلم لطافت اور جذباتیت کا دریا بہاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں عشق کے مختلف رنگ موجود ہیں۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے یہاں غمِ عشق کی جلتی خاموش شمع کا ذکر بھی ملتا ہے اور عشق کے پرخطر راستوں کا بیان بھی ملتا ہے۔ ان کا دل افسردہ بھی ہے اور خوش بھی۔ کہیں کہیں وہ زخم خوردہ عاشق کے روپ میں نظر آتے ہیں تو کبھی بیدارِ عشق سے بہت دور دکھائی دیتے ہیں۔ وہ عشق کی آگہی اور عرفان سے بہ خوبی واقف ہیں۔ وہ عشق کے درد کی اہمیت سمجھنے میں کبھی بھی غفلت سے کام نہیں لیتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دل میں نہ ہو جرأت تو محبت نہیں ملتی
خیرات میں اتنی بڑی دولت نہیں ملتی

کچھ دنوں تو شہر سارا اجنبی سا ہو گیا
پھر ہوا یوں وہ کسی کی میں کسی کا ہو گیا

جو ہو اک بار وہ ہر بار ہو ایسا نہیں ہوتا
ہمیشہ ایک ہی سے پیار ہو ایسا نہیں ہوتا

اپنی طرح سبھی کو کسی کی تلاش تھی
ہم جس کے بھی قریب رہے دور ہی رہے
مذکورہ بالا اشعار میں عشق کی مختلف کیفیات کا بیان ملتا ہے۔ نذافتِ صلی عشرت سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ کبھی دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب نظر آتے ہیں تو کبھی ایک دوسرے سے دور دکھائی دیتے ہیں۔ عشرت سے دوری کا غم ان کو زندگی بھر تڑپاتا رہا۔ عشرت کی یاد میں ان کا شعر ملاحظہ فرمائیں:

اب کیا بتائیں کون تھا، کیا تھا وہ ایک شخص
گنتی کے چار حرفوں کا جو نام رہ گیا

عشرت کی ناکام محبت سے دل برداشتہ ہو کر نذافتِ صلی مالتی جوشی سے نزدیکیاں بڑھانے لگے۔ مالتی جوشی کے لیے نذافتِ صلی نے ایک غزل بھی کہی تھی۔ جس شعر کے ذریعے انھوں نے مالتی جوشی سے اظہارِ عشق

کیا وہ یوں ہے:

ممکن ہے سفر ہو آساں اب ساتھ بھی چل کر دیکھیں
کچھ تم بھی بدل کر دیکھو کچھ ہم بھی بدل کر دیکھیں
نہا فاضلی میر تقی میر سے کافی متاثر تھے۔ میر نے اپنے ایک شعر میں عشق کی کیفیت کو یوں بیان کیا

تھا:

عشق اک میر بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اٹھتا ہے
نہا فاضلی مذکورہ بالا شعر سے متفق نظر نہیں آتے ہیں۔ جہاں میر نے عشق کو ایک مشکل اور پیچیدہ عمل
قرار دیا وہیں نہا فاضلی عشق کے سفر میں ہر مشکل سے ہو کر گزرنے کی بات کرتے ہیں۔ وہ اس شعر کے
جواب میں لکھتے ہیں۔

ہمارا میر جی سے متفق ہونا ہے نا ممکن
اٹھانا ہے جو پتھر عشق کا تو ہلکا بھاری کیا
اردو شعرا نے جس طرح اپنی شاعری میں محبوب کے سراپے کو پیش کیا ہے۔ نہا فاضلی بھی اپنے الگ
اور منفرد انداز میں محبوب کے خط و خال کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ محبوب کے لب و رخسار کی تعریف کچھ اس
انداز میں کرتے ہیں:

اکیے کمرے میں گلدان کہاں بولتے ہیں
تمہارے ہونٹ ہیں شاید گلاب میں شامل

کہیں چہرہ، کہیں آنکھیں، کہیں لب
ہمیشہ ایک ہی ملتا ہے کئی میں

عشق و محبت کا ایک خاص موضوع ہجر و وصال رہا ہے۔ اردو شعرا نے اس موضوع پر خوب لکھا ہے۔
نہا فاضلی کے یہاں بھی ایسے اشعار کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہجر میں روتے
نہیں اور نہ ہی مایوس ہوتے ہیں بلکہ ہمت و حوصلہ سے کام لیتے ہیں۔ وہ محبوب کے ہر ناز و ادا کو خندہ دلی سے
قبول کرتے ہیں۔

تم سے چھٹ کر بھی تمہیں بھولنا آسان نہ تھا
تم کو ہی یاد کیا تم کو بھلانے کے لیے

تمہارا ساتھ غنیمت ہے آج بھی لیکن
تم آئے تھے تو لگا تھا کوئی کمی نہ رہی

اسی طرح نڈافاضلی نے اپنی غزلیہ شاعری میں عشق کی مختلف کیفیات کو بیان کرتے ہوئے مشورہ دیا
ہے کہ عشق کرنے سے انسان کو زندگی کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔ اس تجربے سے انسان کو گھر، محلہ اور شہر پہلے
سے زیادہ اچھے محسوس ہونے لگتے ہیں۔

عشق کر کے دیکھیے اپنا تو یہ ہے تجربہ
گھر محلہ شہر سب پہلے سے اچھا ہو گیا

نڈافاضلی رومان و محبت کی ایک صورت بناتے ہیں جس میں ہر قاری اپنی عقیدت تلاش کرتا ہے۔
ان کے یہاں ایک صاف شفاف رومانی فضائلی ہے جس میں کسی طرح کی کوئی عریانی نظر نہیں آتی بلکہ فطرت
کے ذریعے زندگی کو خوب صورت بنانے کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ عشق و رومان کے موضوع پر ان کی
ایک غزل کو کافی شہرت و مقبولیت ملی جس کو مشہور گلوکار جگجیت سنگھ نے اپنی آواز سے دوبالا کر دیا تھا۔ غزل پیش
خدمت ہے:

ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے
عشق کیجیے پھر سمجھیے زندگی کیا چیز ہے

ان سے نظریں کیا ملیں روشن فضا میں ہو گئیں
آج جانا پیار کی جادوگری کیا چیز ہے

کھلتی زلفوں نے سکھائی موسموں کو شاعری
جھکتی آنکھوں نے بتایا مے کشی کیا چیز ہے

ہم لبوں سے کہہ نہ پائے ان سے حالِ دل کبھی

اور وہ سمجھے نہیں یہ خامشی کیا چیز ہے
مذکورہ بالا اشعار میں عشق کی مختلف کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس غزل کے اشعار اس حقیقت کے
منظر ہیں کہ نذافضلی کو رومانوی اظہار پر بھی بے پناہ قدرت حاصل تھی۔

سیاسی مسائل:

نذافضلی کی شاعری کا ایک اہم پہلو سیاسی و انقلابی رہا ہے۔ انھوں نے جس ماحول میں آنکھیں
کھولیں وہ افراتفری کا دور تھا، تقسیم ہند کا المیہ سامنے تھا جس کے اثرات ملک کے عام انسانوں پر بھی
پڑے۔ وہ تقسیم ہند اور فسادات سے پیدا شدہ صورتِ حال سے بہ خوبی واقف تھے۔ ایسے حالات میں
نذافضلی بھلا چپ کہاں بیٹھتے۔ انھوں نے سیاسی مسائل پر قلم اٹھایا جس سے ان کی شاعری کا دائرہ اور بھی
زیادہ وسیع ہو گیا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عام انسانوں پر ہو رہے ظلم و ستم کو بے باکی سے بیان کیا۔ اس
حوالے سے چند اشعار دیکھیے:

ہر ایک گھر میں دیا بھی جلے اناج بھی ہو
اگر نہ ہو کہیں ایسا تو احتجاج بھی ہو

بدل رہے ہیں کئی آدمی درندوں میں
مرض پرانا ہے اس کا نیا علاج بھی ہو

مذکورہ بالا اشعار میں نذافضلی سیاست کے خلاف احتجاج کرتے نظر آ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی
شاعری میں عوامی جذبات و احساسات کو پیش کیا ہے جس سے ان کی شہرت و مقبولیت عوام و خواص میں ہوئی۔
انھوں نے عوامی مسائل کو بیان کرتے ہوئے صدائے احتجاج بھی بلند کیا۔ اس ضمن میں وسیم فرحت کا رنجوی
اپنے مضمون ”ندائے احتجاج“ میں رقم طراز ہیں:

”نذافضلی کی شاعری دلوں میں گھر کرنے والی شاعری ہے۔ ان کا
شعری احتجاج بہ ہر طور قابل ستائش ہے۔ خود فراموشی اور فریب آرزو
کے خلاف یہی ”ندائے احتجاج“ انھیں جدید یوں کے ہجوم میں
انفرادیت بخشی ہے۔“ 3

نَدَافِضلی کے یہاں آغازِ شاعری میں اپنے عہد کے سیاسی حالات، فرقہ واریت سے دلبرداشتگی اور مذہب کے استحصال سے جو رِملِ سامنے آیا اس کی گونج ان کی شاعری میں اخیرِ عمر تک سنائی دیتی رہی۔ ان کا احتجاج سماج کے خلاف بھی ہے اور اپنوں کے خلاف بھی۔ وہ ہر مورچے پر ظلم و جبر کے خلاف اپنی صدا بلند کرتے ہیں کیوں کہ وہ تمام معاشرے کو خوش حال دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ زخموں پر مرہم کے تمنائی ہیں اور صحرا میں ٹھنڈی چھاؤں کے متلاشی بھی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ جب تک سماج میں تبدیلی نہیں آئے گی تب تک عوام پر ظلم و ستم ہوتا رہے گا۔ اسی لیے وہ عوام کو اپنی شاعری کے ذریعے بیدار کرتے ہیں۔ جب عوام میں اتحاد و اتفاق ہوگا تو حکومتوں کو بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ اس تناظر میں نَدَافِضلی کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

حکومتوں کو بدلنا تو کچھ محال نہیں
حکومتیں جو بدلتا ہے وہ سماج بھی ہو

نہ کرتے شور شرابہ تو اور کیا کرتے
تمہارے شہر میں کچھ اور کام کاج بھی ہو

رہے گی وعدوں میں کب تک اسیر خوشحالی
ہر ایک بار ہی کل کیوں، کبھی تو آج بھی ہو

مذکورہ بالا آخری شعر آج کے سیاست دانوں پر ایک طنز ہے۔ وہ عوام کو گمراہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے ہیں۔ وہ عوام سے جھوٹے وعدے کر کے ان سے ان کی خوشیاں چھین لیتے ہیں۔ جب عوام اپنے حقوق حاصل کرنے کی مانگ کرتے ہیں تو ان کی مانگ ٹال دی جاتی ہے۔

نَدَافِضلی ملک کی تقسیم کو حق نہیں مانتے تھے۔ وہ اس تقسیم کو عوام کی بد نصیبی اور انسانوں کی بد بختی مانتے ہیں۔ اس تقسیم سے برصغیر میں خون کی ہولی کھیلی گئی، لغزشوں کی دیواریں استوار کی گئیں اور نفرتوں کے بیج بوئے گئے۔ جس کو آنے والے وقت نے ثابت کر دکھایا کہ جو ہوا وہ درست نہیں ہوا تھا۔ اس حوالے سے م۔ ناگ اپنے مضمون ”نَدَافِ ایک آئس برگ“ میں لکھتے ہیں:

”نَدَافِضلی نے پاکستان سے لوٹ کر بتایا تھا۔ میں نے دیکھا، کراچی کی
فٹ پاتھ پر پڑا ایک بھکاری سسک رہا تھا۔ اس کا نام رحیم تھا۔ جب

بمبئی لوٹا تو چرچ گیٹ کے سامنے اسی بھکاری کو گرگڑا کر بھیک مانگتے
دیکھا۔ میں نے اس کا نام پوچھا تو اس نے اپنا نام رام بتایا۔ میں سوچتا
ہوں کہ اگر رام اور رحیم کو بھیک ہی مانگنا تھا تو پھر اس ملک کی تقسیم کس
لیے ہوئی تھی۔“ 4

نڈافاضلی نے سیاست اور نظریاتی شاعری کو ہمیشہ ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ انھوں نے سیاست
دانوں کو ”درندے“ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ برصغیر کی تقسیم سے فرقہ واریت کو بڑھا دیا۔ انھیں اس بات کا
احساس تھا کہ حکمران طبقہ عام انسانوں کو جینے نہیں دے گا۔ وہ انسانوں کو آپس میں لڑاتے رہیں گے۔ یہاں
کے سیاست داں کبھی مذہب کے نام پر اور کبھی دیگر چیزوں کا لالچ دے کر عوام کو بہکاتے ہیں۔ اپنے مفاد کے
لیے وہ کسی کو بھی بلی کا بکرا بناتے ہیں۔ دھوکہ دینا تو ان کی جبلت میں شامل ہوتا ہے۔ ان کی وجہ سے لوٹ
کھسوٹ اور قتل و غارت ہوتا ہے۔ نڈافاضلی نے تقسیم ہند کے بعد اس سیاسی المیے کو اپنی ایک غزل نماظم میں
یوں پیش کیا ہے:

انسان میں حیوان یہاں بھی ہے وہاں بھی
اللہ نگہبان یہاں بھی ہے وہاں بھی

خون خوار درندوں کے فقط نام الگ ہیں
ہر شہر بیابان یہاں بھی ہے وہاں بھی

ہندو بھی سکوں سے ہے مسلمان بھی سکوں سے
انسان پریشان یہاں بھی ہے وہاں بھی

رحمان کی رحمت ہو کہ بھگوان کی مورت
ہر کھیل کا میدان یہاں بھی ہے وہاں بھی

اٹھتا ہے دل و جاں سے دھواں دونوں طرف ہی
یہ میر کا دیوان یہاں بھی ہے وہاں بھی

ہندو اور مسلمان کے درمیان دہائیوں سے فرقہ وارانہ فسادات ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت کے جذبات فوری طور پر بھڑک جاتے ہیں؟ اس سوال کو گہرائی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاست دانوں نے اپنے سیاسی مفادات کے لیے لوگوں کو آپس میں لڑایا اور عوام بغیر سوچے سمجھے ان کی سازشوں کا شکار ہوتے رہے۔ ہمارے ادبا و شعرا ان ظالم سیاست دان حکمرانوں کے خلاف لکھتے آ رہے ہیں جنہوں نے انسان اور انسانیت کا قتل کیا ہے اور ان کی لاش پر چل کر اپنی حکومت کا قصر تعمیر کرایا ہے۔ چند ایک اشعار دیکھیے:

آج اور کل کی بات نہیں ہے صدیوں کی تاریخ یہی ہے
ہر آگن میں خواب ہیں لیکن چند گھروں میں تعبیریں ہیں

ہوگا وہ دیوتا مرے گھر میں تو سانپ تھا
خطرہ لگا تو مار دیا پھر کسی کو کیا

ہم کو کب جڑنے دیا جب بھی جڑے بانٹا گیا
راستے سے ملنے والا راستہ کاٹا گیا

ہر عدالت اسی مجرم کو بری کرتی ہے
جرم کر کے جو گنہ گار نہ ہونے پائے

متذکرہ بالا اشعار میں نفاذ ضلعی نے سیاست دانوں پر طنز کے تیر برسائے ہیں۔ دو ملکوں کی رنجش کی وجہ سے معصوم عوام کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد سے جو قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہوا وہ آج بھی جاری و ساری ہے بلکہ اس میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ اس بات کا سارا الزام سیاست دانوں کے سر جاتا ہے جنہوں نے عوام کو کبھی آپس میں جڑنے نہیں دیا۔ عوام کے مل جل کر رہنے سے حکومت کو پریشانی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اس راستے کو جڑ سے اکھاڑتی ہے جو عوام کو جوڑنے کا کام کرتا ہے۔ عدالتوں میں بھی یہی صورت حال ہے۔ عدالت اس شخص کو سزا دیتی ہے جو بے گناہ ہوتا ہے۔ قصور وار جرم کر کے بھی بری ہوتا ہے۔ اب حالات ایسے ہیں کہ عدالتوں میں بھی انصاف کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

ابراہیم لنکن نے جمہوریت کا مفہوم واضح کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”جمہوریت کے معنی عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے، عوام کے لیے ہے۔“ عوام ہی سماج ہے اور عوام ہی معاشرہ ہے۔ یہی معاشرہ جمہوری نظام کو بدل سکتا ہے۔ اس صورتِ حال کو نڈافاضلی نے اپنے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے:

مجھ سے ہی ہے ہر ایک سیاست کا اعتبار

پھر بھی کسی شمار میں ہوں بھی نہیں بھی ہوں

آج جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ ایک مہذب سماج میں نہیں ہونا چاہیے۔ آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ اس صورتِ حال میں انسان کرے بھی تو کیا کرے۔ وہ اپنے لبوں کو حرکت بھی نہیں دے سکتا ہے کیوں کہ حالات اتنے خراب اور سنگین ہیں کہ لب کھولنا گویا آفت مول لینا ہے۔ اب کسی میں ہمت نہیں کہ برائی کے خلاف آواز اٹھائے۔ جرم کے خلاف اپنی صدا سے حکمرانوں کے درو دیوار ہلائے۔ ان سنگین حالات میں نڈافاضلی کی آواز فہم و ادراک کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی، احساس کو جگاتی ہوئی اور قلب کو گرماتی ہوئی نمودار ہوتی ہے۔ یہی حرارت حیات کی ضامن ہے۔

سماجی مسائل:

ادیب و شاعر سماج کا نباض ہوتا ہے۔ سماج کے ساتھ اس کا رشتہ گہرا ہوتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو سماج سے الگ نہیں کر سکتا کیوں کہ سماج کو وجود بخشنے میں انسان اہم رول ادا کرتا ہے۔ شاعر و ادیب خود کو سماج سے کتنا بھی دور رکھے، سماج کے حالات و واقعات کا اثر اس پر پڑتا ہے۔ شاعر سماج کے مثبت اور منفی دونوں اثرات قبول کرتا ہے۔ وہ عام انسان سے زیادہ حساس اور سنجیدہ ہوتا ہے۔ جو چیزیں شاعر اپنے تخیل و ادراک کی وجہ سے دیکھ سکتا ہے ان چیزوں کو عام انسان کے لیے محسوس کرنا بھی دور کی بات ہے۔ نڈافاضلی کے یہاں سماجی بکھراؤ، قدروں کی پامالی، رشتوں کی ناقدری وغیرہ جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ انھیں اپنے سماج سے بے پناہ محبت و عقیدت ہے۔ سماج کے حالات و واقعات پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔ انھوں نے سماجی اور معاشرتی زندگی کے توسط سے ایک منفرد اندازِ نگارش اپنایا ہے جس کو پروفیسر یعقوب یاور نے اپنے مضمون ”نڈافاضلی کی شاعری“ میں اس طرح بیان کیا ہے:

”انھوں نے (نڈافاضلی) سماجی زندگی کو امن و عافیت سے رہنے لائق

بنانے کے لیے ہر قسم کی عصبیت کی بیخ کنی کی کوشش کی۔ اس نے حصولِ
زرا اور حرصِ منفعت کے پیدا کردہ ذاتی عناد، مناقشات اور تعصبات کے
عذاب کو نہ صرف پہچانا بلکہ ان سے گریز کی تلقین بھی کی۔ انھوں نے
سماجی اور معاشرتی زندگی کے توسط سے جو منفرد اندازِ نگارش اپنایا، اسی
میں ان کی انفرادی شناخت کے جوہر پوشیدہ ہیں۔“ 5

نہدافاضلی نے اپنے پہلے شعری مجموعے ”لفظوں کا پل“ کے نصف دوم سے لے کر دوسرے مجموعے
”مورناچ“ تک قصباتی زندگی کی آسودگی اور ٹھنڈک سے دور صنعتی شہر کے معاشرتی تضاد کی روداد بیان کی
ہے۔ ان کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد زیادہ ہے جو اپنے اندر سماجی معنویت لیے ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں
درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دعا سلام میں لپٹی ضرورتیں مانگے
قدم قدم پہ یہ بستی تجارتیں مانگے

بادل، چاند، گھٹائیں، سورج، یہ باتیں کیا جانیں
ان سے پوچھو کس بستی میں کیسا موسم ہوگا

پہلے تلاشا کھیت، پھر دریا کی کھوج کی
باقی کا وقت گیاروں کے دانوں میں بٹ گیا

آنگن میں پیڑ ہیں نہ پرندے ہیں آس پاس
تقسیم ہو گیا ہے مرا خاندان کیا

نہدافاضلی نے سماجی اور معاشرتی زندگی کے حوالے سے اپنی ذات کی تفہیم کی خاطر اپنے آپ کو
نشانے پر رکھ کر جو منفرد انداز اپنایا ہے اسی میں ان کی مستحکم شخصیت کا راز پنہاں ہے۔ ان کی شاعری کی ایک
خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی مسئلے کو لے کر صرف غم اور افسوس کا اظہار نہیں کرتے بلکہ اس سلسلے کو سلجھانے کے
لیے بھی کوشاں رہتے ہیں۔ آج کل سماجی قدروں کا زوال عام سی بات ہو گئی ہے۔ اب سماج کی کسی بھی برائی
اور خرابی پر کوئی کچھ نہیں بولتا بلکہ سب خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔ نہدافاضلی اس روئے پر چوٹ کرتے

ہوئے کہتے ہیں:

ہر ایک بات کو چپ چاپ کیوں سنا جائے
کبھی تو حوصلہ کر کے نہیں کہا جائے

یہ شیخ و برہمن ہمیں اچھے نہیں لگتے
ہم جتنے ہیں یہ اتنے بھی سچے نہیں لگتے

نڈا فاضلی کا ماننا ہے کہ اگر سماج سے ان دو عناصری یعنی شیخ و برہمن کو نکالا جائے تو سماج کی صورت حال بہتر ہوگی۔ ہم جن حالات، سوالات اور خیالات سے گزر رہے ہیں، ہمارے شعرا نے ان کی پیش کش میں کافی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ ابھی تک ہم اپنے سماجیاتی افکار و کردار کو نئے سانچوں کے مطابق نہ سمجھ سکے اور نہ ہی ان کا کوئی حل دریافت کر سکے ہیں:

آج ذرا فرصت پائی تھی آج اسے پھر یاد کیا
بندگلی کے آخری گھر کو کھول کے پھر آباد کیا

بندگلی، آخری گھر، فرصت اور یاد ہماری شہری نفسیات کی ترجمان فضا اور اس سے گھرا ہوا ماحول، ان لفظوں میں موجود ہے۔ ایسی صورت میں گھریا تو بک گئے یا پھر بند پڑے ہیں۔ اس شعر میں نڈا فاضلی نے بندگلی کے آخری گھر کا ذکر کرتے ہوئے سماجی اور معاشرتی کشمکش کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے زندگی کے حقائق کی عکاسی اپنی غزلیہ شاعری میں کچھ اس طرح کی ہے کہ ان کی شاعری عصری دور کے انسان کی ترجمان بن کر سامنے آئی ہے۔ انھوں نے علامتی اظہار سے بھی اپنی غزلوں میں کہیں کہیں شگفتگی پیدا کی ہے:

ہر زندگی کے ہاتھ میں کشکول کی طرح
محرومیوں کے پاس بغاوت نہیں رہی

انسان نے اپنی محرومیوں کو قبول کر لیا اور انھیں اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا۔ ان سے بغاوت نہیں کی۔ انسان کی زندگی اب ایسی ہو کر رہ گئی ہے جیسے اس کے ہاتھ میں کشکول ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اپنے حالات پر غور کرنے اور ان کو بدلنے کی کوشش کرنے کے مقابلے میں ان سے سمجھوتا کر رہا ہے۔ مذکورہ بالا شعر جدید ذہنی رویوں اور سماجی حقائق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آج کا فن کار اپنے سیاسی، سماجی اور اقتصادی ماحول کی وجہ سے ذہنی انتشار اور تناؤ کا شکار ہے۔ اس کو نہ گھر میں اور نہ گھر سے باہر چین و سکون حاصل ہوتا

ہے۔ بے چینی اور بے قراری اب اس کے ساتھ مستقل ہو گئی ہے۔ زندگی میں اسے ٹھہراؤ نظر نہیں آتا، ثبات کا احساس بھی نہیں ہو رہا۔ یہ ساری چیزیں جدیدیت کی دین ہیں۔ رشتوں میں بھی اب درار پیدا ہو گئی ہے۔ اب وہ پیار، محبت، ہمدردی اور بھائی چارہ نہیں رہا جو پرانے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ ہمارے سماج کی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ اب ہمسایوں کے درمیان دیواریں کھڑی ہو گئی ہیں۔

نڈافضلی کی شاعری میں اس بات کی طرف بھی اشارے مل جاتے ہیں کہ موجودہ سماج اب جدید بن گیا ہے لیکن رشتوں کا بکھراؤ اور اقدار کی پامالی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے جس کی وجہ سے انسانیت زوال پذیر ہوتی جا رہی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسان اپنے ضمیر کو جھنجھوڑے اور اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرے کہ وہ اصل میں کیا ہے۔ انھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ مغربیت ہماری رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ ہماری نئی پود تو اس کو اپنانے میں زیادہ دل چسپی لے رہی ہے۔ موجودہ دور کا انسان پیسے کمانے میں اتنا مصروف ہے کہ اس کے دل میں ایثار، ہمدردی وغیرہ کا گزر بھی نہیں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے غریبوں کی کھل کر حمایت کی اور ان کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ وہ ان پر ہو رہے کسی بھی ظلم و جبر کو برداشت نہیں کرتے بلکہ جابہ جاموجودہ سماج کے خلاف احتجاج بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ انھیں اس بات کا احساس ہے کہ سماج میں انقلاب لانے کے لیے مسلسل جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے کبھی کبھار جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑ سکتا ہے، تب جا کر سماج میں تبدیلی آ سکتی ہے۔

فسادات:

ہندستان آج جن مسائل سے دوچار ہے، ان میں سب سے اہم مسئلہ فرقہ واریت کا ہے۔ 1857 میں جنگِ آزادی کا آغاز ہوا۔ 90 برس کی جدوجہد مسلسل کے بعد ہندستان 1947 میں آزاد تو ہوا لیکن اس آزادی نے دو بڑے زخم بھی دیے۔ ایک یہ کہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور دوسرا یہ کہ اس تقسیم کے بعد ایک خونی سیلاب بھی آ گیا۔ ان حالات و واقعات سے نبرد آزما ہو کر جب نئی نسل ابھری تو مذہب، اخلاق اور انسانیت سے اس کا اعتبار کچھ حد تک کمزور ہو گیا۔ نئی نسل ان حالات میں ایسے سماج کی متلاشی ہو گئی جو تمام تر کثافتوں سے پاک ہو۔ آج ہندستان میں فرقہ واریت اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ہندستان اخلاقی پستی اور زوالِ انسانی کی مثال بن کر رہ گیا ہے۔ گجرات کے فسادات میں ہم انسانی اقدار کی حق تلفی دیکھ چکے ہیں،

انسانیت کو سسکتے دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ چند سیاست دانوں نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر کس قدر بدستی اور لاپرواہی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات فرقہ واریت کی شدت کو ناپنے کا بہترین آلہ ہے۔ فرقہ واریت جس تیزی سے بڑھے گی، اسی تیزی کے ساتھ فسادات بھی رونما ہوں گے۔ انگریزوں کے زمانے سے شروع ہو کر فرقہ واریت کو یہاں تک پہنچنے میں بہت طویل عرصہ نہیں گزرا ہے۔ اس عرصے کے دوران فرقہ واریت نے جو کرب ناک مناظر دکھائے ہیں وہ سبق آموز بھی ہیں اور محرک فکر بھی۔ انگریزوں نے ہندو مسلم میں جو نفرت، بغض اور عناد کی صورت پیدا کی تھی اس کو جڑ سے مٹانے کے لیے ایک بڑی طاقت کی ضرورت ہے، جو صرف فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں پوشیدہ ہے۔ فسادات کی وجہ سے کئی بستیاں ویران ہو گئیں، خوف و دہشت کی صورت حال پیدا ہو گئی، خون کی ندیاں بہہ گئیں، ہر طرف شور شرابہ، خون خرابا اور ویرانیوں نے انسانی ذہن کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ انسانوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانوروں کی طرح ہانکا جا رہا تھا۔ نڈا فاضلی نے فسادات سے پیدا شدہ مسائل کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں چند ایک اشعار درج کیے جاتے ہیں:

کہاں چراغ جلائیں، کہاں گلاب رکھیں
چھتیں تو ملتی ہیں لیکن مکاں نہیں ملتا

سلگتا شہر، ندی، خون کب کی باتیں ہیں
کہیں کہیں سے یہ قصہ سنا سنا ہے

کوئی دھماکا، کوئی چیخ، کوئی ہنگامہ
لہو بدن کا لہو کی شباہتیں مانگے

آسمان، کھیت، سمندر سب لال
خون کاغذ پہ اگا تھا پہلے

تقسیم ملک کے کچھ ہی برسوں کے بعد فسادات کے پیش نظر نڈا فاضلی کا خاندان پاکستان منتقل ہو گیا۔ مگر انھوں نے (نڈا فاضلی) پاکستان جانے کے بجائے ہندوستان میں رہنے کو ترجیح دیا۔ ان کا ماننا تھا کہ

زمین کی تبدیلی مسائل کا حل نہیں تھا۔ ان کا نظریہ تھا کہ ہمارے مسائل اسی وقت دور ہو سکتے ہیں جب ہم اس متزلزل معاشرے میں رہ کر اپنی کاوشوں سے ان مسائل کا حل تلاش کریں گے۔ اس کم عمری میں فسادات کے حل سے متعلق گہری فکر ان کی دوراندیشی اور ذہانت کا پتہ دیتی ہے۔ فسادات کی وجہ سے انسان پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا ہے اور ہر طرف گلی کوچوں کو سنسان کر دیا گیا ہے۔ عورتوں کی عصمت دری کی گئی، معصوم بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا اور سارے شہر کو خوف و دہشت کا منظر بنا دیا گیا۔ نڈا فاضلی نے اس صورتِ حال کو اپنے اشعار کے ذریعے یوں پیش کیا ہے:

جو مرا کیوں مرا، جو لٹا کیوں لٹا، جو جلا کیوں جلا
مدتوں سے ہیں گم ان سوالوں کے حل جو ہوا سو ہوا

تمہارا گھر بھی اسی شہر کے حصار میں ہے
لگی ہے آگ کہاں، کیوں؟ پتہ کیا جائے

اچھے برے کے فرق نے بستی اُجاڑ دی
مجبور ہو کے ملنے لگے ہر کسی سے ہم

آوازیں ہی آوازیں، اجالے ہی اجالے
مجھ سے یہاں لاکھوں ہیں کوئی مار نہ ڈالے

مذکورہ بالا اشعار میں نڈا فاضلی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ابھی تک ان سوالوں کے جواب نہیں ڈھونڈ پائے ہیں کہ بے گناہ انسانوں کو کیوں مارا جاتا ہے؟ انسان کی پریشانی کو کس طرح دور کیا جاسکتا ہے؟ نڈا فاضلی نے بھی زندگی کی بڑی سے بڑی صعوبتیں برداشت کیں لیکن زندگی سے کبھی ہار نہیں مانی۔ وہ زندگی کے نامساعد حالات سے دل برداشتہ ضرور ہوتے ہیں لیکن مایوس ہرگز نہیں ہوتے۔ ان کا ماننا ہے کہ جب تک ہندو مسلم میں اتحاد و اتفاق قائم نہیں ہوگا، فسادات ہوتے رہیں گے۔ اس لیے انھوں نے اپنی شاعری میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر زور دیا ہے۔

مشترکہ تہذیب اقومی یکجہتی:

ہندستان ابتدا ہی سے آپسی محبت، اخوت، رواداری، بھائی چارگی اور تہذیبی ہم آہنگی کے لیے جانا جاتا ہے۔ ہندستان میں مختلف مذاہب اور تہذیبوں کو پھلنے اور پھولنے کا موقع ملتا ہے۔ مختلف قومیں یہاں آئیں اور بستی چلی گئیں۔ ان قوموں نے اپنے ساتھ اپنی تہذیب بھی لائی۔ اس طرح سے معاشرتی، تہذیبی اور لسانی روابط کا آغاز ہوا۔ غرض ان روابط سے ایک نئے ہندستان اور ایک نئی تہذیب کا جنم ہوا جس کو ہم مشترکہ تہذیب کہتے ہیں۔ اردو زبان چوں کہ رابطے کی زبان تھی اس لیے اسے مشترکہ تہذیب کا ترجمان کہا جاتا ہے۔ اس مشترکہ تہذیب کو پروان چڑھانے میں عوامی روایات، مذہبی رسومات، تہوار، ناک اور لوک گیتوں کا اہم کردار رہا ہے۔ ان رسومات میں ہندو مسلم اور دیگر قوموں کے لوگ بغیر کسی تفریق کے شریک ہوتے تھے۔ اردو شعرا نے مشترکہ تہذیب کی علامت کو اجاگر کرنے میں اہم اور قابلِ اعتنا رول ادا کیا ہے۔ اردو شاعری نے اتحاد، بھائی چارگی، اخوت، مساویانہ حقوق، میل جول اور اپنے پن کے احساس کو نمایاں کرنے میں معاون کردار ادا کیا ہے۔ ندافاضلی عہدِ حاضر کے مقبول و معروف شاعر ہیں۔ وہ عصری دور کے ایسے فن کار تھے جن کی تخلیقات میں ہندستانی مشترکہ تہذیب موجِ دریا کی مانند رواں دواں ہے۔ ہندستانی مٹی کی بوباس اور اس کی خوشبو کی مہک ان کی شاعری میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس ضمن میں وسیم بیگم اپنے مضمون ”ندافاضلی اور ہندستانی مشترکہ تہذیب“ میں لکھتی ہیں:

”گوالیار کی یادیں، وہاں کی تہذیب، بمبئی کی بھاگتی دوڑتی زندگی اور وہاں کی نفسا نفسی، اس کے علاوہ تلاش و معاش میں دلی کی گلیوں میں گھومنا، مجبوراً خانقاہوں اور مسجدوں میں پناہ تلاش کرنا، صبح سے شام تک روزگار کی تلاش میں بھوکے پیاسے رہنا اور دوسرے لوگوں کے ہاتھوں بلیک میل ہونا۔ یہ تمام حالات و واقعات اس طرح قلم بند کیے گئے ہیں جس سے اس دور کی ہندستانی تہذیب اور تمدن ہمارے سامنے آ جاتا

ہے۔“ 6

ندافاضلی کی شاعری ان کی نثر کی طرح ہندستانی مشترکہ تہذیب کی غماز ہے۔ انھوں نے اردو غزل کو ہندستانی مشترکہ تہذیب و تمدن میں اس طرح ڈھالا ہے کہ وہ ہندستانی سرزمین کا حصہ بن گئی ہے۔ اس کو یہاں کی جڑوں سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ ندافاضلی اپنے معاصرین میں اس لیے منفرد ہیں کہ

انھوں نے ہندوستانی تہذیب، وحدانیت، بھگتی اور تصوف کے فکری عناصر کو اپنی ذات میں سمولیا تھا۔ وہ مذہبی منافرت، فرقہ بندی اور دہشت گردی کے شدید مخالف تھے۔ ان کے ادبی فکر و نظر میں قدیم روایات، تاریخ، ثقافت اور تہذیب کی یکجائی کی صورتیں بہت واضح نظر آتی ہیں۔ ان کے نزدیک ہندو مسلم برابر ہیں۔ رحمن، رام، کرشن کنہیا میں کوئی فرق نہیں۔ وہ سب کا نام ایک ساتھ لیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مندروں میں بھجن، مسجدوں میں اداں آدمی ہے کہاں
آدمی کے لیے ایک تازہ غزل جو ہوا سو ہوا

بندرا بن کے کرشن کنہیا اللہ ہو
بنسی، رادھا، گیتا، گیا اللہ ہو

مولویوں کا سجدہ، پنڈت کی پوجا
مزدوروں کی ہیا ہیا اللہ ہو

نڈافاضلی کی شاعری کا خمیر ہندوستان کی مٹی سے اٹھا ہے۔ وہ کبیر اور میرا کے نقش قدم پر چلنے والے شاعر ہیں۔ انھوں نے انسان کے وقار کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا۔ حق و صداقت کا پرچم بلند کرنا ان کا شیوہ بن گیا تھا۔ انھوں نے اپنے جذبات و احساسات اور تجربات و مشاہدات کو بڑی بے باکی اور غیر جانبداری سے پیش کیا۔ انھوں نے اپنے افکار و خیالات سے جمود کا طلسم توڑ کر ایک نیا جہاں آباد کیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے انسانیت کا پیغام دیا۔ وہ ہندو مسلم میں ایکتا کے خواہش مند تھے:

ایک ہی دھرتی ہم سب کا گھر جتنا تیرا اتنا میرا
سکھ دکھ کا یہ جنتر منتر جتنا تیرا اتنا میرا

کبھی ایک دوسرے کے دکھ میں سکھ میں روتے ہنستے تھے
کبھی تھے ایک گھر کے چاند سورج ندیاں اور ہم

درختوں کو ہرا رکھنے کے ذمہ دار تھے دونوں
جو سچ پوچھو برابر کے ہیں مجرم باغباں اور ہم

مذکورہ بالا اشعار میں نڈا فاضلی نے اس بات کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ یہ دھرتی ایک گھر کی طرح ہے جس میں سب مل جل کر رہتے ہیں۔ اس دھرتی کی تہذیب ایسی تھی کہ اگر ہندو پریشانی میں مبتلا ہوتا تو مسلمان اس کی پریشانی کو دور کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی طرح جب مسلمان دکھ درد سے دوچار ہوتا تھا تو ہندو اس کے دکھ درد میں شریک ہو جاتا تھا۔ دونوں میں اتحاد و اتفاق اور بھائی چارہ ہوا کرتا تھا۔ دورِ حاضر میں ہندو مسلم ایکتا کی سخت ضرورت ہے کیوں کہ اس ملک میں ہندو مسلم ہمیشہ ایک ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ آج اس ملی جلی تہذیب کو خطرہ لاحق ہے۔ اس تہذیب کو یا یوں کہیے کہ اس ایکتا کو مٹانے کی سازش کی جا رہی ہے جس سے پوری قوم کے ساتھ ساتھ پوری انسانیت خطرے میں آگئی ہے۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اپنے اپنے ناموں اور دھرموں کی وجہ سے تو پہچان میں آتے ہیں لیکن ان کے اندر انسانیت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ نڈا فاضلی اس حوالے سے کہتے ہیں:

کوئی ہندو کوئی مسلم کوئی عیسائی ہے
سب نے انسان نہ بننے کی قسم کھائی ہے

آج کے بے حس اور بد ذوقی کے ماحول کو دیکھ کر نڈا فاضلی نے نہ صرف شعر کہے بلکہ آنسو بہائے ہیں۔ وہ انسانیت کے سچے علمبردار تھے۔ ان کی شاعری موضوعات، اسلوب، ڈکشن، لب و لہجہ اور منظر و ماحول کے لحاظ سے ہندو آریائی ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے پیغام دیتے ہیں کہ مل جل کر رہنے میں عافیت ہے۔

دکھ میں نیر بہا دیتے تھے سکھ میں ہنسنے لگتے تھے
سیدھے سادے لوگ تھے لیکن کتنے پیارے لگتے تھے

نفرت چڑھتی آندھی جیسی پیار ابلتے چشموں سا
بیری ہوں یا سنگی ساتھی سارے اپنے لگتے تھے

ندیاں پر بت چاند نگاہیں مالا ایک کئی دانے
چھوٹے چھوٹے سے آنگن بھی کوسوں پھیلے لگتے تھے

درج بالا اشعار میں دکھ، نیر، بیری، سنگی، ندیاں، پر بت، چشمے، چاند، آنگن، مالا وغیرہ محض الفاظ نہیں

بلکہ ہندوستانی تہذیب کا آئینہ ہیں۔

الغرض نذافاضلی نے اپنی سرزمین کے صدیوں پرانے تمدن، تہذیب اور روایات کی نئی تفہیم کی ہے۔ انھوں نے اساطیر کو تخلیقی سطح پر برتنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ان کی شاعری اور فکر کا محور پیار، محبت، اخوت، بھائی چارہ، ملنساری اور یکجہتی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ہندوستان کی صدیوں پرانی گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دیا ہے۔

یادِ ماضی:

یادوں سے نذافاضلی کا گہرا تعلق رہا ہے۔ انھیں اپنے ماضی سے بے حد محبت تھی۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں یادوں کو دل چسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ یہی یادیں انھیں غم میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ جب وہ اپنے سماج پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں ہر طرف نفرت، بغض اور فتنہ فساد دکھائی دیتا ہے۔ وہ ماضی کی یادوں کو تازہ کر کے مایوس ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں چند ایک اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

ہم کو بھی یاد تھیں کئی رنگین کہانیاں
پتھر بنا دیے گئے خاموش ہو گئے

جن میں کھو جانے کا خدشہ تھا بہت
ہم نہ کھوئے وہ میلے کھو گئے

وہ تم نہیں ہو تو پھر کون تھا وہ تم جیسا
کسی کا ذکر تو تھا ہر کتاب میں شامل

مذکورہ بالا اشعار سے واضح ہو جاتا ہے کہ نذافاضلی اپنے ماضی کو یاد کر کے افسردہ ہو جاتے تھے۔ یہ افسردگی اس وقت زیادہ محسوس ہوئی جب ان کا خاندان ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان چلا گیا۔ انھیں اس بات کا بہ خوبی احساس تھا کہ ہم اپنے ماضی اور اسلاف کے عقیدوں سے بہت دور نکل چکے ہیں اور جو روایت ہمیں وراثت میں ملی تھی ہم اس سے کوسوں دور ہو گئے ہیں۔ وہ انسان کی آرزوؤں اور تمناؤں کو ضبط و فشار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی دبی ہوئی یادوں کو بڑے سلیقے سے شعری پیکر عطا کرتے ہیں۔ وہ

حساس زیادہ تھے اس لیے ان کی روح کا اضطراب کبھی کبھی شدت کے ساتھ سامنے آتا ہے، کبھی جذباتی ہو جاتے ہیں لیکن انھوں نے اپنے بے باک لہجے کو کبھی بے آبرو نہیں ہونے دیا۔ آخری عمر میں وہ کسی سے گلہ شکوہ نہیں کرتے تھے کیوں کہ وقت نے انھیں اس مقام پر لا کھڑا کر دیا تھا کہ انھیں خوشی و غم میں فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے انھوں نے کہا تھا:

اب کسی سے کوئی شکایت نہ رہی
جانے کس کس سے گلہ تھا پہلے

گزرتے وقت نے دھندلا دیے سبھی چہرے
خوشی خوشی ہے نہ غم غم ہے کیا کیا جائے
نہدافاضلی کی شاعری میں ان کے بچپن کی یادوں کا کرب نظر آتا ہے۔ یہی یادیں ان کی شاعری کی اساس بنیں اور ان کی شاعری میں پختگی آگئی۔ اپنوں سے نکھڑ جانے کا احساس ان کی شاعری کا متحرک پہلو ہے۔ اس سلسلے میں احمد سہیل اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

”نہدافاضلی کی شاعری میں ان کی بچپن کی یادوں کا پس کر بیہ (نا سٹیلیا)
چھپا ہوا ہے۔ لگتا ہے کہ معاشرتی حجت کے لیے ان سے زبردستی ان کا
ہاتھ چھڑا کر دور چلا گیا ہے۔ بیتے دنوں کی یادیں ان کی شاعری کی
اساس ہیں۔“ 7

نہدافاضلی کی غزلیہ شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ماضی کو یاد کر کے روتے نہیں لیکن مایوس ضرور ہو جاتے تھے۔ کئی بار لوگ ماضی کی خوش حالی کا حال کی تنگ دامنی سے موازنہ کر کے بھی روتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے مستقبل کی فکر کم اور ماضی کا ذکر زیادہ کرتا ہے۔ اسے اپنے ہر گز رے ہوئے لمحے کی یاد بے چین و بے قرار رکھتی ہے۔ نہدافاضلی جب اپنے ماضی کو یاد کرتے تو انھیں یہ بڑا پرسکون نظر آتا تھا۔

امید / حوصلہ:

اُمید پر دنیا قائم ہے اور نا اُمیدی کفر ہے۔ اُمید ہی کے سہارے انسان سخت سے سخت تکالیف

برداشت کر سکتا ہے۔ امید ہی کے سہارے ہماری زندگی چلتی ہے۔ سب کچھ ہاتھ سے چلے جانے کے بعد امید ہی ہمارا ساتھ دیتی ہے اور ہمارا حوصلہ بڑھاتی ہے۔ انسانی زندگی کا ہر عمل کسی امید اور کسی نتیجہ خیزی کی توقع کے تحت ہی انجام پاتا ہے۔ دراصل امید اعتماد کے ساتھ توقع کا نام ہے۔ نڈا فاضلی کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُمید ان کی شاعری کا ایک اہم پہلو ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں امید سے انسان کے حوصلے بلند کیے۔ ان کا ماننا تھا کہ حالات ہمیشہ ناموزوں نہیں رہیں گے بلکہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب حالات سازگار ہو جائیں گے۔ اگر آج غم ہے تو کل خوشی آئے گی:

رات کے بعد نئے دن کی سحر آئے گی

دن نہیں بدلے گا تاریخ بدل جائے گی

نڈا فاضلی کی غزلیں قنوطیت کے منفی پہلو سے بالاتر ہو کر رجائیت کے مثبت میلان کی غماز ہیں۔ اسی لیے ان کے اشعار ناامیدی میں بھی امید کی کرن بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی شاعری دراصل ان کی زندگی کے تجربات و مشاہدات کا آئینہ ہیں۔ ان کی شاعری میں ناامیدی کی کیفیت نہیں ملتی بلکہ زندگی گزارنے کا ایک ایسا طرز ملتا ہے جو عام آدمی کو بھی نامساعد حالات میں جینے کا حوصلہ اور سلیقہ عطا کرتا ہے۔ انھوں نے اپنی ایک مشہور غزل میں اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:

سفر میں دھوپ تو ہوگی جو چل سکو تو چلو

سبھی ہیں بھیڑ میں تم بھی نکل سکو تو چلو

کسی کے واسطے راہیں کہاں بدلتی ہیں

تم اپنے آپ کو خود ہی بدل سکو تو چلو

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا

مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

کہیں نہیں کوئی سورج دھواں دھواں ہے فضا

خود اپنے آپ سے باہر نکل سکو تو چلو

یہی ہے زندگی کچھ خواب چند امیدیں
انہی کھلونوں سے تم بھی بہل سکو تو چلو

مذکورہ بالا اشعار میں نذافاضلی نے زندگی کے ان تلخ حقائق کی طرف اشارے کیے ہیں، جن کا سامنا ہر انسان کو کسی نہ کسی موڑ پر کرنا پڑتا ہے۔ کڑی دھوپ اور کھلا آسمان تو سب کے لیے ہے مگر اسی بھٹڑ میں جگہ بنانے کے لیے سخت حالات سے مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ راہیں کسی بھی انسان کے لیے نہیں بدلتیں بلکہ راہوں کا تعین خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس غزل کے تیسرے شعر میں نذافاضلی نے خود غرضی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جہاں ایک آدمی دوسرے آدمی کی رہنمائی نہیں کرتا بلکہ اپنے ساتھی کو گرا کر خود آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ چوتھے شعر میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ جب تک انسان اپنے اندر کے خول میں قید رہے گا اس کے پاس سورج کی روشنی بھی نہیں پہنچے گی اور پوری فضا اس کے لیے دھواں دھواں رہے گی۔ اس غزل کا آخری شعر دراصل پوری غزل کا نچوڑ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں کچھ خواب دیکھتا ہے اور پھر ان کی تعبیر چاہتا ہے۔ اسی امید پر وہ پوری زندگی گزارتا ہے کہ کبھی نہ کبھی اس کے خواب پورے ہوں گے۔ اس کی امیدیں برائیاں گی۔ یہی امید اس کی زندگی کے کھلونے ہوتے ہیں جن سے کھیلتے ہوئے وہ اپنی زندگی گزار دیتا ہے۔

نذافاضلی اپنی شاعری سے کچھ ایسا دانشمندانہ سمجھوتا کرتے ہیں کہ احساس اور فکر پر جینے کا ایک نیا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک اہم پہلو ان کی مثبت سوچ (Positive Thinking) ہے جو ان کی شاعری کو موثر اور جاندار بناتی ہے۔ عصر حاضر میں یوں تو آدمی خود اپنی ذات کے حصار میں قید ہے لیکن نذافاضلی کو یقین ہے کہ یہ صورت حال ہمیشہ نہیں رہے گی۔ حالات ایک دن ضرور بدلیں گے اور ہواؤں کا رخ تبدیل ہوگا۔ اسی مثبت سوچ کو لے کر وہ نئے چراغ جلانے اور پھر سے آشیاں بنانے کے عمل میں جڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعے مشورہ بھی دیتے ہیں اور حوصلہ شکنی بھی کرتے ہیں:

اب وقت بچا ہے کتنا جو اور لڑیں دنیا سے
دنیا کی نصیحت پر بھی تھوڑا سا عمل کر دیکھیں

صرف آنکھوں سے ہی دنیا نہیں دیکھی جاتی
دل کی دھڑکن کو بھی بینائی بنا کر دیکھو

یقین چاند پہ سورج میں اعتبار بھی رکھ
مگر نگاہ میں تھوڑا سا انتظار بھی رکھ

سکھا دیتی ہیں چلنا ٹھوکریں بھی راہ گیروں کو
کوئی رستہ سدا دشوار ہو ایسا نہیں ہوتا

کام جو دشوار ہے وہ ہوگا آساں غم نہ کھا
آدمی کے خول سے نکلے گا انساں غم نہ کھا

ندافاضلی کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب ان کے تمام عزیز واقارب ہندستان کو خیر باد کہہ کر پاکستان چلے گئے۔ ان حالات میں بھی انھوں نے اپنے ہی ملک میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اپنے بزرگوں کی محفوظ سرپرستی کو رد کرنا اور ایک ایسے راستے پر چلنے کا ارادہ کرنا جو تمام عمر کی تنہائیوں کے ساتھ کسی خطرے سے خالی نہ تھا، یہ بڑے حوصلے کی بات ہے۔ انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری میں نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اسی حوصلہ افزائی سے ان میں مثبت سوچ پیدا ہوتی ہے۔ بلند جذبات و سوچ کے مالک افراد ہی زندگی کی کامیابیوں کو آسانی سے چھو سکتے ہیں کیوں کہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے جذبات کے راستے اگر ہواروکنے لگے تو وہ طوفان بن کر ڈٹ جاتے ہیں۔ یہی پیغام ندافاضلی کی شاعری میں واضح نظر آتا ہے۔

تنہائی/مایوسی:

تنہائی ایک پیچیدہ اور ناخوش گوار جذباتی ردِ عمل ہے جو سماجی اکیلے پن کی وجہ سے ابھرتا ہے۔ آج کی مصروف دنیا میں تنہائی ایک ٹریجڈی بن گئی ہے۔ اب حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ انسانوں کی بے تحاشا بھیڑ میں بھی انسان خود کو تنہا اور اکیلا محسوس کرتا ہے۔ اپنوں کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بھی اس کو فرصت نہیں اور نہ ہی ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کی مہلت ہے۔ زندگی میں سکون نہیں، ٹھہراؤ نہیں اور ثبات کا احساس بھی نہیں ہے۔ یہ سب جدید دور کی دین ہیں۔ اخلاقی قدریں پامال ہو رہی ہیں۔ سماجی و تہذیبی صداقتوں کی دیواریں کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ تنہائی، بیگانگی اور اکیلا پن سماج و معاشرے کی صداقت بنتی

جارہی ہیں۔ یہ تنہائی، بیگانگی اور اکیلا پن صرف خارجی ہی نہیں بلکہ داخلی جذبات کو بھی محیط ہے۔ نذا فاضلی نے اس ہجوم بیکراں میں انسان کی تنہائی اور مایوسی کے کرب کو اپنی غزلیہ شاعری میں یوں بیان کیا ہے:

ہر طرف ہر جگہ بے شمار آدمی
پھر بھی تنہائیوں کا شکار آدمی

دیوار و در سے اتر کر پرچھائیاں بولتی ہیں
کوئی نہیں بولتا جب تنہائیاں بولتی ہیں

پھر یوں ہوا کہ وقت کا پانسا پلٹ گیا
امید جیت کی تھی مگر مات ہو گئی

ایک محفل میں کئی محفلیں ہوتی ہیں شریک
جس کو بھی پاس سے دیکھو گے اکیلا ہوگا

متذکرہ بالا اشعار میں تنہائی، مایوسی اور بیگانگی کا کرب محسوس کیا جاسکتا ہے۔ آج کے انسان کے نفسیاتی تجربوں میں ہم اپنی زندگی اور ذہن کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ ہر ایک کے ساتھ قربت اختیار نہیں کی جاسکتی۔ ایسی صورت میں انسان دوسروں کے درمیان رہتے ہوئے بھی تنہائی کے لمحات سے گزرتا ہے۔ وہ قریب ہوتے ہوئے بھی دور ہوتا ہے اور دور ہوتے ہوئے بھی قریبی رشتہ رکھنے پر مجبور دکھائی دیتا ہے۔ نذا فاضلی نے اپنے ایک شعر میں اس صورت حال کو یوں پیش کیا ہے:

کچھ لوگ یونہی شہر میں ہم سے بھی خفا ہیں
ہر ایک سے اپنی بھی طبیعت نہیں ملتی

نذا فاضلی کی شاعری میں گمشدگی، تنہائی اور اجنبیت کا احساس شدت سے پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے پہلے شعری مجموعے (لفظوں کا پل) کے پیش لفظ ”حرفِ اول“ میں لکھتے ہیں:

”65 کی بات ہے، میں بھوپال سے گوالیار واپس آیا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ میں حسبِ معمول، اٹپچی ہاتھ میں لیے، اس برسوں کی جانی پہچانی گلی میں مڑ گیا، جہاں املی کی گھنی چھاؤں تلے میرا گھر تھا۔ میں نے گلی میں

گھستے ہوئے تو اپنے آپ کو دیکھا تھا، دروازہ کھٹکھٹانے تک بھی میں
اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا۔ اٹچی ہاتھ
میں لیے جو سر جھکائے واپس آیا تھا، وہ میں نہیں تھا، کوئی اور تھا۔ مجھ جیسا
ہی۔۔۔۔۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔“ 8

یہی تنہائی، اجنبیت اور گمشدگی کا احساس ان کی غزلیہ شاعری میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس
حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مایوسی، ناکامی، خوف و ہراس اور خود شکستگی جیسے عناصر عصر حاضر کی
غزل میں شامل ہیں۔ یہی عناصر نذرفاضلی کی غزلوں میں اپنا کردار بہ خوبی ادا کر رہے ہیں۔ اس مناسبت
سے ان کے چند ایک اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

بھٹک رہا ہوں لیے تشنگی سمندر کی
مگر نصیب میں شبنم ہے کیا کیا جائے

ملی ہے زخموں کی سوغات جس کی محفل سے
اسی کے ہاتھ میں مرہم ہے کیا کیا جائے
ان اشعار میں انسان کا شخصی کرب نظر آتا ہے۔ آج کی مسابقتی زندگی اور شہروں میں گم ہوتے
ہوئے اخلاقی اقدار کو نذرفاضلی نے شعری زبان عطا کی ہے۔ تنہائی کا احساس انسان کو کہاں کہاں بھٹکنے پر مجبور
کرتا ہے اور اس عالم تنہائی میں انسان کن کن دکھوں کو جھیلتا ہے، اس کیفیت کا اظہار ان کی غزلیہ شاعری میں
ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں تنہائی اور درد کا جو کرب ملتا ہے۔ وہ ان کی زندگی کا ایک ایسا حصہ ہے جو ابتدا سے
ان کے ساتھ رہا۔ تنہائی انسان کو کس کس انداز سے سوچنے پر مجبور کرتی ہے، اس کا ادراک ان کی شاعری سے
بہ خوبی ہوتا ہے۔ انھوں نے تنہائی کا کرب برداشت کرتے ہوئے اس کرب کو سیدھے سادے الفاظ میں پیش
کیا۔ تنہائی کی کرب ناکی کا اندازہ لگانے کے لیے ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بھیڑ سے کٹ کے نہ بیٹھا کرو تنہائی میں
بے خیالی میں کئی شہر اجڑ جاتے ہیں

یہ کائنات کا پھیلاؤ تو بہت کم ہے
جہاں سما سکے تنہائی وہ مکان بھی دے

یہ کیا عذاب ہے سب اپنے آپ میں گم ہیں
زباں ملی ہے مگر ہم زباں نہیں ملتا

نَدافاضلی کی غزلیہ شاعری کا بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ آج کا انسان اپنے آپ میں گم ہو چکا ہے۔ وہ اپنی مشینی زندگی میں ابن الوقت بن چکا ہے۔ اسے اپنے ہمسایوں سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اپنے آپ میں اس حد تک گم ہو گیا ہے کہ اسے اپنے علاوہ کسی کی فکر نہیں، کسی کا خیال نہیں ہے۔ نَدافاضلی کا اپنے وطن میں نہ کوئی اپنا تھا، نہ کوئی عزیز تھا اور نہ ہی کوئی رشتے دار۔ والدین کی ہجرت کے بعد وہ اپنے وطن میں بالکل تنہا رہ گئے تھے۔ تنہائی صرف ان کا ہی مقدر نہیں تھی بلکہ ملک کے باقی افراد بھی تنہائی کے کرب سے جو جھ رہے تھے۔ نَدافاضلی کی تنہائی فرد اور سماج کے ٹکراؤ اور کشمکش کی شکل اختیار کرتی ہے جس کی جھلک ان کی غزلیہ شاعری میں نظر آتی ہے۔

دنیا کی بے ثباتی:

کائنات میں تبدیلی ایک حقیقت ہے لیکن اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ تبدیلی بھی تبدیل ہوتی ہے۔ اس فکر کو علامہ اقبال نے یوں پیش کیا ہے:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

دنیا کی ہر شے فنا ہونے والی ہے۔ نَدافاضلی نے اپنی شاعری میں انسان کی غفلت، بے توقیری، دنیا کی بے ثباتی اور فانی ہونے کے احساس کو بیان کیا ہے۔ انسان چوں کہ اشرف المخلوقات ہے اور یہ کائنات انسان کے لیے ہی بنائی گئی ہے۔ جہاں ایک طرف اس دنیا کے وجود کا ایک خاص مقصد ہے وہیں دوسری جانب انسانوں کے لیے یہ دنیا محض سیر و تفریح کی جگہ نہیں بلکہ دارالعمل ہے۔ ایک مختصر یا خاص مدت کے لیے انسان اس دنیا میں آتا ہے اور اپنے فرائض اور اعمال سے اپنی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ وہ جو کچھ اچھا یا برا کام انجام دیتا ہے، اس کی بنیاد پر اسے سزا اور جزا ملے گی۔ ہر فرض شناس انسان اس اہم نکتے سے بہ خوبی واقف ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہر عمل کا محاسبہ بھی کرتا ہے۔ بیشتر انسان ایسے بھی ہیں جو اس اہم نکتے سے غافل ہیں۔ وہ

دنیا کو محض تفریح گاہ یا ہمیشہ رہنے کی جگہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ نذافاضلی نے اس دنیا کو جادو کا کھلونا کہا ہے۔

دنیا جسے کہتے ہیں جادو کا کھلونا ہے

مل جائے تو مٹی ہے کھو جائے تو سونا ہے

موت انسانی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ نذافاضلی اپنے اشعار میں دنیا کے مٹ جانے کا

ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان دنیا میں آکر اپنے اصل مقصد سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ انسان کو اس

کے فرض اور ذمے داریوں سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ کائنات اور انسان کی تخلیق

کا جو خاص مقصد ہے، اسے ہر انسان کو نہ صرف سمجھنا چاہیے بلکہ صحیح طور پر عمل پیرا ہو کر زندگی گزارنی چاہیے۔

اسی عمل سے وہ کامیابی سے ہم کنار ہوگا۔

دو دروازے ایک حویلی آمد رخصت ایک پہیلی

کوئی جا کر آنے کو ہے کوئی آکر جانے کو ہے

بادباں باندھ کے کشتی کو کنارے پہ رکھو

اک نہ اک روز تو ہونا ہے روانہ صاحب

چلتا جاتا ہے کاروانِ حیات

ابتدا کیا ہے انتہا کیا ہے

کاروانِ حیات کی ابتدا زندگی ہے اور موت اس کی انتہا ہے۔ یہ دنیا سرائے فانی ہے۔ ایک دن ہم

سب کو یہاں سے رخصت ہونا ہے۔ انسانی زندگی وقتی اور عارضی ہے۔ نذافاضلی نے اپنی غزلیہ شاعری کے

ذریعے انسانی زندگی کی حقیقت، فلسفہ حیات، نظام کائنات اور دنیا کی بے ثباتی پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کا

کہنا ہے کہ زندگی کی حقیقت ہم پر اس وقت واضح ہو جاتی ہے جب دنیا سے جانے کا وقت قریب آ جاتا ہے۔

موت کے نزدیک سب برابر ہیں۔ جس طرح شمع جلتی ہے، جلنے کے ساتھ پکھلتی ہے اور جلد ہی ختم ہو جاتی

ہے، ٹھیک یہی معاملہ انسان کا ہے۔ وہ بھی چند گھڑیاں گزار کر یہاں سے چلا جاتا ہے۔ اس ضمن میں چند ایک

اشعار پیش خدمت ہیں:

چند گھڑیوں کی نمائش ہے مراتب کی قطار

پھر سبھی مٹی میں مٹی ہیں قضا کے سامنے

بتائیں کیا کہاں سے ہیں کہاں تک

زمین پر وقت ہے جہاں سے جہاں تک

درج بالا اشعار میں دنیا کے فانی ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ نڈافاضلی اپنے اشعار کے ذریعے قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ اس بات سے بہ خوبی واقف تھے کہ دنیا میں انسان کے پاس جو دھن دولت اور عیش و عشرت ہے، سب کچھ یہیں چھوڑنا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے۔ کبھی کبھی یہ مصروفیت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ موت کے کتنے نزدیک ہے۔ دنیا راہ فنا میں کسی کا ساتھ نہیں دیتی۔ چاہے کوئی بڑا ہو یا چھوٹا ہو، بہادر ہو یا بزدل ہو، امیر ہو یا غریب ہو، غرض سب کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ دنیا میں کتنے بڑے بڑے بادشاہ اور دولت مند گزرے ہیں لیکن آج ان کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ گورکن جو دوسروں کے لیے قبریں کھودتا ہے۔ وہ بھی اپنے کام میں اتنا مصروف ہو جاتا ہے کہ جیسے اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔ حالاں کہ وہ بھی قضا کی قطار میں کھڑا ہے لیکن اسے اس بات کا احساس ہی نہیں ہے۔ اس مضمون کو نڈافاضلی نے اپنے ایک شعر میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ برتا ہے:

مصروف گورکن کو بھی شاید پتہ نہیں

وہ خود کھڑا ہوا ہے قضا کی قطار میں

اس شعر میں نڈافاضلی نے زندگی کی ایک تلخ حقیقت کو بیان کیا ہے۔ انھیں آخرت کی فکر اداس کرتی ہے۔ یہ دنیا تو ختم ہونے والی ہے لیکن وہ جہاں لافانی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا:

اس کی جستجو اکثر اداس کرتی ہے

وہ اک جہاں جو ہے ہر جہاں سے باہر

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی آرزو میں انسان نہ صرف اپنے ایمان کو خراب کرتا ہے بلکہ اپنی آخرت کو بھی برباد کر دیتا ہے۔ وہ یہ سب اس لیے کرتا ہے کہ اس کی عقل پر غفلت طاری ہوتی ہے۔ اس کی نظر صرف اپنے مال و دولت پر رہتی ہے۔ جس مال و دولت کے لیے وہ اپنی عاقبت بگاڑ دیتا ہے، اس کو یہیں چھوڑ کے جانا ہے۔ نڈافاضلی کی شاعری انسان کو خواب غفلت سے بیدار ہونے پر زور دیتی ہے۔

مذہبی مسائل:

انسان کا مذہب سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ مذہب انسان کو زندگی جینے کے آداب سکھاتا ہے۔ نیز اچھائی اور برائی میں تمیز کرنا بھی سکھاتا ہے۔ نڈا فاضلی کا موقف یہ ہے کہ مذہب کی غلط تعبیروں اور سیاست دانوں کی غلط کاریوں نے انسانوں میں دوریاں پھیلائی ہیں اور نفرت و عداوت کو ہوا دی ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ وہ سیکولرزم (Secularism) کے دلدہا تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ مذہبی لوگ جو اپنے آپ کو خدا پرست کہتے ہیں۔ ان سے اچھے تو وہ لوگ ہیں جو کسی مذہب کو نہیں مانتے لیکن ان کا دل کدورت سے پاک اور نفرت سے دور ہے۔ نیز ان کے دل میں بغض و حسد کے جذبات نہیں ہیں۔

اتنی خوں خوار نہ تھیں پہلے عبادت گاہیں
یہ عقیدے ہیں کہ انسان کی تنہائی ہے

مسماں ہو رہی ہیں دلوں کی عمارتیں
اللہ کے گھروں کی حفاظت نہیں رہی

سب اپنی اپنی موت سے مرتے ہیں ان دنوں
اب دشتِ کربلا میں شہادت نہیں رہی

اب حقیقت بدل چکی ہے اور مذہبی روایات ماضی میں کہیں گم ہو گئی ہیں۔ آج جس طرح سے مذہب کے نام پر مندر اور مسجد کا جھگڑا کھڑا کیا جاتا ہے، اس کو روکنے کی کوئی مناسب کوشش نہیں ہو پا رہی ہے۔ حالات نے کچھ کا کچھ رخ اختیار کیا ہے۔ اب کربلا کے وہ معنی نہیں رہے کہ وہ حق و باطل کی کشمکش کا نشان ہے اور شہادت جیسے بڑے مقصد کے لیے جان دینا انسان کی بہت بڑی خوبی ہے، بلکہ اتنا سوچ لیا گیا ہے کہ اب سب اپنی اپنی موت سے مرتے ہیں۔ یہ بیزاری اور بے تعلقی کا ایک رویہ ہے جو مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔

نڈا فاضلی کے تفکر میں اسلامی تصوف اور ہندوستانی بھکتی کے دھارے ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک ہمہ گیر انسانی اخلاقیات کی تشکیل کرتے ہیں۔ میرا کہ بھجوں سے انھیں تحریک ملتی ہے۔ کبیر کی طرح

ہندومت اور اسلام کی انسان دوست روایات سے یکساں طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ انہی کی طرح مذہبی رسوم و رواج، مذہبی قوانین اور مذہبی فرائض میں متعین مذہبی تصور سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ ان کی شاعری میں سیکولرزم کا پرچم بلند نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں مذہب بیزاری بھی ہے۔ وہ بشری زاویہ نگاہ سے مذہب کو ناقابل قبول تصور کرتے ہیں کیوں کہ مذہب نے انسان کو تقسیم کیا ہے۔ راقم الحروف کو موصوف کی اس بات سے اتفاق نہیں ہے کیوں کہ مذہب انسان کو جوڑنے کا کام کرتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ نڈافاضلی نے مذہبی وساطت سے جس مذہبی اور انسان دوستی کے تصادم کی نشان دہی کی ہے، اسی اذیت ناک کیفیت سے آج نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے لوگ دوچار ہیں۔ اب فرد اپنے آپ کو تنہا اور غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار دیکھیے:

پہلے جیسا ہی دکھی ہے آج بھی بوڑھا کبیر
کوئی آیت کا مخالف کوئی مورت کے خلاف

گرجا میں مندروں میں اذانوں میں بٹ گیا
ہوتے ہی صبح آدمی خانوں میں بٹ گیا
نڈافاضلی نے اپنی شاعری کے ذریعے مذہبی حد بندیوں کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے مذہب کے ٹھیکے داروں کے بنائے ہوئے حدود کو توڑ کر انسانیت کے پیغام کو عام کیا۔ انھوں نے دونوں مذاہب کے لوگوں کے غلط رسم و رواج کو ہدف تنقید بنایا۔ ان کے یہاں مذہبی منافرت پر بہت سارے اشعار ملتے ہیں۔ اس تناظر میں ان کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

اٹھ اٹھ کے مسجدوں سے نمازی چلے گئے
دہشت گروں کے ہاتھ میں اسلام رہ گیا

کسی گھر کے کسی بجھتے ہوئے چولہے میں ڈھونڈ اس کو
جو چوٹی اور داڑھی تک رہے وہ دین داری کیا
نڈافاضلی انسان کے اندر انسانیت کو دیکھتے ہیں۔ وہ انسان کو مذہب اور فرقے میں تقسیم ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے۔ ان کے نزدیک رنگ، نسل، اور مذہب کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق کرنا روا نہیں

ہے۔ ان کی شاعری انسان کو محبت اور بھائی چارگی پیدا کرنے کی طرف مائل کرتی ہے۔

تصورِ خدا:

نَدافاضلی کے یہاں خدا کا تصور محدود نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی ذات کو مقدم تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا خدا ہر مخلوق کا خدا لگتا ہے۔ یہ خدا صرف مسلمان، ہندو، عیسائی یا یہودی کا خدا نہیں ہے بلکہ انسانوں کا خدا ہے۔ جو لوگ خدا کی خرید و فروخت کرتے ہیں یا اس کی تجارت کرتے ہیں، ایسے ڈھونگی مذہبی لوگوں کو نَدافاضلی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے خدا کی تمام مخلوقات سے عشق کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کا خدائی تصور مندر و مسجد کے حصاروں سے بہت بلند نظر آتا ہے۔ ان کی نظر میں خدا کی بندگی کے لیے مولوی کی اذان، پنڈت کی پوجا، مزدور کی ہیا ہیا اور چڑیوں کی چہکار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تضاد (Controversy) خدا کے وجود پر نہیں بلکہ ان راستوں پر پیدا ہوتی ہے جو خدا تک پہنچتے ہیں۔ کوئی مندر کی طرف سے گزرنا چاہتا ہے، کوئی مسجد کی طرف سے جانا چاہتا ہے اور کوئی چرچ کی طرف سے جانا چاہتا ہے۔ خدا تک پہنچنے کے راستے الگ الگ ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے بہت سارے اشعار کہے ہیں۔ چند ایک اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مندر بھی تھا اس کا پتہ، مسجد بھی تھی اس کی خبر
بھٹکے ادھر اٹکے ادھر کھولا نہیں اپنا ہی گھر

وہ ہی مورت وہ ہی صورت وہ ہی قدرت کی طرح
اس کو جس نے جیسا سوچا وہ بھی ویسا ہو گیا

سادھو نے چھوڑا سب کو میں نے بھی ڈھونڈا رب کو
اس نے بسایا جنگل میں نے مکاں بنایا

درج بالا اشعار میں نَدافاضلی اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ خدا تک پہنچنے کے راستے جدا جدا ضرور ہیں لیکن سب کا مقصد اور پیغام ایک ہی ہے۔ سب نے اپنی اپنی عقیدت کے مطابق اس کی عبادت کی۔ خدا کی ذات ایسی ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ وہی اس دنیا کا خالق و مالک ہے۔ نَدافاضلی نے اس خدا کا

تصور پیش کیا ہے جو وحدانیت، تصوف اور بھکتی واد پر مبنی تمام انسانیت کا خدا ہے۔ جو فطرت کے رگ وریشے میں قوتِ نمونہ بن کر دوڑتا ہے۔ جو گرجتا ہے، برستا ہے، چڑیوں کو دانے اور بچوں کو گڑ دھانی دیتا ہے۔ نذافتِ ضلیٰ نے ایک شعر میں خدا کا جو تصور پیش کیا ہے، اس پر اعتراض کیا جاسکتا ہے۔

تو ہی بادل، چاند، ستارہ، ہریالی
اور کبھی تو ناگ سا کی یا اللہ

اس شعر میں وہ ناگ سا کی میں ہوئے حملے کا ذمہ دار خدا کو ٹھہراتا ہے، جو کسی بھی صورت میں قابلِ قبول نہیں۔ اس شعر کے حوالے سے وارثِ علوی لکھتے ہیں:

”کھیل کھیل ہی میں، مذاق مذاق ہی میں خدا کو جتلا دیتا ہے کہ تو ہی
بادل، چاند، ستارہ، ہریالی ہے اور تو ہی ناگ سا کی ہے۔ جو بڑی گڑ بڑ اور
گھوٹالے والا معاملہ ہے۔ ناگ سا کی کا ذمہ دار بھی اگر خدا ہی ہے تو پھر ما
بعد الطبیعیاتی بغاوت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ ندا ان دروازوں
کے قریب جاتا ہے، پھر انھیں کھولتا نہیں۔“ 9

نذافتِ ضلیٰ نے اپنے چند اشعار میں اس بات کی تلقین بھی کی ہے کہ خدا کو کسی ایک جگہ قید کر کے مت
سوچو کیوں کہ وہ تو ہر جگہ جلوہ افروز ہے۔ اس کا ظہور کائنات کے ذرے ذرے میں دکھائی دیتا ہے۔ اصل راز
اس بات میں مضمر ہے کہ عبد جب اپنے معبود کو پالیتا ہے تو اس کی تمام خواہشات معبود کی رضا میں تبدیل ہو
جاتی ہیں۔ اس سلسلے سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

اس کے کئی ٹھکانے تھے لیکن جہاں تھا میں
اس کو وہیں تلاش کیا پھر کسی کو کیا

وہ خوش لباس بھی، خوش دل بھی، خوش ادا بھی ہے
مگر وہ ایک ہے کیوں اس سے یہ گلہ بھی ہے

ہمیشہ مندر و مسجد میں وہ نہیں رہتا
سنا ہے بچوں میں چھپ کر وہ کھیلتا بھی ہے

مذکورہ بالا اشعار میں اس بات کی دلیل ملتی ہے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے

ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ نذافاضلی نے کہیں کہیں زندگی کے حقائق کو فلسفیانہ رنگ دیا ہے جس سے ان کی غزل میں رعنائی پیدا ہوگئی ہے۔ انھوں نے اپنی ایک غزل میں شروع سے آخر تک مالکِ حقیقی کو مخاطب کیا ہے:

زمین دی ہے تو تھوڑا سا آسمان بھی دے
مرے خدا مرے ہونے کا کچھ گمان بھی دے

وہ اپنی تہذیبی شناخت پر سوال اٹھاتے ہیں کہ اے خدا! جب تو نے مجھے اس سرزمین پر پیدا کر ہی دیا ہے، تو اس دنیا میں میری ایک تہذیبی شناخت بھی قائم کرتا کہ اس جہاں میں میری پہچان قائم ہو سکے۔ دراصل خدا کا وجود نورانی ہے اور نور ہر گوشے تک پہنچتا ہے اور ہر سانچے میں ڈھلتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ انسان اپنے آپ کو بالکل بھلا دے اور اپنی ہستی سے ہی انکار کر دے۔ یہ ایک غلط رویہ ہے۔ اپنے مضمون ”میر تخلیقی سفر“ میں انھوں نے خدا کے تصور کو پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”میرے یہاں شعری ذہانت کائنات میں تصورِ خدا سے عبارت ہے۔
خدا کا ایک مذہبی تصور ہے جو مذہب کے شارحین و مفسرین نے محدود کر دیا ہے۔ دوسرا اس کا روپ سیاست کے بازاروں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔
تیسری صورت میں وہ مختلف مذاہب کے تصورات کے مطابق الگ الگ عبادت گاہوں میں منقسم ہے۔ اس منقسم خدا کو میں نے صوفی سنتوں کے ملفوظات سے جوڑ کر اس کو رب العالمین کی اصطلاح میں جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ وہ وحدہ لا شریک ہے۔ وہ پتھروں سے بنے گھروں میں غیر محفوظ تھا۔ صوفی سنتوں نے اسے دل میں بسا کر مقدس حفاظت فراہم کی۔ میں نے اسی خدا کا رشتہ اس کی تخلیق یعنی بندہ سے راست کرنے کی سعی کی ہے۔ جس میں ملتیں جب ختم ہو جاتی ہیں تو اجزائے ایمان میں ڈھل جاتی ہیں۔ کشمیر کی شیو بھگت لال دید کے مطابق شیو ہر جیو میں نواں کرتا ہے۔ جو عقائد کی تفریق سے اوپر اٹھ کر خالق کائنات بن جاتا ہے۔۔۔ میں نے تصورِ خدا کو شرکی دنیا میں خیر سے

تعبیر کیا ہے۔“ 10

جہاں تک نذافاضلی کے تصورِ خدا کی بات ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں تصورِ خدا کی تین قسمیں

بتائی ہیں۔ اول مذہبی تصور جو شارحین اسلام اور مفسرین دین نے دیا ہوا ہے۔ دوم وہ قسم ہے جس کا چلن سیاست کے بازار میں ہے اور سوم وہ تصور جو مختلف عبادت گاہوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ لیکن نذا فاضلی نے ”منقسم خدا“ کی بات کر کے خدا کے تصور کو کسی حد تک محدود کر دیا ہے۔ حالاں کہ ان کا اس بات پر یقین ہے کہ خدا منقسم ہے جو کہ متنوع عبادت گاہوں میں موجود ہے۔ دوسری طرف وہ تصور خدا میں ”لاشریکیت“ کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔ دراصل ان کے یہاں تصور خدا کا تعلق راست طور پر بندے سے ہے۔ بندہ جس طریقے سے اپنے خالق کو یاد کرنا چاہے، اس کا انحصار اس کی عقیدت اور ایمان پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ جب بندہ خدا سے راست تعلق جوڑ کر اسے اپنی عقیدت کے مطابق بسا لیتا ہے تو تمام ملتیں جن میں خدا کا تصور مختلف ہے، وہ سب ختم ہو جاتی ہیں۔

رشتوں کی اہمیت:

نذا فاضلی کی شاعری میں فرد اور سماج کے رشتے کی معنویت کی ایک نکھری ہوئی فضا دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے خود کو بھی عام لوگوں کا جزو بنالیا اور اپنی بات میں اجتماعی شعور پیش کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی شاعری میں انسانی رشتوں کو قائم کرنے پر زور دیا ہے۔ ان کا موقف یہی ہے کہ دوسرا انسان آپ سے ملے یا نہ ملے، اس کی طرف دوستی کا ہاتھ ضرور بڑھانا چاہیے۔ انھوں نے معاشرے میں ٹوٹے اور بکھرتے ہوئے رشتوں کو جوڑنے کی جو تجویز پیش کی ہے، اس سے معاشرے میں بڑھتے ہوئے فاصلوں کو کم ضرور کیا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے چند ایک اشعار پیش خدمت ہیں:

فاصلہ نظروں کا دھوکا بھی تو ہو سکتا ہے
وہ ملے یا نہ ملے ہاتھ بڑھا کر دیکھو

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجیے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

سبھی سے دور کا یا پاس کا رشتہ نکل آیا
جسے بھی غور سے دیکھا وہی اپنا نکل آیا

نَدَافاضلی نے اپنی غزلیہ شاعری میں رشتے نبھانے کی تلقین کی ہے اور ہمیشہ ملتے جلتے رہنے کی بات کی ہے۔ آج انسان اپنے آپ میں اتنا کھو گیا ہے کہ اس کے پاس گھر والوں کے ساتھ بیٹھنے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ انسانی تعلقات میں اب الجھن پیدا ہو چکی ہے۔ اب لوگ اپنا مطلب پورا کرنے کے لیے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اس طرح رشتوں کا زوال ہو رہا ہے اور تہذیبی اقدار پامال ہو رہی ہیں۔ اس سلسلے سے نَدَافاضلی کے چند ایک اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مل جل کے بیٹھنے کی روایت نہیں رہی
راوی کے پاس کوئی حکایت نہیں رہی

رشتوں کے نام وقت کے چہرے بدل گئے
اب کیا بتائیں کس کو کہاں چھوڑ آئے ہیں

نَدَافاضلی انسانیت اور امن کے پیجاری ہیں۔ آج جب ہماری سماجی قدریں ختم ہو رہی ہیں، رشتوں کی قدر و قیمت پر بھی خطرہ منڈلا رہا ہے اور لوگوں میں رشتہ نبھانے کے تئیں وفاداری بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس حالت کو انھوں نے یوں محسوس کیا ہے:

رشتوں کا اعتبار ہواؤں کا انتظار
ہم بھی چراغ لے کے ہواؤں میں آئے ہیں

نَدَافاضلی انسان اور کائنات کے رشتوں کو الگ الگ اکائیوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتے۔ آسمان، زمین، درخت، پرندے، دریا، پرہت اور انسان ایک ہی خاندان کے مختلف افراد ہیں جو ارتقا کے راستے میں ایک دوسرے سے نکھڑ گئے ہیں۔ ان کی شاعری میں رشتوں کی جو لطافت نظر آتی ہے، وہ اس خود ساختہ بغاوت کی دین ہے، جس کی وجہ سے وہ گھر سے بے گھر ہو گئے تھے۔ اس تناظر میں وہ اپنے مضمون ”میرا تخلیقی سفر“ میں رقم طراز ہیں:

”میری شاعری میں رشتوں کی لطافت اسی خود ساختہ بغاوت کی دین ہے۔ ماں باپ، بہن بھائیوں کے ساتھ اس میں بار بار نئے روپ میں ایک بچہ بھی ابھرتا ہے جو اس حسن و خیر کی علامت ہے، جو کائنات سے آہستہ آہستہ غائب ہوتی جا رہی ہے۔ کھوئے ہوئے رشتے اور بچوں

جیسے فرشتے میری ہر شعری کتاب میں نمایاں ہیں۔“ 11

نہا فاضلی نے بچوں پر بہت سارے اشعار کہے ہیں۔ انھیں بچوں میں وہی معصومیت دکھائی دیتی ہے جو کسی زمانے میں سیدھے سادے لوگوں میں عام تھی۔ اس بچے کی تلاش میں وہ مسجدوں، مندروں، ساحلوں اور چاند ستاروں تک پہنچتے ہیں۔

اے شام کے فرشتو! ذرا دیکھ کے چلو
بچوں نے ساحلوں پہ گھروندے بنائے ہیں

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو چاند ستارے چھونے دو
چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی ہم جیسے ہو جائیں گے
نہا فاضلی بچوں سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔ وہ بچوں کے ساتھ شیطانیاں کرتے تھے۔ ان کو چھیڑتے تھے۔ ان کو ٹانی اور چاکلیٹ جیب سے نکال کر دیتے تھے۔ بچے بھی ان سے بہت مانوس ہو جاتے تھے۔ ان کو دوست سمجھتے تھے اور بے تکلف بھی ہو جاتے تھے۔ ان کا پیغام واضح تھا کہ بچوں کے سپنوں کو پورا کرنے پر دھیان دینا چاہیے۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں:

دھواں اڑا کر چاند بجھانا اچھی بات نہیں
بچوں کے سپنوں کو چرانا اچھی بات نہیں

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

مؤخر الذکر شعرا دبی حلقوں میں بہت زیادہ موضوع بحث رہا۔ اس شعر پر تنقید کرنے والوں نے لکھا ہے کہ یہ شعر انسان دوستی کا استعارہ نہیں بلکہ محض ایک اہم اور بنیادی فریضے سے انکار کی حیلہ تراشی ہے۔ یہاں معمولی سا لفظ ”کسی“ بتا رہا ہے کہ فی الحال کوئی روتا ہوا بچہ وہاں موجود ہی نہیں ہے۔ لہذا وہ کسی روتے ہوئے بچے کی تلاش میں ہیں۔ بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ صرف عبادت کا متبادل نہیں ہے۔ اس کے سماجی پس منظر میں ایک سمت بھی ہے وہ یہ کہ عبادت اپنی جگہ لیکن اگر ہم اپنے روتے ہوئے معصوم بچے کی زندگی میں مسکان نہیں بھر سکتے تو ہماری عبادت بے مصرف عمل ہے۔ نہا فاضلی کے مطابق وہ لاہور کے ایک

مشاعرے میں گئے تھے۔ جب وہ یہی شعر پڑھ کر نیچے اترے تو تین چار آدمیوں نے انھیں گھیر لیا تھا۔ انھوں نے ان کے مذکورہ شعر پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ کیا بچہ مسجد سے بڑا ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے نندا فاضلی نے انھیں بتایا تھا کہ اس کے پاس بڑے اور چھوٹے کا پیمانہ نہیں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ مسجد کو خدا کے لیے انسان کے ہاتھ بناتے ہیں اور بچے کو اپنے لیے خدا کے ہاتھ سجاتے ہیں۔

اس شعر پر نندا فاضلی کو مذہبی گروہ کی مخالفت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس شعر کی معنوی گہرائی میں اترے بغیر جس طرح اس کا رد کیا گیا وہ قابلِ تعجب امر ہے۔ انھوں نے ایک سیدھی سادی بات کہی تھی کہ ”مسجد“ یعنی نیکی کا بڑا تصور یا بڑا کام جس کو اگر کر پانے کی استطاعت نہیں ہے تو کم از کم اتنا ضرور کیا جاسکتا ہے کہ ”بچہ“ یعنی وہ معصوم لوگ جو کمزور ہیں، دبے کچلے ہیں یا ہمارے ارد گرد ہیں، ان کے آنسو تو پونچھے جاسکتے ہیں۔ یہ کام اگرچہ عبادت نہیں ہے لیکن اس کا متبادل تو ہے۔ اس شعر میں نندا فاضلی نے حقوق العباد پر زور دیا ہے۔ اس حوالے سے کلیم ضیا اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

”میرے نزدیک یہ شعر حقوق العباد کی نشاندہی تو کرتا ہے۔ البتہ اس میں حقوق اللہ کے معاملے کو ایک مخصوص عینک سے دیکھا گیا ہے۔“

12

راقم الحروف کے نزدیک اس شعر کے دو پہلو ہو سکتے ہیں، مثبت اور منفی۔ مثبت اس لیے کہ اگر کوئی بچہ رو رہا ہے اور ہمارا گزر وہاں سے ہو تو اسے ہنسانے اور منانے کی کوشش تو کر سکتے ہیں۔ انسان کو اگر بچے کو ہنسانے کے لیے یا چپ کرانے کے لیے نماز بھی چھوڑنی پڑے تو اس کا اجرا سے ملے گا۔ دوسرا پہلو اس لیے منفی نظر آتا ہے کہ نماز چھوڑنے سے اس پر مذہبی فرار کا الزام لگ جائے گا۔ نندا فاضلی کے معترضین اس شعر کے دوسرے پہلو کو ہی ہدف تنقید بناتے ہیں۔ انھوں نے اپنی بیٹی ”تحریر“ کے لیے ایک غزل لکھی تھی جسے وہ اکثر مشاعروں میں سنایا کرتے تھے۔ غزل ملاحظہ فرمائیں:

جسے	دیکھتے	ہی	خیماری	لگے
اسے	عمر	ساری	ہماری	لگے

اجالا	سا	ہے	اس	کے	چاروں	طرف
وہ	نازک	بدن	پاؤں	بھاری	لگے	

وہ سرال سے آئی ہے مائے
اسے جتنا دیکھو وہ پیاری لگے

حسین صورتیں اور بھی ہیں مگر
وہ سب سینکڑوں میں ہزاری لگے

چلو اس طرح سے سجائیں اسے
یہ دنیا ہماری تمہاری لگے

اسے دیکھنا شعر گوئی کا فن
اسے سوچنا دین داری لگے

متذکرہ بالا غزل میں نذافاضلی نے اپنی بیٹی سے والہانہ جذبات کا اظہار کیا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کے لیے پرسکون ماحول چاہتے ہیں۔ دراصل یہ غزل انھوں نے ولی دکنی کی زمین میں کہی ہے۔ ولی کی غزل کا مطلع دیکھیے۔

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگانی کیوں نہ بھاری لگے

اسی طرح نذافاضلی نے اپنی ماں کو بھی اپنی غزلوں، نظموں اور دوہوں کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے اپنی ماں کی عظمت کو بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اللہ عرب میں فارسی والوں میں وہ خدا
میں نے جو ماں کا نام لیا پھر کسی کو کیا

ماں کی تصویر باپ کی تحریر
اپنی میراث میں لکھو صاحب

غرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ نذافاضلی کی غزلیہ شاعری میں رشتوں کی افادیت و اہمیت پر کافی زور ملتا

ہے۔ آج جب رشتوں میں دوریاں پیدا ہو گئیں ہیں، ایسے وقت میں بھی وہ اپنی شاعری کے ذریعے رشتوں کو استوار کرنے پر زور دیتے ہیں۔

گہرا بے گہری:

نڈا فاضلی کی شاعری میں ”گہر“ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ گہر سے بے گہر ہونا ہے۔ بے گہر ہو جانے کا احساس اور در بدری کا کرب ان کے حواس پر تا عمر چھایا رہا۔ ان کا کہنا ہے کہ بے گہری ان کا ذاتی انتخاب نہیں تھا بلکہ اس انتخاب کی وجہ ان کے والدین کی گوالیار سے پاکستان ہجرت تھی۔ چوں کہ نڈا فاضلی اس ہجرت کے مخالف تھے، اس لیے انھوں نے اپنے ملک ہندستان میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خاندان اپنے فیصلے کے مطابق پاکستان چلا گیا۔ اس طرح وہ گہر سے بے گہر ہو گئے۔ جب انسان کو سب سے زیادہ ضرورت اس کے گھر والوں کی ہوتی ہے اگر اسی وقت گھر والے اس کو چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو جائیں تو بہت ساری پریشانیاں اس کو جھیلنا پڑ سکتی ہیں۔ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ بے گہری کا عذاب اس وقت ان کا نصیب بنا جب انھیں گھر والوں کی اشد ضرورت تھی۔ اس بارے میں وہ اپنے مضمون ”میرا تخلیقی سفر“ میں لکھتے ہیں:

”گھر والوں کے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد میں اپنے ہی شہر میں بے گہر اور اکیلا تھا۔۔۔ بے گہری کی ان تنہائیوں میں میرا مسئلہ وہ اقتصادی بحران تھا، جو میرے نچلے متوسط طبقے کے ادب و آداب نے زیادہ شدید بنا دیا تھا۔ اس اقتصادی بحران کو کم کرنے کے لیے میں گوالیار چھوڑ کر بنجارہ صفت الگ الگ علاقوں میں آوارہ گردی کرتا ہوا سمندروں کی کشادگی میں پھیلے ہوئے اور ناریل کے پیڑوں کی طرح آسمان سے باتیں کرتے ہوئے شہر بمبئی آ گیا۔“ 13

نڈا فاضلی کے یہاں ”گہر“ صرف سچی ہوئی دیواروں، ٹی وی، فرج اور صوفے سے ہی عبارت نہیں ہے بلکہ ماں کے پیار، بہن کی شوخی اور پھول کی طرح کھلے ہوئے بچوں سے مزین ہے۔ یہ گہرا ان کی پوری شاعری میں موجود ہے۔ یہ گہرا ان کو اپنے پاس بلاتا ہے اور آواز دیتا ہے۔ اس سلسلے میں چند ایک اشعار پیش خدمت ہیں:

پتھروں میں بھی زبان ہوتی ہے دل ہوتے ہیں
اپنے گھر کے در و دیوار سجا کر دیکھو

ہم نے بھی سوکر دیکھا ہے نئے پرانے شہروں میں
جیسا بھی ہے اپنے گھر کا بستر اچھا لگتا ہے

تم جو سوچو وہ تم جانو ہم تو اپنی کہتے ہیں
دیر نہ کرنا گھر جانے میں ورنہ گھر کھو جائیں گے

مذکورہ بالا اشعار میں ہندوستان کے اس گھر کی کہانی سمجھ میں آتی ہے۔ جس میں ہر گھڑی بھاگتے رہنا
اور کم ہونا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ وہ بھی گھر کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے رہتے ہیں۔ اسی لیے وہ وقت پر گھر
پہنچنے کی بات کرتے ہیں ورنہ گھر کھو جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ وہ اپنے اقربا اور گھر بار کی جدائی کا کرب
اپنے اشعار میں یوں بیان کرتے ہیں:

سب کچھ تو ہے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں نگاہیں
کیا بات ہے میں وقت پر گھر کیوں نہیں جاتا

گھر سے نکلے تو ہو سوچا بھی کدھر جاؤ گے
ہر طرف تیز ہوائیں ہیں بکھر جاؤ گے

جو ساتھ ہے وہی گھر کا نصیب ہے لیکن
جو کھو گیا ہے اسے بھی مکان میں رکھنا

نذا فاضلی نے اپنے گھر کو الوداع تو کہہ دیا لیکن اس بے گھری نے ان کے اندر ایک ہلچل سی پیدا
کردی۔ اپنوں سے بچھڑنے اور گھر سے بے گھر ہونے کا غم ان کی شاعری میں ایک اضطراب کی صورت میں
ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یہ بے قراری ہر وقت ان کے اندر نظر آتی ہے:

کس سے پوچھوں کہ کہاں گم ہوں کئی برسوں سے
ہر جگہ ڈھونڈتا پھرتا ہے مجھے گھر میرا

خاندان کی ہجرت کوئی آسان بات نہیں ہوتی بلکہ اس سے پوری تہذیب تہس نہس ہو جاتی ہے اور انسان بکھر کر چور چور ہو جاتا ہے۔ ان کے ساتھ بھی یہی ہوا لیکن انھوں نے اس غم کو برداشت کیا۔ انھوں نے پردرد اور پراثر لہجے میں بے گھری کے عذاب کو بیان کیا ہے۔ ممبئی جیسے بڑے شہر میں بیس (20) سال کی محنت کے بعد فلیٹ خریدنے کے باوجود انھیں پشتینی گھر کی یاد دہنی انتشار میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس درمیان انھوں نے اپنا گھر ایک بار نہیں کئی بار کھویا ہے۔ زندگی بھر وہ دوسروں کی بے سروسامانی میں اپنی در بدری محسوس کرتے رہے۔ ان کی بے گھری فرد کے بجائے پوری قوم کی در بدری بن جاتی ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

نہ جانے کون سے لمحے کی بد دعا ہے یہ
قریب گھر کے رہوں اور گھر نہ جاؤں میں

رہتا نہیں ہے کچھ بھی سدا ایک سا یہاں
دروازہ گھر کا کھول کے پھر گھر تلاش کر

درج بالا اشعار میں گھر سے بے گھر ہونے، درد ر بھٹکنے اور اپنا گھر آباد کرنے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ نذا فاضلی کو اپنے گھر سے بہت محبت تھی۔ اسی لیے بے گھری کا صدمہ ان کے دل و ذہن میں آخر تک رہا۔ ان کی غزلیہ شاعری میں گھر مختلف رنگوں میں جلوہ افروز رہا ہے۔ کبھی بے گھری کے غم کو بیان کیا تو کبھی گھر میں رہتے ہوئے اجنبیت کا احساس ہوتا ہے:

پہلے ہر چیز تھی اپنی مگر اب لگتا ہے
اپنے ہی گھر میں کسی دوسرے گھر کے ہم ہیں

چراغ جلتے ہی بینائی بجھنے لگتی ہے
خود اپنے گھر میں ہی گھر کا نشان نہیں ملتا

اپنے گھر میں گھر کا نشان نہ ملنا رشتوں کی تبدیلی کا ایک افسوس ناک پہلو ہے۔ آج انسان تنہائی پسند ہو گیا ہے۔ وہ دوسروں کے ساتھ اپنا وقت گزارنا پسند نہیں کرتا۔ اس وجہ سے نہ صرف رشتوں میں بلکہ انسانی تعلقات میں بھی الجھن پیدا ہو گئی ہے۔

شہر:

نہدافاضلی کی شاعری میں خصوصی طور پر شہر کی ویرانی، تہذیبی اقدار کی پامالی، رشتوں کی تبدیلی، تلاشِ ذات کا مسئلہ جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ انھوں نے شہر کے افراتفری والے ماحول میں فرد کی تنہائی کو محسوس کیا۔ گاؤں، شہر اور وطن ایسے عناصر ہیں جو ان کی شاعری میں دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں گاؤں سے دور جانے کا غم بھی ہے اور وہ شہر کی بھاگتی دوڑتی مصروف زندگی کو بھی کوستے ہیں۔ وطن سے دوری، پردیس کی زندگی اور اس کی پریشانیوں کو بھی انھوں نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ ”شہر“ کے موضوع پر انھوں نے بہت سارے اشعار کہے ہیں۔ انھوں نے شہر کو بڑے معنی خیز انداز میں پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

شہر میں سب کو کہاں ملتی ہے رونے کی جگہ
اپنی عزت بھی یہاں ہنسنے ہنسانے سے رہی

نقشہ اٹھا کے کوئی نیا شہر ڈھونڈیے
اس شہر میں تو سب سے ملاقات ہوگئی

نہدافاضلی کی شاعری میں پہلی بار ایک بڑے شہر میں غریب الوطن شاعر کا کرب، حیرانی اور پریشانی کا اظہار ہوا ہے۔ ان کے مشاہدات و تجربات میں ایک بڑے شہر کی دل چسپ تصویریں سما گئی ہیں۔ وہ شہر کی پراگندہ زندگی کو مثبت بنیادوں پر استوار کرنے کے آرزو مند ہیں۔ ان کے شعری مجموعے ”مورناچ“ کی غزلوں میں وہ زہر ہے جو ایک بڑے اجنبی شہر کے غریب الوطن آدمی کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ بات کم کرنا، ذہانت کو چھپانا، اجنبی شہر میں دوست بنانا، شرافت، آدمیت اور دردمندی کی بیماریوں سے محفوظ رہنا، کسی سے خفا ہونا اور کسی سے خوش ہونا، دراصل جدید شہر کے کھوکھلے آدمی کی عبرت ناک نشانیاں ہیں۔ اس مناسبت سے نہدافاضلی کے چند ایک اشعار دیکھیے:

بات کم کیجیے ذہانت کو چھپاتے رہیے
اجنبی شہر ہے یہ دوست بناتے رہیے

شرافت آدمیت درد مندی

بڑے شہروں کی بیماری سے بچنے

کسی سے خوش ہے کسی سے خفا خفا سا ہے

وہ شہر میں ابھی شاید نیا نیا سا ہے

درج بالا اشعار میں اجنبی شہر کی جدوجہد کا منفی پہلو نظر آتا ہے۔ آج کے انسان کی زندگی شہر سے کچھ اس طرح وابستہ ہو چکی ہے کہ وہ ایک لمحے کو بھی اس چار دیواری سے باہر نہیں ہو پاتا۔ سوچتے، جاگتے، کام کرتے ہوئے اور خالی بیٹھے ہوئے اس کا شہر اور شہری ماحول اس کے ساتھ ہوتا ہے جس میں نئے نئے علاقوں، شہروں، بستیوں اور آبادیوں کا سفر بھی شامل ہوتا ہے۔

نڈافاضلی بمبئی شہر کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ بڑا گھمنڈی شہر ہے، جو کسی ایرے غیرے کو منہ نہیں لگاتا ہے بلکہ پہلے آزماتا ہے، طویل فاصلے طے کراتا ہے، وعدے کراتا ہے اور بڑے بڑے خواب دکھاتا ہے۔ اونچی عمارتوں اور لمبے فاصلوں کے اس شہر نے ان سے کڑا امتحان لیا۔ اس شہر میں لوگ کام میں اتنے مصروف ہیں کہ ان کے پاس خود کے لیے بھی وقت نہیں۔ ایسے میں ان کی ملاقات شہر کی ویرانی سے ہوئی جو لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکی ہے اور جس کے سبب لوگ بے حس ہو گئے ہیں۔ شہر کی اسی بے حسی اور تنہائی کو وہ اپنے اشعار میں یوں بیان کرتے ہیں:

ہنستے ہوئے چہروں سے ہے بازار کی زینت

رونے کی یہاں ویسے بھی فرصت نہیں ملتی

اور تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن کبھی کبھی یوں ہی

چلتا پھرتا شہر اچانک تنہا لگتا ہے

تنہا تنہا بھٹک رہا ہے انجانی سی راہوں میں

شاید اپنے ساتھ وہ اپنے شہر کو لانا بھول گیا

ایسے ماحول میں رہتے ہوئے انسان خود اپنی ذات کی حقیقت کو فراموش کرتا ہے اور پھر تمام عمر اس کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ نڈافاضلی بھی شہر کی بھیڑ میں کہیں کھو بیٹھے ہیں۔ شہر والوں کی بے رخی اور بے

حسی کو دیکھتے ہوئے ان کو بھی مصلحت اور مفاہمت کا لبادہ اوڑھنا پڑتا ہے۔

آدمی:

”آدمی“ نَدافاضلی کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ آج آدمی بے بس نظر آتا ہے کیوں کہ آج آدمیت اور انسانیت کی بے حرمتی ہر طرف ہو رہی ہے۔ نَدافاضلی آدمی کی بے حرمتی سے بہت مایوس ہو جاتے ہیں۔ وہ آدمی کی عظمت سے واقف ہیں۔ ”آدمی“ ان کے یہاں ایک تلازمے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے ہر طرح کے اشعار قلم بند کیے ہیں۔ آدمی کی تنہائی، اس کی بے چارگی، اس کی بے چینی و بے قراری، اس کا خانوں میں بٹ جانا، اس کا بوجھ اٹھانا، کڑی محنت کرنا اور جینا مرنا جیسی کیفیات کو انھوں نے بڑے فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں چند ایک اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہر طرف ہر جگہ بے شمار آدمی
پھر بھی تنہائیوں کا شکار آدمی

صبح سے شام تک بوجھ ڈھوتا ہوا
اپنی ہی لاش کا خود مزار آدمی

ہر طرف بھاگتے دوڑتے راستے
ہر طرف آدمی کا شکار آدمی

گھر کی دہلیز سے گیہوں کے کھیت تک
چلتا پھرتا کوئی کاروبار آدمی

گرجا میں مندروں میں اذانوں میں بٹ گیا
ہوتے ہی صبح آدمی خانوں میں بٹ گیا

آدمی مصلحت سے کام نہ لے تو وہ خسارے میں رہتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اچھے انسان کے دشمن

زیادہ ہوتے ہیں۔ وہ اس جھوٹ اور فریب کی دنیا میں تنہا رہتا ہے اور ہر پل تڑپتا رہتا ہے۔ وہ ہر لمحہ جیتا ہے اور ہر پل مرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ ہر دن اس انتظار میں رہتا ہے کہ اس کی امیدیں برآئیں گی۔ اس کیفیت کو نڈافاضلی نے اپنے اشعار میں یوں پیش کیا ہے:

اس کے دشمن ہیں بہت آدمی اچھا ہوگا
وہ بھی میری ہی طرح شہر میں تنہا ہوگا

روز جیتا ہوا روز مرتا ہوا
ہر نئے دن نیا انتظار آدمی

آج کے زمانے میں بے چہرگی عام ہو گئی ہے۔ ایک آدمی میں بہت سے چہرے نظر آتے ہیں جن کو پہچاننا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ نڈافاضلی اس بات سے بہ خوبی واقف ہیں۔ وہ آدمی کے اندر انسانیت کے متلاشی تھے۔ وہ نجومی نہیں تھے لیکن اپنے تجربات و مشاہدات کو شعری پیکر عطا کر کے آدمی کے چہرے سے پردہ اٹھانے کا ہنر جانتے تھے۔ دنیا سے انھوں نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو چیزیں حاصل کیں، ان کو کچھ اس طرح سے لوٹانے کی کوشش کرتے ہیں:

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

خوش حال گھر شریف طبیعت سبھی کا دوست
وہ شخص تھا زیادہ مگر آدمی تھا کم

بھول تھی اپنی فرشتہ آدمی میں ڈھونڈنا
آدمی میں آدمیت ہے چلو یوں ہی سہی

نڈافاضلی بڑے کینوس کے شاعر تھے۔ انھوں نے دنیا کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا تھا۔ وہ زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔ انھوں نے بھیڑ میں رہ کر بھی خود کو تنہا پایا۔ انھوں نے کبیر اور غالب کے تشکیلی امتزاج سے جو تجربہ کیا ہے، اس کا حاصل وہ مرکزی کردار ہے جسے ”عام آدمی“ کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا

ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں انسان دوستی، محبت اور یگانگت کا پیغام دیا۔ عام آدمی کے جذبات و احساسات کو انھوں نے اپنے شعری رویے کا معیار بنایا ہے۔ اس کے اپنے خواب ہیں، اپنا سنگھرش ہے اور اس میں تبدیلی کی چنگاریاں بھی روشن ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

”یہ چھوٹا آدمی جس کے دکھ ہر نظام کے بقا کی ضرورت رہے ہیں۔

اسے میں نے ضرورت کے خاموش کھلونے کی طرح قبول نہیں کیا ہے۔

اس کی فعالیت میرے شعری رویے کا معیار ہے۔ اس کے اپنے خواب

ہیں، اپنا سنگھرش ہے اور اس میں تبدیلی کی خواہش کی چنگاریاں روشن

ہیں۔ یہ چھوٹا آدمی اپنی طاقت کے شعور کے ساتھ حالات کو مقدر کے

حوالے نہیں کرتا، ان کو بدلنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ اس عام آدمی سے

میرا شعری رشتہ میری شعری زبان کی تبدیلی کا بھی باعث ہے۔“ 14

در اصل نذافاضلی کا یہ آدمی نامہ نظیر اکبر آبادی کے آدمی نامہ کی توسیع بھی ہے اور تکمیل بھی ہے، جہاں سب کچھ حاصل کرنے کے بعد آخری سانس تک کچھ پالینے کا انتظار آنکھوں میں ہے۔ آج انسان کو انسان سے ہی خطرہ لاحق ہے۔ یہ بھی ایک سچائی ہے کہ آج کا انسان شام ہونے کے ساتھ اگلی صبح کا انتظار نہیں کرتا کیوں کہ حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ پتہ نہیں کل اسے میسر ہو یا نہ ہو۔ جس طرف بھی ہم نظر دوڑاتے ہیں، کسی نہ کسی صورت میں انسان پریشان حال نظر آتا ہے۔ انسان تمام عمر سفر میں رہتا ہے۔ ایک کام پورا ہوتے ہی اس کے ذہن میں دوسرا کام کرنے کی خواہش ابھرنے لگتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ انسان کی خواہشات کی تکمیل کبھی نہیں ہوتی۔ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے وہ پوری عمر گنوا بیٹھتا ہے۔ اس طرح ہر وقت بے چینی اور بے قراری اسے ستاتی رہتی ہے۔ نذافاضلی نے اس سچائی کو سادہ الفاظ میں شعر کا جامہ پہنا کر پیش کیا ہے:

زندگی کا مقدر سفر در سفر
آخری سانس تک بے قرار آدمی

سفر:

زندگی ایک سفر ہے۔ انسان اپنی پیدائش سے لے کر موت تک سفر میں رہتا ہے۔ اس سفر کے دوران

انسان کو مختلف نوع کی الجھنوں، پریشانیوں اور تکلیفوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ انسان اپنی منزل کو پانے کے لیے مشکل سے مشکل ترین سفر طے کرتا ہے۔ بعض اوقات سفر اس کے لیے آسان بھی بنتا ہے۔ جب وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچتا ہے تو وہ خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ دراصل منزل کو پانے کے لیے سفر بنیادی شرط ہے۔ نذا فاضلی کے یہاں سفر کے متعلق بہت سارے اشعار ملتے ہیں۔ انھوں نے سفر کی مشکلوں کا اظہار منفرد انداز میں کیا ہے:

اپنی مرضی سے کہاں اپنے سفر کے ہم ہیں
رخ ہواؤں کا جدھر کا ہے اُدھر کے ہم ہیں

چلتے رہتے ہیں کہ چلنا ہے مسافر کا نصیب
سوچتے رہتے ہیں کہ کس راہ گزر کے ہم ہیں

وقت کے ساتھ ہے مٹی کا سفر صدیوں سے
کس کو معلوم کہاں کے ہیں کدھر کے ہم ہیں

درج بالا اشعار میں اس بات کا تذکرہ ملتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں آنے کے بعد سفر کے مشکل مراحل طے کرنا پڑتے ہیں۔ اس سفر میں وہ ایک مسافر کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتا ہے۔ نذا فاضلی اپنی زندگی کو ایک سفر تسلیم کرتے ہوئے اس کے ہر پڑاؤ کو لفظوں کی چادر میں محفوظ کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس سفر کے دوران انھیں اپنے شہر کا ہر شخص پریشان لگتا ہے، زندگی سراب لگتی ہے اور پھر سفر کو مزید آگے بڑھانے کے لیے ان کے قلم سے یہ اشعار نکلتے ہیں:

زندگی جاگی ہوئی آنکھوں کا رنگین سراب
جو بھی گزرا وہ سراپوں کے سفر سے گزرا

اب جہاں بھی ہیں وہیں تک لکھو رودادِ سفر
ہم تو نکلے تھے کہیں اور ہی جانے کے لیے

نہ جانے کون سا منظر نظر میں رہتا ہے

تمام عمر مسافر سفر میں رہتا ہے
مذکورہ بالا اشعار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زندگی سراپوں کا سفر ہے۔ یہ سفر تمام صورتوں میں
جاری رکھنا ہے۔ تمام تر تکلیفوں اور پریشانیوں کے باوجود انسان کا وجود اپنے مقررہ وقت تک باقی رہے گا۔
اس لیے جب تک انسان زندہ ہے اس کا یہ سفر جاری و ساری رہے گا۔ نذافاضلی کے یہاں مسلسل سفر کا
احساس ہوتا ہے۔ جب انھیں لگتا ہے کہ وہ ٹھہر سے گئے ہیں تو پھر نئی منزلوں کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اور
اپنا سفر جاری رکھتے ہیں:

نکلے تھے جب سفر پہ تو محدود تھا جہاں
تیری تلاش نے کئی عالم دکھائے ہیں
زندگی کی معنویت کی یہی تلاش نذافاضلی کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ ان کا سفر ایک نئی سمت و رفتار
اختیار کرتا ہے۔ یہی سمت و رفتار اچھی شاعری کی بشارت ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات
ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ وہ سفر کے پر پیچ راستوں سے واقف تھے۔ اس لیے وہ دوسروں کو تلقین کرتے تھے کہ
منزل کو پانے کے لیے سفر کی مشکلوں کو برداشت کر کے سفر جاری رکھنا چاہیے۔

عصر حاضر کے مسائل:

انسان کو زندہ رہنے کے لیے کھانا، پانی اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں سے کسی ایک چیز کی کمی
اس کی موت کا باعث بن سکتی ہے۔ بڑھتی ہوئی بے روزگاری نے لوگوں کا جینا محال کر دیا ہے۔ متوسط طبقہ
اس سے بری طرح متاثر ہوا ہے۔ روزی روٹی کی تلاش میں وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ در بدر مارے پھرتے
ہیں لیکن پھر بھی دو وقت کا کھانا ان کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ قرض کے بوجھ تلے سانس لیتے ہیں۔
نذافاضلی نے اپنے ایک شعر میں اس کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:

جب تک جے بکھرتے رہے ٹوٹے رہے
ہم سانس سانس قرض کی صورت ادا ہوئے

نذافاضلی نے عالمی سطح پر عصری حسیت کی بہترین عکاسی کی ہے۔ آج جس طرح سے طاقت کے بل
بوٹے پر دنیا کے کچھ ممالک انسانی زندگیاں برباد کرتے جا رہے ہیں، اس سے اخلاقی قدروں کا زوال ہو رہا

ہے۔ انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری میں اپنے عہد کے تمام پیچیدہ مسائل کو بڑی بے باکی سے پیش کیا ہے۔ آج انسانوں کی ترقی یافتہ دنیا اور مہذب سماج نے انسانی حیات اور اس کی داخلی کائنات کو کسبِ معاش کے مسائل سے متاثر کیا ہے۔ اس طرح انسان اپنی مقامی زمین سے دور جانے پر مجبور ہوا ہے۔ شہروں میں کسبِ معاش کا مسئلہ تو اس نے حل کر لیا مگر اسے اپنے دیس کی خوشبو کا فقدان ستاتا رہا۔ جب اس نے پنجرہوں میں پرندے بند پڑے دیکھے تو اسے اپنے پرسکون ماحول کی یاد نے ستایا، جس میں اس نے پیڑوں اور درختوں پر پھدکتی چڑیوں کو دیکھا تھا۔ اس المیے کو نذافاضلی نے صفحہ قرطاس پر یوں بکھیر دیا ہے:

جنگل سے محفوظ تھا پنجرہ لیکن اسی حفاظت میں
کھلی فضا کا ایک پرندہ پروں سے اڑنا بھول گیا

اڑ جائے نہ پرندہ قفس توڑ تاڑ کے
پینے کو پانی چگنے کو دانہ نہیں رہا

جنگل میں راستے بنے آبادیاں بڑھیں
بس صبح شام چڑیوں کا گانا نہیں رہا

نذافاضلی کے یہاں ہم عصر عہد کی حسیت اور اس کے پورے سیاق و سباق کو تمام تر تخلیقیت کے ساتھ لفظ میں کشید کرنے کا عمل جا بہ جا ملتا ہے۔ انسان کی سائنسی ترقی اور اس کی تعقلاتی سرگرمی جس سماجی و تہذیبی منظر نامے کی تشکیل کا موجب بنی، اس نے طرزِ رہائش اور دن رات کی قید کو متاثر بھی کیا۔ کام کے اوقات میں تبدیلی آگئی۔ معیار اور پسند و ناپسند کا مزاج بھی تبدیل ہوا۔ اختصاص کی وبانے انسانی ذہن کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ نذافاضلی نے عصری حسیت، حالات کی چیرہ دستی اور اس کے انسانی وجود پر نمایاں ہونے والے اثرات کا مطالعہ بڑی گہرائی سے کیا ہے۔ اسی مطالعے سے انھیں احساس ہوا کہ سماجی زندگی ریزہ ریزہ ہو رہی ہے، تہذیبی قدریں پامال ہو رہی ہیں، انسان خانوں میں بٹ رہا ہے اور وہ اپنی زبان، تہذیب اور تمدن سے دوچار ہوتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج الفاظ اپنی معنویت کھو رہے ہیں۔ ہر چیز مصنوعی اور بناوٹی ہے۔ عصر حاضر کے اس درد و کرب کو انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری میں جگہ دی ہے:

اتنا بھی بن سنور کے نہ نکلا کرے کوئی

لگتا ہے ہر لباس میں وہ بے لباس ہے

کہتا ہے کوئی کچھ تو سمجھتا ہے کوئی کچھ
لفظوں سے جدا ہو گئے لفظوں کے معانی

نہ افاضلی نے اپنی غزلوں میں زندگی کے حقائق کی عکاسی کچھ اس طرح کی ہے کہ ان کی شاعری
عصری دور کے انسان کی ترجمان بن کر سامنے آتی ہے۔ انھوں نے علامتی اظہار سے بھی اپنی غزلوں میں
شگفتگی پیدا کی ہے۔ آج کا انسان اپنے سماجی، سیاسی اور اقتصادی ماحول کی وجہ سے ذہنی انتشار کا شکار نظر آتا
ہے۔ اس کو کہیں بھی چین و سکون نہیں ملتا۔ وہ ہمیشہ بے چین و بے قرار رہتا ہے۔ درندگی، فرقہ وارانہ
فسادات، ذہنی انتشار، اضطراب، تنہائی، بے چینی، بے قراری، بستیوں کا اجڑنا، امن و امان کا غارت ہونا
وغیرہ عصر حاضر کے ایسے مسائل ہیں جن سے ہر کوئی دوچار ہے۔ آج کے دور میں سیاست، عدالت نیز تعلیمی
ادارے بھی عام آدمی کے ساتھ ظلم و ستم اور استحصال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان تمام موضوعات پر انھوں
نے اپنی غزلوں میں خامہ فرسائی کی ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار دیکھیے:

جس کو بھی دیکھیے وہ سند یافتہ ہے آج
اب مکتبوں میں ہوتے نہیں امتحان کیا

توازن خوف کی بنیاد پر قائم ہے دنیا کا
کھلی ماچس ہے پہرے دار سب بارود خانوں میں

جو ہو چکا ہے اس کا ہی ماتم ہے ہر جگہ
ہونا ہے جو ابھی وہ کسی کو پتہ نہیں

مذکورہ بالا اشعار دورِ حاضر کے حالات کی غمازی کرتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا
کہ مایوسی، ناکامی، بے کیفی، خوف و ہراس اور خود شکستگی جیسے عناصر عصر حاضر کی غزل میں نظر آتے ہیں۔ یہی
عناصر نہ افاضلی کی غزلیہ شاعری میں اپنا کردار بہ خوبی نبھا رہے ہیں۔ آج کے مشینی دور میں انسان خود اپنی
ذات کے حصار میں قید ہو گیا ہے۔ وہ اپنی تلاش میں کھو گیا ہے۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور راحت و

آسائش کی نئی ایجادات نے انسانی معاشرے پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں نے انسانی اقدار کو بھی مجروح کیا ہے۔ انسان مادیت پرستی کے جال میں کچھ اس طرح جکڑ چکا ہے کہ فراغ و کشادگی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ اس حوالے سے چند ایک اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

اوپر کے چہرے مہرے سے دھوکا نہ کھائیے
مجھ کو تلاش کیجیے گم ہو گیا ہوں میں

برسوں سے اندھیروں میں پڑا چیخ رہا ہوں
میں اپنے ہی اندر ہوں مجھے کون نکالے

وہ ایک شخص جو کل تک تھا دوسروں سے خفا
اب اپنے آپ سے برہم ہے کیا کیا جائے

اگر ہم مغرب پر نظر ڈالیں تو وہاں جذباتی سطح درہم برہم دکھائی دیتی ہے، جب کہ ذہانت کی سطح پر زیادہ ہمواری اور استواری نظر آتی ہے۔ مشرق میں ہم جذبات کی شکست و ریخت کے عمل سے تو گزر رہے ہیں لیکن اس میں مشترک مفاد، ہم رنگی اور ہم آہنگی کا اسلوب پیدا نہیں کر پائے۔ اسی لیے بکھراؤ کچھ زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان اپنے رشتوں کو خود اپنے سے استوار نہیں کر پاتا۔

ہر دور مسائل و معاملات سے دوچار رہا ہے۔ مختلف ادوار میں ان کی نوعیت مختلف رہی ہے۔ جس قدر زمانہ آگے بڑھ رہا ہے، اسی قدر نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ عہد حاضر میں مسائل کا ایک سیلاب اُمڈ آیا ہے جس سے انسان کا سکون و قرار بھی چھن گیا ہے۔ ذہنی انتشار، بے چینی، گھبراہٹ اور خوف و دہشت کا عالم اس پر طاری ہو گیا ہے۔ عہد حاضر کی برق رفتاری نے انسان کو اس قدر مصروف کیا ہے کہ اس کا رشتہ فرد اور سماج سے کٹا جا رہا ہے۔ جس کے باعث وہ رفتہ رفتہ تنہا ہوتا جا رہا ہے۔ موبائل اور انٹرنیٹ کے استعمال نے بھی اسے غیر محسوس طریقے سے سماج سے دور کر دیا ہے جس سے انسانی رشتوں میں دن بہ دن کشیدگی اور بکھراؤ پیدا ہو رہا ہے۔ مشترکہ خاندان ٹوٹ رہے ہیں۔ انسان اجتماعی زندگی کے بجائے انفرادی زندگی کو ترجیح دے رہا ہے۔ خلوص، محبت، اخوت، ہمدردی، باہمی میل جول، غم خواری و غم گساری اور جذبہ انسانیت کا فقدان ہو رہا ہے۔ اس دور میں اخلاقی قدروں کا زوال ہو رہا ہے۔ مادہ پرستی اور مفاد پرستی نے انسان کو اپنی

گرفت میں لے لیا ہے۔ جس سے اس کے اندر منافقت کا رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے دو چہرگی کا سہارا لے رہا ہے۔ یہی دو چہرگی رفتہ رفتہ کثرتِ چہرگی میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اس لیے کسی پر اعتبار کرنے سے پہلے اسے ہر طرح سے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی جائے۔

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

ایک سے مل کے سب سے مل لیجیے
آج ہر شخص ہے نقابوں میں

عصرِ حاضر باہمی نفرتوں، ہلاکت خیزیوں اور طوائف الملوکی کا دور ہے۔ یہاں اکثر لوگ نہ اپنی زندگی کے قدردان ہیں اور نہ دوسروں کی زندگی کو کوئی اہمیت دی جاتی ہے۔ آج کے دور میں جان دینا اور جان لینا بچوں کا کھیل ہو گیا ہے۔ آج کے مشینی دور نے انسانی دماغ کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ جدت پسندی کی اس ہوائے انسانی فکر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ جدت پسندی کا نتیجہ ہے کہ آج ایک فن کار اپنی تخلیقات کو جدید سانچے میں ڈھال کر عوام کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں آرام و آسائش کا ہر سامان موجود ہے مگر اس کے باوجود انسان دلی سکون حاصل کرنے کے لیے بے چین نظر آتا ہے۔ اس دور کا انسان ظاہری طور پر ایک دوسرے کے قریب ہے مگر حقیقت میں وہ قریب ہونے کے باوجود دور ہو چکا ہے۔ اس طرح انسان بھیڑ میں ہوتے ہوئے بھی خود کو اکیلا محسوس کرتا ہے۔ اس مناسبت سے چند ایک اشعار پیش خدمت ہیں:

اپنی طرح سبھی کو کسی کی تلاش تھی
ہم جس کے بھی قریب رہے دور ہی رہے

بدلا نہ اپنے آپ کو جو تھے وہی رہے
ملتے رہے سبھی سے مگر اجنبی رہے

غرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ نڈافاضلی کی غزلیہ شاعری میں وہ تمام عصری مسائل ابھر کر سامنے آتے ہیں جن کا رشتہ کبھی نہ کبھی انسان سے رہا ہے۔ یہ مسائل خواب کی دنیا سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ ان کا تعلق حقیقی دنیا

سے ہے۔ ان کا اپنے معاصرین میں یہ امتیاز رہا ہے کہ وہ عصری حسیت کو سماجی شعور کی مدد سے داخلیت کے جمالیاتی نظام میں شامل کر دیتے ہیں۔

نذرا فاضلی کی غزلیہ شاعری کے مطالعے سے یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں کو کسی ایک زاویے تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان کے یہاں ہر طرح کے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے سماج میں تبدیلی لانے کے خواہش مند تھے۔ ان کی شاعری آج کے حالات پر بہترین تبصرہ ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں فکر و آگہی کے جوہر دکھائے ہیں۔ وہ اپنے دور کے انتشار سے بہت متاثر ہوئے۔ عصری مسائل نے انھیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اسی کے سبب ان کی شاعری میں فکر و آگہی، ندرت خیال، تجربات و مشاہدات اور جذبات و احساسات کا پرتو نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو ہندستانی تہذیب سے ہم آہنگ کر کے ایک نیا تصور پیش کیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے انسان کو زندگی کی اہمیت و افادیت سے روشناس کیا۔ انھیں کاروانِ حیات کو آگے لے جانے میں کافی جدوجہد کرنا پڑی۔ وہ زندگی کو کشمکش سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ زندگی کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کے متمنی ہیں۔ انھوں نے اپنے اشعار میں زندگی کے فلسفے کو نئے رنگ و آہنگ میں بیان کیا ہے۔ اس تناظر میں چند ایک اشعار دیکھے جا سکتے ہیں:

پہلے بھی جیتے تھے مگر جب سے ملی ہے زندگی
سیدھی نہیں ہے دور تک الجھی ہوئی ہے زندگی

اک آنکھ سے روتی ہے یہ اک آنکھ سے ہنستی ہے یہ
جیسی دکھائی دے جسے اس کی وہی ہے زندگی

ہر راستہ انجان سا ہر فلسفہ نادان سا
صدیوں پرانی ہے مگر ہر پل نئی ہے زندگی

مٹی ہوا لے کر اڑی گھومی پھری واپس مڑی
قبروں پہ کتبوں کی طرح لکھی ہوئی ہے زندگی

نَدافاضلی کا ماننا ہے کہ ہر انسان کے سوچنے کا نظریہ الگ الگ ہوتا ہے۔ انسان زندگی کو جس نظریے سے دیکھے اس کو ویسی ہی زندگی نظر آئے گی۔ زندگی کی قدر و اہمیت اس وقت سمجھ میں آئے گی جب اس کو کسی اچھے کام کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔ نَدافاضلی مثبت فکر کے شاعر ہیں۔ اس لیے وہ سفرِ حیات سے وابستہ خیر و شر کے تمام پہلوؤں کو مثبت نظریہ فکر سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ شاعری اپنے وقت کی آواز بھی ہوتی ہے اور وجودِ کائنات کا راز بھی، نوحہ حالات بھی ہوتی ہے اور نغمہ حیات بھی۔ یہ شاعر کے فکر و ادراک پر منحصر ہے کہ وہ اپنی شعری کائنات کو زندگی کے کن حقائق سے تعمیر کرتا ہے۔ ان کی شاعری گزرتے ہوئے وقت اور حالات کا آئینہ ہے۔ ان کی شاعری زندگی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر اپنا سفر طے کرتی ہے۔ ان کا اختصاص یہ ہے کہ وہ فلسفہ حیات و مرگ کے متفرق پہلوؤں، احساس کے مختلف رنگوں اور انسان کے مختلف جذبوں کو شعری قالب میں کچھ اس طرح ڈھالتے ہیں کہ ان کی ہر تخلیق قاری کے فہم و ادراک کو مسرور و محصور کرتی ہے۔ اسی خصوصیت کی بدولت ان کے بہت سے اشعار زبانِ زدِ خاص و عام ہو چکے ہیں۔ نیز کچھ اشعار تو ضربِ المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ اس حوالے سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے
عشق کیجیے پھر سمجھئے زندگی کیا چیز ہے

دنیا جسے کہتے ہیں جادو کا کھلونا ہے
مل جائے تو مٹی ہے کھو جائے تو سونا ہے

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجیے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسا یا جائے

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کبھی زمین کہیں آسماں نہیں ملتا

درج بالا اشعار میں آخری شعر کو کافی شہرت ملی۔ یہ شعر ان کی قبر کے کتبے پر تحریر کنندہ ہے۔ ان کے اس شعر پر اعتراض کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ اسی زمین میں کیتی اعظمی کی چھ اشعار پر مشتمل ایک غزل بھی ہے۔ جو ”کیفیات“ کے صفحہ نمبر 349 پر درج ہے۔ اس غزل کے نیچے ستمبر 1974 کی تاریخ بھی درج ہے۔ نندا فاضلی نے اپنی غزل کیتی اعظمی کی غزل کے بہت سال بعد کہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے سامنے کیتی اعظمی کی غزل موجود تھی۔ انھیں اس غزل کی زمین پسند آئی اور اسی زمین میں انھوں نے اپنی غزل معرض وجود میں لائی۔ حیرت کی بات ہے کہ انھوں نے کہیں پر بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہاں کیتی اعظمی کی غزل کا مطلع پیش کیا جاتا ہے تاکہ بات واضح ہو جائے:

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا
نئی زمین نیا آسمان نہیں ملتا

اس غزل کے دوسرے ایک دو شعر کا خیال بھی دونوں میں یکساں اور مشترک نظر آتا ہے۔ نندا فاضلی نے اپنی غزلیہ شاعری میں جو مضامین پیش کیے ہیں، ان کا تعلق ان کی ذاتی زندگی کے تجربوں سے رہا ہے۔ ان کے اشعار میں ان کی آپ بیتی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے شعری مجموعے ”زندگی کی طرف“ میں 31 غزلیں اساتذہ کی زمینوں میں کہی ہیں۔ انھوں نے امیر خسرو، کبیر داس، قلی قطب شاہ، نصرتی، بحرئی، ولی، سودا، میر سوز، نظیر، ناسخ، میر درد، رند، قائم چاند پوری، یقیں، انشا، مومن، غالب، جہاں دار شاہ، شبلی، میر مہدی مجروح، شیفتہ، اوسط علی رشک، حضور عظیم آبادی، حسین علی تاسف، فائز، حیدر بخش حیدری، اکبر الہ آبادی، شاد لکھنوی اور دعا ڈبائیوی کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ اس حوالے سے وہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

”امیر خسرو سے دعا ڈبائیوی تک کا یہ زمانی دائرہ صدیوں پر محیط ہے۔

ان غزلوں کو میں نے شعری زبان اور موضوع کی تبدیلی سے اپنے عہد

کی حسیت سے ہم رشتہ کرنے کی کوشش کی ہے۔“ 15

ان غزلوں میں نندا فاضلی نے صوفیانہ آہنگ کے ساتھ نئے دور کے مضامین کو بھی باندھا ہے اور مجموعی طور پر ہم مشربی کا پیغام بھی دیا ہے۔ ان کی شاعری پر کبیر، نظیر، میر، غالب کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مصحفی اور آتش سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ سور داس کا بھجن ان کی ابتدائی شاعری کا محرک بنا۔ اس بھجن کی کشش نے انھیں کبیر، میر اور رحیم کے مطالعے کی طرف مائل کیا۔ انھیں نظیر اکبر آبادی

سے والہانہ عقیدت تھی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ نظیر اردو کے بہت بڑے شاعر ہیں لیکن ہم نے ان کی قدر نہیں کی۔ وہ صوفی شعرا کی شاعری کا خوب مطالعہ کرتے تھے۔ قدم قدم پر نظیر، کبیر، خسرو وغیرہ کے کلام کا تذکرہ کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے تخلیقی سفر میں ان قدیم شعرا کی روایت کو اپنے منفرد انداز میں آگے بڑھایا ہے۔ ان کے یہاں میر کی یاسیت، کبیر کی وحدانیت اور نظیر کی انسانیت صاف طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ جہاں ایک طرف ان کی روح کی گہرائیوں میں میر و غالب کا فکری نظام تھا وہیں دوسری جانب کبیر کے لہجے کی مٹھاس بھی پائی جاتی ہے۔ کبیر کے بارے میں وہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

”میری ذہنی وابستگی الگ الگ بولیوں کے ان ہندستانی صوفی سنتوں کی نگارشات سے زیادہ رہی ہے جو اردو شعری روایت کی وراثت سے کسی حد تک دور رہی ہیں۔ ان اثرات میں بڑا حصہ کبیر داس کی شاعری کا وہ پہلو ہے جس میں وہ دیکھی ہوئی دنیا کی بے ثباتی کے بجائے دنیا میں مذہبی تضادات کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ وہ انسان اور انسان کے درمیان پیدا کی گئی دوریوں کو ہٹاتے ہیں۔ کبیر خدا اور انسان کے بیچ کسی وسیلے کی جگہ خود اپنے شعور پر اعتماد کرتے ہیں۔“ 16

نذا فاضلی نے ایک جگہ غالب اور کبیر کا تقابل کرتے ہوئے لکھا تھا کہ کبیر اور غالب میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ کبیر سر پر آسمان رکھ کر زمین زادوں سے لڑتے تھے جب کہ غالب آسمان والے اور زمین زادوں، دونوں سے جھگڑتے تھے۔ نذا فاضلی نے کبیر کی روحانی بصیرت اور غالب کی تشکیلی حکمت کے امتزاج سے رشتہ جوڑنے کا تجربہ کیا ہے۔ اس تجربے کا مرکزی کردار عام آدمی ہے۔ وہ انسانیت کی سر بلندی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اپنے جذبات، احساسات، تجربات اور مشاہدات کو جس بے باکی سے انھوں نے اظہار کے سانچے میں ڈھالا ہے، وہ ان کی انفرادیت کی بین مثال ہے۔ وہ دنیا کو اپنے طور سے دیکھنا پسند کرتے ہیں اور اپنے طور سے جینے کے متمنی ہیں۔ دنیا کو اپنے طور سے جینے کی یہ کوشش انھیں تلخیوں اور زخموں میں مبتلا کر دیتی ہے:

ہمیں بھی شوق ہے اپنی طرح سے جینے کا
ہمارا نام بھی کیجیے عتاب میں شامل

نذا فاضلی نے اپنی ایک غزل میں صدام حسین کو موضوع بنایا ہے۔ یہ غزل ان کے شعری مجموعے ”

شہر میرے ساتھ چل“ میں شامل ہے۔ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

اس کو کھو دینے کا احساس تو کم باقی ہے
جو ہوا وہ نہ ہوا ہوتا یہ غم باقی ہے

جنگ کے فیصلے میدان میں کہاں ہوتے ہیں
جب تک حافظے باقی ہیں علم باقی ہے

میں نے پوچھا تھا سبب پیڑ کے گر جانے کا
اٹھ کے مالی نے کہا اس کی قلم باقی ہے

تھک کے گرتا ہے ہرن صرف شکاری کے لیے
جسم گھائل ہے مگر آنکھوں میں رم باقی ہے

”آنکھوں میں رم باقی ہے“ کی ترکیب واقعی لا جواب ہے۔ صدام حسین نے جب فرازدار سے دنیا کے سربراہوں کو دیکھا ہوگا تو یہ دنیا اسے بہت چھوٹی نظر آئی ہوگی۔ اسلامی ممالک کے قائدین یا نام نہاد قائدین جو امریکہ کا پس خوردہ چن رہے ہیں، وہ دنیاوی آسائشوں میں ڈوب کر نام نہاد ہدایت کے ہنگامے کھڑے کر رہے ہیں۔ دراصل یہی قائدین اسلام کو ذاتی اغراض و مقاصد کی حصول یابی کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

نذا فاضلی نے سنجیدہ ادب کے علاوہ فنون لطیفہ کے ذریعے بھی عوام تک رسائی پائی۔ ان کی غزلوں کو مختلف گلوکاروں نے اپنے سر سے سجایا ہے، جس سے ان کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ ہو گیا۔ پنکج ادھاس، جگجیت سنگھ، غلام علی، چندن داس، بھوپندر سنگھ، طلعت عزیز اور لتا مگیلشکر وغیرہ نے بہترین طرزوں میں ان کی شاعری کو منظر عام پر لایا ہے۔ انھوں نے چھوٹی بحروں میں بھی بہترین غزلیں کہی ہیں۔ اس سلسلے سے چند ایک اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

چھوٹا لگتا تھا افسانہ
میں نے تیری بات بڑھا دی

کام تو ہے زمین پر بہت

آسمان پر خدا کس لیے؟

تم یہ کیسے جدا ہو گئے
ہر طرف ہر جگہ ہو گئے

جیسا جس کے یار کا چہرہ
ویسا ہی سنسار کا چہرہ

مذکورہ بالا اشعار سہلِ ممتنع میں کہے گئے ہیں۔ ان اشعار میں ان کے شعری رجحان کی بھرپور عکاسی ملتی ہے جس میں انھوں نے اپنے جذبے کو پوری شدت سے بیان کیا ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری میں ان متنوع کیفیات کی ترجمانی ملتی ہے جو انھیں اپنی زندگی اور ماحول سے ملیں۔ ان کے ذوق نے ان کے کلام کو آراستہ و پیراستہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں سادگی و پرکاری کے ساتھ معنویت و احساسات کی دبیز تہیں محسوس کی جاتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں فکر و اظہار کے معاملے میں تنوع پایا جاتا ہے جس کی بدولت ان کے اشعار میں تازگی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ فکر انگیز بات کو بھی سادگی سے بیان کرتے ہیں۔ اس تناظر میں محمد یوسف رضا اپنی کتاب ”ندا فاضلی: حیات و جہات“ میں لکھتے ہیں:

”ندا فاضلی کی شاعری میں تفکر ہے اور جب یہی تفکر جمالیاتی انبساط پیدا کرنے لگتا ہے تو شاعری اپنی معراج خود پالیتی ہے اور اسی نے ندا فاضلی کو انفرادیت بخشی ہے۔ وہ فکر آمیز بات کو بہت سادہ طریقے سے

کہہ جاتے ہیں۔“ 17

ندا فاضلی کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے شعر کہنے کا انداز بالکل مختلف ہے۔ وہ مضمون کو اشعار میں بڑی سادگی اور آسانی کے ساتھ پیش کرتے ہیں جس سے ان کا کلام قاری کے ذہن پر ایک نقش چھوڑ جاتا ہے۔ ان کی یہی جدت طرازی انھیں اپنے ہم عصروں سے منفرد بناتی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں کسی کی تقلید نہیں کی بلکہ اپنا راستہ خود بنایا۔ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل کی ایسی ترجمانی کی ہے کہ وہ اپنے وقت کی آواز بن گئے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنی کتاب ”ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت“ میں لکھتے ہیں:

”ہر بڑی شاعری دراصل اپنا پیانہ خود ہوتی ہے۔ بڑا شاعر یا تو کسی روایت کا خاتمہ ہوتا ہے یا کسی طرزِ نو کا موجد۔ وہ بہر حال باغی ہوتا ہے۔ فرسودہ روایات پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ اظہار کے لیے نئے پیانے تلاشتا ہے اور نئی شعری گرامر خلق کرتا ہے۔ وہ یا تو اپنے زمانے سے آگے ہوتا ہے یا اپنے عہد کے درد و داغ و سوز و ساز و جستجو و آرزو کی ایسی ترجمانی کرتا ہے کہ اپنے وقت کی آواز بن جاتا ہے۔“ 18

مذکورہ بالا اقتباسِ ندافاضلی کے فکر و شعور پر صادق آتا ہے۔ انھوں نے اپنے ذوقِ سخن کے سبب جدیدیت سے استفادہ کر کے اپنے افکار کو شعری جامہ پہنایا۔ انھوں نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت زبان، موضوع اور فکر کے اعتبار سے ادب میں تجربے ہو رہے تھے۔ انھیں اپنے جذبات، احساسات اور خیالات کو روزمرہ کی زبان میں بیان کرنے کا ملکہ حاصل تھا۔ اس دور میں جدیدیت کے زیر اثر ابھرنے والے علامتی اور تجریدی رجحان کے تحت انھوں نے تجربے کے طور پر کچھ اشعار کہے جو اس زمانے میں کافی مشہور ہوئے اور ساتھ ہی بدنام بھی ہوئے۔ جدیدیت کے عروج کے زمانے میں ان کے اس شعر پر بہت چرچے ہوئے:

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہو گئی

اس شعر پر کافی بحث و مباحثہ ہوا۔ بعض معترضین کا کہنا تھا کہ اگر یہی جدیدیت ہے تو اس سے بچنا چاہیے۔ اس شعر کو مضحکہ خیز بھی کہا گیا۔ کسی نے اس شعر کو فینش پرستی کہا تو کسی نے اسے مبہم شعر سے تعبیر کیا۔ ہر ادبی محفل میں یہ شعر موضوعِ بحث رہا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے بھی اس شعر پر اعتراض کیا۔ انھوں نے ندافاضلی سے کہا کہ آپ اس شعر کی تشریح کیا کریں گے تو انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ دیہاتوں میں صبح کی آمد کا اعلان مرغ اپنی بانگ سے کرتا ہے۔ جس سے عموماً لوگ بیدار ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس شہروں میں فلیٹ میں رہنے والوں کو صبح ہونے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ دن چاہے جتنا گزر گیا ہو۔ ان کے فلیٹ کی کھڑکی کے پردے اگر گرے ہوئے ہوں تو انھیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ دن کتنا گزر چکا ہے۔ ندافاضلی کی اس وضاحت سے پروفیسر علی احمد فاطمی مطمئن نظر نہیں آتے۔ انھوں نے ان کے اس شعر:

جانے کتنی دور ہے سورج ان کے چہنوں سے

ایسے میں جو مرغا بولے لاکھ بلائیں لوں
 کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ سورج اور مرغا اس شعر میں بھی ہیں لیکن ان کے تلازمے بالکل مختلف ہیں۔ راقم
 الحروف کی نظر میں یہ شعر مبہم نہیں ہے بلکہ غزل کے دیگر اشعار کی روشنی میں اس شعر کی اپنی معنویت ہے اس
 شعر پر اعتراض محض برائے اعتراض ہے۔ دراصل نڈا فاضلی نے اس شعر میں مختلف علامتوں کا استعمال کیا
 ہے۔ انھوں نے ان کا مفہوم بھی واضح کیا ہے۔ ایسے میں علی احمد فاطمی کا اعتراض کچھ واضح دکھائی نہیں دیتا ہے
 بلکہ ان کا اعتراض محض برائے اعتراض ہے۔ نڈا نے اس شعر میں جس خیال کو پیش کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی
 ہے۔ اس لیے اس شعر پر الزام لگانا درست نہیں ہے۔ اس شعر کے حوالے سے وارث علوی اپنے مضمون میں
 رقم طراز ہیں:

”نڈا جدید شاعر ہے۔ جدید غزل کی وہ شاہراہ جس پر ظفر اقبال، محمد
 علوی، بشیر بدر، عادل منصور، ہمل کرشن اشک اور دوسرے شعرا غزل
 خواں کم اور پایہ جولاں زیادہ چلے۔ اس پر سب سے بڑا اشتہار نڈا کے
 اس مرغ کا ہے جو سورج کو چونچ میں لیے کھڑا ہے۔ لیکن یہ اشتہار محض
 التباس ثابت ہوا۔ نڈا نے کمرے کے پردے کھینچ لیے اور رات ہو گئی۔“

19

دراصل نڈا نے یہ شعر فیشن کے طور پر کہا تھا۔ ان کا ماننا ہے کہ ہر شاعر کے یہاں اس طرح کے اشعار
 نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے ذاکر خان ذاکر نے ایک انٹرویو میں نڈا فاضلی سے اس شعر کے بارے میں
 سوال کیا تھا کہ یہ کس قسم کا تجربہ تھا۔ نڈا فاضلی نے اس سوال کے جواب میں کہا تھا کہ انھیں اعتراض کرنے
 والوں پر افسوس ہوتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے اجمیر شریف کی دیگ سے ایک چاول نکال کر دیکھا جائے کہ
 پوری دیگ پک گئی ہے یا نہیں۔ چند برے اشعار کو یاد کر کے کسی کی شاعری پر فیصلہ صادر نہیں کیا جاسکتا۔ ہر
 عہد کے شاعر کے یہاں اس طرح کے اشعار ملتے ہیں۔ نڈا فاضلی نے تنقید کی پرواہ کیے بغیر اپنا سفر جاری
 رکھا۔ اتنا ضرور ہوا کہ وہ سورج جو مرغی کی چونچ میں تھا، اس سے اب ان کی انگلیاں جھلکتی ہیں:

پچانتے تو ہو گے نڈا فاضلی کو تم
 سورج کو کھیل سمجھا تھا چھوٹے ہی جل گیا

نڈا فاضلی کی شاعری اپنے معاصرین میں منفرد نظر آتی ہے۔ وہ فرد کو ایک مکمل اکائی کے طور پر دیکھتے

ہیں جب کہ ان کے معاصرین فرد کو مختلف خانوں میں بانٹتے ہیں۔ نڈافاضلی کے یہاں فرد اپنے رنج و اندوہ، غیظ و غضب اور فرحت و مسرت سے آنکھیں ملاتا نظر آتا ہے۔ ان کی غزلوں میں ہندی شاعری کا واضح اثر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ہندی شعر و ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اپنے ابتدائی دنوں میں وہ جس حلقے میں رہے وہ ہندی ادیبوں اور شاعروں کا حلقہ تھا۔ جدید غزل کی تشکیل میں انھوں نے اہم کردار نبھایا ہے۔ جدید دور کے پیدا شدہ مسائل سے انسان کا ذہن انتشار کا شکار ہو گیا ہے۔ خوف و دہشت، بغاوت، اجنبیت، مایوسی، تنہائی اور اقدار کی پامالی وغیرہ کو انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے ملک اور بیرون ملک میں بھی اپنی شاعرانہ صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔ ان کی فکر میں جدت اور ندرت کے ساتھ ساتھ احساس کی شدت بھی پائی جاتی ہے۔ نڈافاضلی کی غزلیہ شاعری کے حوالے سے سیفی سرونجی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

”سچ تو یہ ہے کہ نڈافاضلی نے اپنی شاعری میں اردو غزل کو نہ صرف نیا

لہجہ دیا، بلکہ غزل کو فکر و معنی کے وہ گہر عطا کیے ہیں کہ نڈافاضلی کو آج کا

غالب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔“ 20

مذکورہ بالا اقتباس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ سیفی سرونجی نے مبالغے سے کام لیا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ نڈافاضلی کو کسی بھی حوالے سے آج کا غالب نہیں کہا جاسکتا۔ غالب کو جو مقام اردو ادب میں حاصل ہے، آج کے زمانے میں بھی اس مقام تک رسائی مشکل ہے۔ غالب اردو ادب پر ہمیشہ غالب رہیں گے۔ ان کی عظمت میں کوئی کمی نہیں آ سکتی۔ نڈافاضلی کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کے کلام میں غالب جیسی معنی آفرینی، اسلوب بیان، ندرت الفاظ اور تہہ داری نظر نہیں آتی۔ اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے اپنے معاصرین میں اپنا اسلوب سب سے جدا رکھا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ایسے الفاظ کا انتخاب کیا جو سادہ ہونے کے ساتھ عام فہم بھی تھے۔ احساس اور اظہار دونوں سطحوں پر ان کے کلام میں جدت اور ندرت پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری میں زندگی کی کشمکش بھی ہے اور آباد و برباد ہوتے ہوئے گھر بھی ہیں۔ محبوب کے ساتھ ماں، بہن، بیٹی کا عشق بھی ہے اور تہذیبی اقدار کی پامالی کا نوحہ بھی ہے۔ ان کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا عقیدہ کسی کے دکھ درد میں شریک ہونا ہے۔

اسلوب و تکنیک:

اسلوب کے معنی طور طریقہ یا طرزِ تحریر کے ہیں۔ اسلوب انگریزی لفظ Style کے مترادف ہے۔ اس سے ایک ایسا طرزِ تحریر مراد ہے جو ادیب یا شاعر کا مظہر ہو اور جو ہر اعتبار سے منفرد ہو۔ اسلوب فن کار کے اندازِ بیان، اندازِ فکر اور اندازِ تخلیق کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس طرح شعر و ادب میں اسلوب سے مراد وہ خاص طرزِ تحریر یا طرزِ ادا ہے جس کی وجہ سے تخلیق کار کی شناخت ہو۔ اسلوب اس وقت منفرد اور غیر معمولی بن جاتا ہے جب الفاظ کا انتخاب بہترین ہوگا۔ نڈافاضلی کی غزلوں کا اسلوب نیا ہے۔ انھوں نے سادہ اسلوب، قادر الکلامی، ندرتِ خیال اور سچے جذبات و احساسات سے اپنی غزلوں کا دامن تاب دار موتیوں سے بھر دیا ہے۔ انھوں نے اپنے معاصرین میں اپنا اسلوب سب سے جدا رکھا اور ایسے الفاظ کا استعمال کیا جو سادہ ہونے کے ساتھ عام فہم بھی تھے۔ انھوں نے نئی لفظیات اور وسعتِ مضامین کے ذریعے اپنی الگ شناخت قائم کی۔ ان کی لفظیات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر ظہیر علی لکھتے ہیں:

”انھوں نے (نڈافاضلی) غزل کی ہیئت کا احترام کرتے ہوئے وسعتِ

مضامین اور نئی لفظیات کے ذریعے اپنی غزل کی شناخت قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان کی اکثر غزلیں بحر، ردیف، قافیہ، مطلع غرض صنفِ غزل کی تمام پابندیوں کو نبھانے کے باوجود اردو کی روایتی غزل سے مختلف ہیں۔ ان کی غزلوں کی تازہ کاری کا سبب بڑی حد تک ان کی لفظیات

میں پوشیدہ ہے۔“ 21

مذکورہ بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی غزلوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی نئی لفظیات ہے۔ اس لحاظ سے انھوں نے بڑی جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی غزلوں میں عام فہم، سیدھی سادی ہندی زبان کا استعمال کیا ہے۔ ان کی غزلیں جیتی جاگتی ہندوستانی تہذیب کی آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے نئی لفظیات کے ساتھ نئے معنیاں نظام کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ اس تناظر میں چند ایک اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

نیل گنگن میں تیر رہا ہے اجلا اجلا پورا چاند
ماں کی لوری سا بچے کی دودھ کٹوری جیسا چاند

بیس کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے چوکا باسن چمٹا پھلکی جیسی ماں

گرج برس پیاسی دھرتی پر پھر پانی دے مولا
چڑیوں کو دانے بچوں کو گر دھانی دے مولا

یہ ڈکشن اردو غزل کے لیے بالکل نیا ہے۔ یہ اشعار ہمارے دیس کی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان اشعار کو پڑھنے سے جذباتی ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان معنوں میں انھوں نے اردو غزل کے سرمائے میں قابلِ تحسین اضافہ کیا ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں فارسی آمیز یا عربی آمیز لفظیات سے پرہیز کرتے ہوئے خالص ہندوستانی رنگ سے اپنے نگار خانہ کو سجاتے ہیں۔ کسی بھی شاعر یا ادیب کی مقبولیت کے پس پشت مضامین اور موضوعاتی تنوع کے علاوہ اس کے اسلوب کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ اسلوب زبان کے تخلیقی استعمال سے بنتا ہے اور اس میں سادگی زبان کی سادگی سے پیدا ہوتی ہے۔ نڈافاضلی اپنے اسلوب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”میں نے جو اسلوب اختیار کیا ہے۔ اس میں نہ عربی کے بوجھل الفاظ شامل ہوئے ہیں اور نہ سنسکرت کے الفاظ۔ ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جس طرح کبیر کے پدوں میں ”رحیمانہ“ آیا ہے یا میرا کے بھجوں میں لفظ ”صدقہ“ آیا ہے۔ اسی طرح میں بھی اپنی زبان کو اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنالیتا ہوں۔“ 22

جدید شاعری میں جن شاعروں کا رنگ و آہنگ منفرد ہے وہ صرف اپنے طرزِ اظہار کی وجہ سے نہیں بلکہ طرزِ فکر اور طرزِ احساس کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ نڈافاضلی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اسلوب موضوع کو منتخب نہیں کرتا بلکہ موضوع اپنا اسلوب چن لیتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کون سی بات کس پیرائے میں کہنی ہے:

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجیے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہے

ہر طرف ہر جگہ بے شمار آدمی
پھر بھی تنہائیوں کا شکار آدمی

مذکورہ بالا اشعار میں مخاطب سیدھا اور سپاٹ ہے۔ اس کے باوجود وہ اس میں شعریت قائم رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان اشعار میں دعوتِ فکر ملتی ہے۔ اسی لیے ان اشعار کا کینوس وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ انھوں نے احساس، خیال، جذبے اور انسانی رویے کی سطح پر جو بات محسوس کی، اس کا شعری اظہار ضروری سمجھا۔ زبان اور لفظیات کی سطح پر بھی انھوں نے الگ روش اپنائی۔ ان کے یہاں کلاسیکیت کا رچاؤ بھی ہے اور جدیدیت کا رنگ بھی ہے۔ عرفان صدیقی، محمد علوی اور ظفر اقبال کے برعکس نڈا فاضلی لوک ادب اور ہندی شاعری سے بھی کسبِ فیض کرتے ہیں۔ یہی وصف انھیں امتیازی شان عطا کرتا ہے۔ وہ مزاج سے باغیانہ، سرشت سے رندانہ اور رواج سے صوفیانہ نظر آتے ہیں۔ ان کے اسلوب کے بارے میں وارث علوی لکھتے ہیں:

”نڈا فاضلی کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ کسی اسلوب کا اسیر نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ نڈا کے یہاں اسلوب شعر اندرونی تخلیقی اچ اور موضوع کے مطابق تشکیل پاتا ہے۔“ 23

نڈا فاضلی کی شاعری دراصل موضوعات، اسلوب، ڈکشن، لب و لہجہ اور منظر و ماحول کے لحاظ سے ہند آریائی ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ ان کی شاعری کی یہ خوبی انھیں صوفیوں اور سنتوں کے قریب کر دیتی ہے جن کے کلام کی زمینی قربتوں اور روحانی برکتوں کو وہ اپنے کلام کے لسانی اظہار کا معیار بناتے ہیں۔ انھوں نے اپنے منفرد اسلوب سے ایک خاص قسم کی ذہنی فضا تیار کی جس کے سحر نے انسانی ضمیر کو بیدار کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے زندگی سے بیزار انسان کے دل میں جینے کی خواہش پیدا کرتے ہیں۔ شاعری کے ساتھ ان کا جذباتی لگاؤ اور انسانیت کے ساتھ ان کی والہانہ وابستگی ان کی شخصیت اور شاعری دونوں کی امتیازی خوبیاں ہیں۔ انھوں نے اردو کی پر تکلف شعری روایات سے برگشتہ ہو کر ایک کھرے، غیر مصنوعی اور زمینی طرزِ اظہار کو اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ بات چاہے اسلوب کی ہو یا خیال کی، موضوع کی ہو یا ہیئت کی، ان کی شاعری تخلیقی اعتبار سے متوازن نظر آتی ہے۔ انھوں نے مروجہ زبان و بیان سے ہی لفظیات کو لیا۔ جس لفظ کو بھی انھوں نے مصرف میں لایا یا اپنی غزل میں برتا ہے، وہ لفظ مروجہ ہونے کے باوجود خود بہ خود اپنی جگہ علامت، استعارہ اور پیکر بن

جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں سورج، شہر، سفر، بچہ، فرشتے، تنہائی، گھر، مندر، مسجد، چراغ، پتیل، فاختہ، آدمی وغیرہ جیسی لفظیات کو بروئے کار لایا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو دل کش اور مؤثر بنانے کے لیے تشبیہات و استعارات اور صنعتوں کا استعمال کیا ہے۔ ذیل میں ان صنعتوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

استعارہ:

استعارہ کے لغوی معنی ”ادھار لینا یا مستعار لینا“ کے ہیں۔ علم بیان کی اصطلاح میں جب کسی چیز یا لفظ کو اپنے حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی میں استعمال کیا جائے اور حقیقی و مجازی معنی کے درمیان تشبیہ کا تعلق ہو تو وہ استعارہ کہلاتا ہے۔ جب دو چیزوں میں مشترکہ صفات کی بنا پر ایک چیز کو براہ راست دوسری چیز کہا جائے تو وہ استعارہ کہلاتا ہے۔ اس میں حرف تشبیہ کا استعمال نہیں ہوتا ہے۔ مستعار لہ، مستعار منہ اور وجہ جامع استعارہ کے ارکان میں شامل ہیں۔

- (۱) مستعار لہ: جس چیز یا شخص کے لیے کوئی صفت ادھار لی جائے اسے مستعار لہ کہا جاتا ہے۔
 - (۲) مستعار منہ: جس چیز یا شخص سے کوئی صفت مستعار لی جائے اسے مستعار منہ کہتے ہیں۔
 - (۳) وجہ جامع: مستعار لہ اور مستعار منہ میں جو صفت مشترکہ ہو اسے وجہ جامع کہا جاتا ہے۔
- نہا فاضلی نے بھی اپنے اشعار میں استعارات کو بروئے کار لایا ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

مندر بھی تھا اس کا پتہ، مسجد بھی تھی اس کی خبر
بھٹکے ادھر اٹکے ادھر، کھولا نہیں اپنا ہی گھر

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہو گئی

باغ ہے دل فریب دونوں سے
پھول کو خار سے جدا مت کر

تشبیہ:

تشبیہ کے لغوی معنی ”مشابہت دینا“ کے ہیں۔ شعری اصطلاح میں تشبیہ سے مراد کسی ایک چیز کو مشترکہ صفت کے باعث دوسری چیز کے مانند ٹھہرانا ہے۔ ارکان تشبیہ میں مشبہ، مشبہ بہ، وجہ تشبیہ، غرض تشبیہ اور حرف تشبیہ شامل ہیں۔

(۱) مشبہ: جس چیز یا شخص کو تشبیہ دی جائے۔

(۲) مشبہ بہ: جس چیز یا شخص سے تشبیہ دی جائے۔

(۳) وجہ تشبیہ: وہ صفت جو مشبہ اور مشبہ بہ میں مشترک ہو۔

(۴) غرض تشبیہ: جس مقصد یا غرض کے لیے تشبیہ دی جائے۔

(۵) حرف تشبیہ: وہ حروف جو تشبیہ دینے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

نڈافاضلی نے اپنی شاعری کو تشبیہات کے استعمال سے دلکش اور مؤثر بنایا۔ اس ضمن میں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

زندگی انتظار جیسی ہے
دور تک رہ گزار جیسی ہے

میرے گیتوں جیسی تیرے پھولوں کی تحریریں ہیں
دھرتی تیرے اندر بھی شاید کوئی غم ہوگا

صنعتِ تلمیح:

تلمیح کے لغوی معنی ”اشارہ کرنے“ کے ہیں۔ شعری اصطلاح میں تلمیح سے مراد کسی تاریخی یا نیم تاریخی واقعے کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ اس کے استعمال سے پورا قصہ یا واقعہ ذہن میں آجاتا ہے۔ اس حوالے سے نڈافاضلی کے چند اشعار دیکھیے:

یزید گھوم رہا ہے یہیں کہیں شاید
نجف کی آب و ہوا پھر سے نوحہ خواں کیوں ہے

کل بہتر تھے مگر ہے آج لاکھوں کا شمار

ہر طرف اب کربلا ہے کربلا کے سامنے

صنعت تضاد/طباق:

کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال کرنا جو معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہوں تو وہ صنعت تضاد یا طباق کہلاتی ہے۔ نذافاضلی نے اپنے اشعار میں جاہ جاس صنعت کا استعمال کیا ہے۔ اس سلسلے میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

جھوٹ کو جھوٹ کہا سچ کو ہی سچ بولا ہے
اس کو سمجھائیے وہ شخص بہت بھولا ہے

رات کے بعد نئے دن کی سحر آئے گی
دن نہیں بدلے گا تاریخ بدل جائے گی

صنعت طباق سلبی:

شعر میں دو ایسے متضاد الفاظ کا لانا جو ایک ہی مصدر سے مشتق ہوں اور دونوں لفظوں کا تضاد حرف نفی سے ہوتا ہو تو اس صنعت کو طباق سلبی کہا جاتا ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار پیش خدمت ہیں:

فاصلہ نظروں کا دھوکا بھی تو ہو سکتا ہے
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ بڑھا کر دیکھو

جو بھی کیا کیا نہ کیا پھر کسی کو کیا
غالب ادھار لے کے گیا پھر کسی کو کیا

مانے نہ مانے کوئی حقیقت تو ہے یہی
چرخہ ہے جس کے پاس اسی کی کپاس ہے

صنعت تجنیس محرف:

تجنیس محرف سے مراد شعر میں ایسے الفاظ کا استعمال کرنا ہے جو حروف کے اعتبار سے یکساں ہوں مگر حرکات و سکنات میں فرق کی وجہ سے تلفظ اور معنی میں مختلف ہوں۔ اس ضمن میں نذافاضلی کے چند اشعار پیش

کیے جاتے ہیں:

مندر بھی تھا اس کا پتہ مسجد بھی تھی اس کی خبر
بھٹکے ادھر اٹکے ادھر کھولا نہیں اپنا ہی گھر

وہی ہمیشہ کا عالم ہے کیا کیا جائے
جہاں سے دیکھیے کچھ کم ہے کیا کیا جائے

صنعتِ تجنیس ناقص و زائد:

کلام میں دو متجانس (ہم جنس) الفاظ میں صرف ایک حرف کی کمی یا بیشی ہونا صنعتِ تجنیس ناقص و
زائد کہلاتی ہے۔ نڈافاضلی نے اس صنعت کا استعمال اس انداز سے کیا ہے:

اب کسی سے بھی شکایت نہ رہی
جانے کس کس سے گلہ تھا پہلے

میری غربت کو شرافت کا ابھی نام نہ دے
وقت بدلا تو تری رائے بدل جائے گی

صنعتِ تجنیس مذیل:

تجنیس مذیل سے مراد کلام میں دو متجانس الفاظ کا استعمال کرنا ہے۔ لیکن ان میں سے ایک لفظ کے
آخر میں دو حروف زیادہ ہوں۔ اس صنعت کو نڈافاضلی کے درج ذیل اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے:

اپنی بستی کو سمجھنے کے لیے
دوسروں کی بستیوں میں گھوم بھی

پہلے ہر چیز نظر آئے گی بے معنی سی
اور پھر اپنی ہی نظروں سے اتر جاؤ گے

وقت ندیوں کو اچھالے کہ اڑائے پریت
عمر کا کام گزرنا ہے گزر جائے گی

صنعتِ اشتقاق:

اشتقاق سے مراد شعر میں ایسے الفاظ لانا جو ایک ہی مادے سے مشتق ہوں۔ اس حوالے سے نڈافاضلی کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

نمازیوں سے کہو دیکھیں چاند سورج کو
نکل رہے ہیں مؤذن اذان سے باہر

تمام عمر مجھے جس کا انتظار رہا
وہ مجھ سے ملنے کو مجھ میں ہی بے قرار رہا

صنعتِ مراعاتِ النظیر:

مراعاتِ النظیر سے مراد ہے شعر میں ایسے الفاظ یکجا کرنا جو ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں مگر یہ مناسبت تضاد اور تقابل کی نہ ہو۔ اس کو تناسب، توفیق، تلفیق اور ایتناف بھی کہتے ہیں۔ نڈافاضلی کے اشعار میں اس صنعت کا استعمال ہوا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

ہر عدالت اسی مجرم کو سزا دیتی ہے
جرم کر کے جو گنہ گار نہ ہونے پائے

زرخیز ہے زمین بھی برسات بھی ہے ٹھیک
موسم بدل بھی سکتا ہے یہ بات بھی ہے ٹھیک

تاریخ میں محل بھی ہے حاکم بھی تخت بھی
گمنام جو ہوئے ہیں وہ لشکر تلاش کر

صنعتِ استدراک:

شعر کے پہلے مصرعے میں کچھ ایسے الفاظ لائے جائیں جن کو پڑھتے وقت ہجو کا گمان ہو لیکن جب یہی ہجو دوسرے مصرعے میں آکر مدح میں تبدیل ہو جائے تو وہ صنعتِ استدراک کہلاتی ہے۔ اس تناظر میں نڈافاضلی کے چند اشعار دیکھے جاسکتے ہیں:

چلتے رستے کو ہر صورت ایسی ویسی لگتی ہے
مجنوں کی آنکھوں سے پوچھو لیلا کیسی لگتی ہے

نکلے تھے جب سفر پہ تو محدود تھا جہاں
تیری تلاش نے کئی عالم دکھائے ہیں

صنعتِ ہجو یلیح:

اس سے مراد کسی شخص یا شے کی ہجو اس طرح کرنا کہ بظاہر کوئی ہجو معلوم نہ ہو بلکہ شعر کے ظاہری معنی سے مدح نکلتی ہو، یعنی مدح اور ہجو دونوں پہلو ساتھ ساتھ ہوں۔ نداء فاضلی نے اس صنعت کو اپنے اشعار میں دلکش انداز میں برتا ہے:

ملتی ہے کس کو اتنی عزت شرافتوں سے
تم کیسے بن گئے ہو یوں محترم اچانک

اس کے دشمن ہیں بہت آدمی اچھا ہوگا
وہ بھی میری ہی طرح شہر میں تنہا ہوگا

صنعتِ تعجب:

شعر میں کسی بات پر تعجب کا اظہار کرنا صنعتِ تعجب کہلاتی ہے۔ اس کا مقصد کسی کی تعریف میں مبالغہ کرنا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں چند اشعار دیکھیے:

کبھی کبھی یوں بھی ہم نے اپنے جی کو بہلایا ہے
جن باتوں کو خود نہیں سمجھے اوروں کو سمجھایا ہے

کچھ لوگ یونہی شہر میں ہم سے بھی خفا ہیں
ہر ایک سے اپنی بھی طبیعت نہیں ملتی

صنعتِ ترصیح:

جب شاعر شعر کے دونوں مصرعوں میں ہم وزن الفاظ کا استعمال ترتیب کے ساتھ کرتا ہے تو صنعتِ

ترصیح کہلاتی ہے۔ اس مناسبت سے نڈافاضلی کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

انسان میں حیوان یہاں بھی ہے وہاں بھی
اللہ نگہبان یہاں بھی ہے وہاں بھی

دیکھا ہوا سا کچھ ہے تو سوچا ہوا سا کچھ
ہر وقت میرے ساتھ ہے الجھا ہوا سا کچھ

صنعتِ تکرار:

جب کسی شعر یا مصرعے میں ہم معنی الفاظ کی تکرار کی جائے تو یہ صنعتِ تکرار کہلاتی ہے۔ اس صنعت کے استعمال سے شعر میں دل کشی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے نڈافاضلی کے چند اشعار دیکھے جاسکتے ہیں:

تنہا تنہا بھٹک رہا ہے انجانی سی راہوں میں
شاید اپنے ساتھ وہ اپنے شہر کو لانا بھول گیا

صدیوں صدیوں وہی تماشہ رستہ رستہ لمبی کھوج
لیکن جب ہم مل جاتے ہیں کھوجاتا ہے جانے کون

صنعتِ تحت النقط:

تحت النقط سے مراد وہ شعر یا مصرعے ہیں جن کے منقوہ حروف کے تمام نقطے نیچے آتے ہوں۔ اس ضمن میں چند اشعار پیش خدمت ہیں:

دیکھا گیا ہوں میں کبھی سوچا گیا ہوں میں
اپنی نظر میں آپ تماشا رہا ہوں میں

جاگے ملے ہیں کبھی سو رہے ہیں ہم
موسم بدل رہے ہیں بسر ہو رہے ہیں ہم

صنعتِ فوق النقط:

فوق النقط سے مراد وہ شعر یا مصرعے ہیں جن کے منقوہ حروف کے تمام نقطے اوپر آتے ہوں۔ اس حوالے سے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں:

کسی سے خوش ہے کسی سے خفا خفا سا ہے
وہ شہر میں ابھی شاید نیا نیا سا ہے

کسی بھی شہر میں جاؤ کہیں قیام کرو
کوئی فضا کوئی منظر کسی کے نام کرو

صنعتِ مقلوبِ مستوی:

اس سے مراد ایسے الفاظ مصرعے یا شعر جن کے تمام حروف علی الترتیب الٹنے کے بعد پھر سے وہی الفاظ، مصرعے یا شعر حاصل ہوں۔ نڈافاضلی نے اپنے کچھ اشعار میں اس صنعت کو بروئے کار لایا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

کاغذ کی لکیروں کا بھرم ٹوٹ رہا ہے
بے سمت سہی قافلے چلنے تو لگے ہیں

مچھلیاں نادان ہیں ممکن ہیں کھا جائیں فریب
پھر مچھیرے کا بھرے تالاب میں کانٹا گیا

صنعتِ مقلوبِ کل:

شعر میں ایک لفظ کے تمام حروف علی الترتیب الٹنے کے بعد دوسرا لفظ پیدا کرنا صنعتِ مقلوبِ کل کہلاتی ہے۔ مثال کے طور پر یہاں کچھ اشعار درج کیے جاتے ہیں:

کوشش کے باوجود یہ الزام رہ گیا
ہر کام میں ہمیشہ کوئی کام رہ گیا

جو ہو اک بار وہ ہر بار ہو ایسا نہیں ہوتا
ہمیشہ ایک ہی سے پیار ہو ایسا نہیں ہوتا

صنعتِ قطار البعیر :

شعر میں مصرعہ اول کے آخری لفظ اور مصرعہ ثانی کے پہلے لفظ کا ایک ہونا صنعتِ قطار البعیر کہلاتی ہے۔ اس سلسلے میں چند اشعار دیکھتے چلیں:

اس کا قصور یہ تھا بہت سوچتا تھا وہ
وہ کامیاب ہو کے بھی ناکام رہ گیا

خود سے ہی مل کے لوٹ آئے ہم
ہم کو ہر سمت آئینہ ہی ملا

صنعتِ تشابہ الاطراف :

اس سے مراد شعر کو ایسے الفاظ پر ختم کرنا ہے جو شعر کے ابتدائی الفاظ سے مناسبت رکھتے ہوں۔ اس تناظر میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

خدا کے ساتھ ہے شیطان بھی حکایت میں
ہر ایک خیر میں شر بھی خیال میں رکھیے

صرف آنکھوں سے ہی دنیا نہیں دیکھی جاتی
دل کی دھڑکن کو بھی بینائی بنا کر دیکھو

صنعتِ تفریق :

جب شاعر کلام میں ایک ہی نوع کی دو چیزوں میں فرق بیان کرتا ہے تو اسے صنعتِ تفریق کہتے ہیں۔ اس حوالے سے نڈافاضلی کا یہ شعر دیکھیے:

سادھو نے چھوڑا سب کو میں نے بھی ڈھونڈا رب کو
اس نے بسایا جنگل میں نے مکاں بنایا

صنعتِ جمع :

اس سے مراد شعر میں کئی چیزوں کو ایک جگہ جمع کرنا ہے۔ اس ضمن میں نڈافاضلی کا ایک شعر درج کیا

جاتا ہے:

کوشش بھی کر امید بھی رکھ راستہ بھی چن
پھر اس کے بعد تھوڑا مقدر تلاش کر

صنعتِ تعلّی:

جب شاعر کلام میں اپنی فن کاری اور عظمت کا اعتراف کرتا ہے تو وہ صنعتِ تعلّی کہلاتی ہے۔ اس
حوالے سے نڈافاضلی کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

ہمارا میر جی سے متفق ہونا ہے ناممکن
اٹھانا ہے جو پتھر عشق کا تو ہلکا بھاری کیا

میر و غالب کے شعروں نے کس کا ساتھ نبھایا ہے
ستے گیتوں کو لکھ لکھ کر ہم نے گھر بنوایا ہے

صنعتِ لف و نشر:

لف و نشر کے لفظی معنی ”پھیلنے اور پھیلانے“ کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں اس سے مراد پہلے
مصرعے میں چند چیزوں کو جمع کرنا اور دوسرے مصرعے میں ان چیزوں کے مناسبات کو بیان کرنا ہے۔ مثال
کے طور پر یہ شعر ملاحظہ کریں:

اسی کے چلنے پھرنے ہنسنے رونے کی ہیں تصویریں
گھٹا کیا چاند کیا سنگیت کیا بادِ بہاری کیا

صنعتِ سوال جواب:

جب شاعر شعر میں سوال و جواب کے ذریعے مکالمے کی صورت پیدا کرتا ہے تو اسے صنعتِ سوال
جواب کہتے ہیں۔ بطور نمونہ نڈافاضلی کا یہ شعر دیکھیے:

وہ روپ تھا یا رنگ تھا ہر پل جو میرے سنگ تھا
میں نے کہا تو کون ہے اس نے کہا تیری نظر

فارسی مرکب اضافی:

دو کلمات کے درمیان زیر سے اضافت پیدا کرنا مرکب اضافی کہلاتا ہے۔ یہ طریقہ فارسی اضافت کا
ہے مگر اردو میں بھی یہ رائج ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

خونِ دارا قتلِ سرمد کے علاوہ شہر میں
کون ہے جو سر اٹھائے بادشاہت کے خلاف

جہاں سیلاب آتا ہے وہاں کشتی بھی ہوتی ہے
اتر جائے زمیں زیر زمیں ایسا نہیں ہوتا

پیکر تراشی:

پیکر تراشی یا امیجری دراصل وہ تصویر ہے جو شاعری کے مطالعے سے ذہن میں بنتی ہے۔ نڈا فاضلی
کی شاعری کا ایک خاص وصف ان کی پیکر تراشی ہے جس میں ان کی قوتِ یادداشت کو ایک اہم مقام حاصل
ہے۔ وہ غنائی شاعری کے پرستار ہیں اور کبھی کبھی حسن و عشق کی وادیوں میں بھی سرگوشیاں کرتے ہوئے
دکھائی دیتے ہیں۔ وہ رومان اور محبت کی ایک سیاسی صورت بناتے ہیں جس میں ہر قاری اپنی عقیدت تلاش
کرنے لگتا ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

لہلہاتے پھولوں میں تیرا ذکر شادابی
شاخ شاخ پر تیرے نام کو ہرا دیکھوں

جب بھی کسی نگاہ نے موسم سجائے ہیں
تیرے لبوں کے پھول بہت یاد آئے ہیں

زبان و بیان:

نڈا فاضلی نے اپنی غزلیہ شاعری میں عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ انھوں نے صاف،
سلیس اور سادہ الفاظ میں اپنی بات قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی زبان میں تصنع نہیں ہے۔
ان کی شاعری کا حاوی رنگ سادگی و پرکاری ہے۔ ان کی زبان شیریں ہے۔ دراصل انھوں نے اپنی شاعری
میں صوفی سنتوں کی زبان اور گھر آنگن میں بولی جانے والی زبان کو وسیلہٴ اظہار بنایا۔ وہ اپنی شاعری کی زبان
کے تعلق سے کہتے ہیں:

”اس شاعری کی زبان بھی اس کے موضوعات کی طرح نہ چہرہ پرداڑھی سجاتی ہے، نہ ماتھے پر تلک لگاتی ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو صوفی سنتوں کی زبان تھی۔ جو گھر آنگن اور گلی کو چوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور انسانی رشتوں سے جگمگاتی ہے۔ یہ درباروں کی نہیں بازاروں کی زبان ہے۔ اس شاعری کا مزاج عوامی، احتجاجی اور مسائلی ہے جو ترقی یافتہ ممالک کے برعکس تیسری دنیا کی ان مسائلی اقدار سے زیادہ قریب ہے۔ جہاں ابھی سب کچھ بازار میں تبدیل نہیں ہوا ہے۔ جہاں ایک دوسرے کے درمیان مکالمہ بھی زندہ ہے، خواب بھی باقی ہے اور خواب کا تعاقب بھی جاری ہے۔ میں نے اسی مکالمہ اور خواب کی روشنی میں زندگی کو پڑھا اور لکھا ہے۔ یہی میری ذات کا آئینہ ہے۔“ 24

ندا فاضلی اپنی زبان وہاں سے اٹھاتے ہیں جہاں سے شائستہ ادیبوں کا گزر ممنوع رہا ہے۔ زبان کے تعلق سے یہ رویہ ان کی طاقت ہے۔ طاقت اس اعتبار سے کہ عام بول چال کے الفاظ قاری کو فوراً متوجہ کر لیتے ہیں:

ہم نے بھی سوکر دیکھا ہے نئے پرانے شہروں میں
جیسا بھی ہے اپنے گھر کا بستر اچھا لگتا ہے

خدا کی دنیا میں جینا بھی اک عبادت ہے
ہے کون اچھا برا یہ حساب رہنے دے

ان اشعار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شاعری کا رنگ و آہنگ سادہ اور آسان ہے۔ زبان کی سادگی و صفائی نے اس روایتی آہنگ کی آمیزش سے ایک نئی فضا تیار کی ہے۔ ان کی زبان تصویری ہے۔ وہ اپنے شعری رویے کے ذریعے اس لوک وراثت سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں اردو کی حصے داری بہت کم نظر آتی ہے۔ عبدل احسن کو دیے گئے ایک انٹرویو میں ندا فاضلی اپنی شعری زبان سے متعلق کہتے ہیں:

”میرے یہاں لاشکل الفاظ کی جگہ تصویروں کے ذریعے بات کہنے کی ترجیح ہے۔ میری شعری زبان اردو کی رائج شعری زبان سے کسی حد تک

الگ ہے۔ اس میں زمین کو سوچا نہیں بلکہ دیکھا گیا ہے۔ میں نے لاشکل کو بھی تصویریت کے میڈیم میں لانے کی کوشش کی ہے اور اس شعری رویے کے ذریعے اس لوک وراثت سے رشتہ جوڑنے کی سعی کی ہے جس میں اردو کی حصے داری نہ ہونے کے برابر تھی۔“ 25

نہا فاضلی نے اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کا مطالعہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ کیا۔ اسی لیے ان کی شاعری میں تنوع کے ساتھ ساتھ مفکرانہ شان بھی پائی جاتی ہے۔ وہ سادہ الفاظ کا غیر معمولی اور انوکھا استعمال کرتے ہیں۔ بہ ظاہر سادہ نظر آنے والا شعر بھی اپنے اندر وسعت اور گہری معنویت چھپائے رہتا ہے۔ وہ زندگی کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کو بھی سہل الفاظ کے ساتھ رواں دواں اشعار میں ڈھالنے کے ہنر سے بہ خوبی واقف ہیں۔ اس حوالے سے چند اشعار دیکھیے:

داناؤں کی بات نہ مانی کام آئی نادانی ہی
سنا ہوا کو پڑھا ندی کو موسم کو استاد کیا

وقت کے ساتھ ہے مٹی کا سفر صدیوں سے
کس کو معلوم کہاں کے ہیں کدھر کے ہم ہیں
یہ حقیقت ہے کہ نہا فاضلی عرب ایرانی اثرات کی حامل اردو شاعری کی روایتی زبان سے مطمئن نہیں تھے۔ ترقی پسندوں سے انھیں یہ شکایت رہی کہ وہ عوامی موضوعات کے لیے بھی اشرافیہ کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انتہائی سلیس اور ہندی آمیز زبان کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ وہ شاعری کی زبان کو لائبریریوں میں تلاش نہیں کرتے بلکہ بازاروں اور چوراہوں میں اس کی تلاش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں:

”جہاں تک میرا سوال ہے۔ میں نے اپنی زبان کو تجربے کی آنکھوں سے تلاش کیا۔۔۔ اس لیے میں شاعری کی زبان کو لائبریریوں میں تلاش کرنے نہیں گیا بلکہ میں نے اسے تلاش کیا گلیوں، چوراہوں، بازاروں اور کوٹھوں وغیرہ پر۔ اس لیے کہ ان مقامات پر ہی ایک جاندار اور زندہ زبان مل سکتی ہے۔“ 26

نہا فاضلی کی شاعری میں درآئی زیادہ تر علامتیں اور تشبیہات ہند آریائی تہذیب کی دین ہیں۔ اس

دھرتی کی بوباس، ریت رواج اور انسانی جذبات و احساسات کا جتنا بھرپور اظہار ان کی شاعری میں ہوا ہے وہ ان کے معاصرین کے یہاں نظر نہیں آتا۔ ان کا بیانیہ عموماً کسی بھی طرح کے ابہام یا پیچیدگی سے دور ہے۔ ان کی شاعری کو سہل ممتنع کی شاعری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کو اردو اور ہندی دونوں حلقوں میں قبولِ عام حاصل ہے۔

لب و لہجہ:

اردو شاعری میں لب و لہجے کی اہمیت ہمیشہ سے رہی ہے۔ لہجہ اردو شاعری کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ لہجہ وہ مؤثر ذریعہ ہے جو شاعر اور سامع کو براہِ راست جوڑتا ہے۔ جہاں تک نڈا فاضلی کے لہجے کی بات ہے تو ان کی غزلوں میں ایک نیا لہجہ نظر آتا ہے۔ ان کا لہجہ پر اثر ہے۔ لہجے کی تازگی اور فکر کی گہرائی سے وہ دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ اپنے لہجے اور موضوع کو ہم آہنگ کرنے کا گر جانتے ہیں۔ اس حوالے سے بشر نواز اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں:

”انھوں نے (نڈا فاضلی) کرتب بازیوں اور لفظی کلیشز میں الجھے بغیر اپنا لہجہ پالیا۔ وہ اپنے موضوع اور لہجے کو ہم آہنگ کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور اپنے اندازِ اسلوب سے جدید شاعروں کی بھیڑ میں الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔“ 27

نڈا فاضلی کی شاعری کو ترقی پسندی کی رخصت اور جدیدیت کی آمد کے گورکھ دھندوں میں الجھنا ظلم سے کسی طور کم نہ ہوگا۔ کیوں کہ ان کا لہجہ ان کا اپنا لہجہ ہے۔ انھوں نے دونوں فکری و ذہنی رویوں سے اپنی راہ الگ نکالی ہے۔ انھوں نے بے تکلفی سے غزل کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے جس سے ان کے لب و لہجے میں شیرینی پیدا ہوگئی۔ ان کا لہجہ ہر وقت نرم، کوئل اور احساسات سے بھرپور ہے۔ ان کے لہجے کی خوبی یہ ہے کہ اگر ان کا نام ان کے اشعار کے ساتھ نہیں بھی لکھا جائے تو بھی ان کا لہجہ منفرد نظر آئے گا۔ اس سلسلے میں شاہ نواز قریشی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

”نڈا کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اشعار ان کا نام لکھے بغیر لکھ دیے جائیں تو ان کا لہجہ بتا دیتا ہے کہ یہ اشعار نڈا فاضلی کے ہیں۔“ 28

نَدَافاضلی نے اپنے شعری اظہار کے لیے عربی فارسی کے اثر سے آزاد وہ زبان اور لہجہ اختیار کیا ہے جس میں ہندستانی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبورچی بسی ہے۔ اگرچہ یہ لہجہ میر تقی میر کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے لیکن نَدَافاضلی کے یہاں ان کا خالص ہندستانی لب و لہجہ پورے شعری منظر نامے پر حاوی نظر آتا ہے۔ ان کے لہجے میں سادگی کے ساتھ ساتھ گہرائی بھی پائی جاتی ہے۔ اس ضمن میں چند ایک اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

ہر گھڑی خود سے الجھنا ہے مقدر میرا
میں ہی کشتی ہوں مجھی میں ہے سمندر میرا

آئینہ دیکھ کے نکلا تھا میں گھر سے باہر
آج تک ہاتھوں میں محفوظ ہے پتھر میرا

اپنی مرضی سے کہاں اپنے سفر کے ہم ہیں
رخ ہواؤں کا جدھر کا ہے ادھر کے ہم ہیں

مذکورہ بالا اشعار میں نَدَافاضلی کا لہجہ منفرد نظر آتا ہے۔ پہلے شعر میں خود ہی کشتی اور سمندر ہونا اور ہر گھڑی خود سے الجھتے رہنے کو مقدر کہنا ذات کے اندر کی کشمکش کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ دوسرے شعر میں یہ احساس بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ دوسروں پر پھینکنے کے لیے ہاتھوں میں جو پتھر اٹھایا تھا، آئینہ دیکھا تو وہ پتھر آج بھی محفوظ نظر آتا ہے۔ تیسرے شعر میں اپنی کشتی حیات کو ہواؤں کے رخ کا محتاج قرار دینا جبر کے فلسفے کا مظہر ہے۔ اس شعر میں وہ انسان کو اس ازلی جبر کا شکار کہنا چاہتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے آدم خاکی کی تخلیق کی تھی۔ ان کی غزلوں کی کامیابی کا راز ان کے لہجے میں پوشیدہ ہے۔ انھوں نے عصر حاضر کے کرب کو اپنے اشعار میں مؤثر لہجے میں بیان کیا ہے۔

نَدَافاضلی 1960 اور 1970 کی دہائی کے بعد ابھرنے والے شعرا میں اپنی مخصوص فکر، اپنے مخصوص اسلوب اور اپنی مخصوص زبان کی بنیاد پر اہم مقام و مرتبے کے حامل ہیں۔ وہ زندگی کا فلسفہ ہمیں اس طرح سمجھاتے ہیں جس کے کئی رنگ ہیں۔ کئی انداز میں کیا ہوا سفر ہے، جس میں شہر، گاؤں، دھوپ، چھاؤں، آندھی، بجلی، طوفان، رشتے، ناتے، برسات، بادل، تہوار غرض ایک بھٹکتے ہوئے بخارے کا منظر نامہ

بیان کیا گیا۔ ان کی غزلیہ شاعری کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے یہاں جدید دور کے بیشتر موضوعات مثلاً شہر کی ویرانی، لوگوں کی بے حسی و بے رخی، کھوئے ہوئے گھر کی تلاش، رشتوں کی تبدیلی، تلاشِ ذات، اجنبیت، بے چہرگی، تنہائی، تہذیبی اقدار کی پامالی وغیرہ جامعیت اور اثر آفرینی کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی شاعری روایت سے توانائی حاصل کرتی ہے اور جدیدیت سے یاری بھی نبھاتی ہے۔ نیز اردو غزل کے مہکتے ہوئے چمن میں انھوں نے اپنے وطن کی بوباس بھی شامل کر دی ہے جو ایک قابلِ ستائش عمل ہے۔

غرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ نذافاضلی ایک ذہین شاعر ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کی روش کو بعض نئی جہتیں دینے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ جدیدیت سے وابستگی کے باعث اور اپنے لب و لہجے کی ندرت کو قائم رکھنے کے سبب ان کے یہاں ایسے الفاظ، ترکیبیں اور کہیں کہیں مصرعے بھی آگئے ہیں جن میں ان کے لب و لہجے کی اختراعی قوت اور سلامت روی کلی طور پر قائم نہیں رہ سکی۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں زندگی کی صداقتوں اور انسانی رشتوں کی نزاکتوں کو نہایت عمدگی اور فنی مہارت کے ساتھ برتا ہے۔ اردو کی جدید شاعری نذافاضلی کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔

حواشی:

- 1 دیواروں کے باہر، ندافاضلی، ص: 197/198
- 2 میر کی آپ بیتی، مرتب ثار احمد فاروقی، ص: 33
- 3 ندائے احتجاج، وسیم فرحت کارنجوی، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 168
- 4 ندائیک آکس برگ، م۔ ناگ، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 28
- 5 ندافاضلی کی شاعری، یعقوب یاور، مشمولہ ندافاضلی، مرتب پروفیسر علی احمد فاطمی، ص: 88
- 6 ندافاضلی اور ہندستانی مشترکہ تہذیب، وسیم بیگم، سہ ماہی فکر و تحقیق، ص: 77
- 7 شعور بشر کی تمثیلی پیکریت کا شاعر، احمد سہیل، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 144
- 8 لفظوں کا پل، ندافاضلی، مشمولہ شہر میں گاؤں، ص: 26
- 9 جدید شاعری کا معتبر نام: ندافاضلی، وارث علوی، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 66
- 10 میر تخلیقی سفر، ندافاضلی، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 50
- 11 ایضاً، مشمولہ ماہ نامہ خبرنامہ، ص: 11
- 12 ندافاضلی کی علمی و فلمی شخصیت، کلیم ضیا، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 171
- 13 میر تخلیقی سفر، ندافاضلی، مشمولہ ماہ نامہ خبرنامہ، ص: 12/13
- 14 میر تخلیقی سفر، ندافاضلی، مشمولہ ندافاضلی، مرتب پروفیسر علی احمد فاطمی، ص: 189
- 15 ایضاً، ص: 191
- 16 میر تخلیقی سفر، ندافاضلی، مشمولہ ماہ نامہ خبرنامہ، ص: 15
- 17 ندافاضلی: حیات و جہات، محمد یوسف رضا، ص: 238
- 18 ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ص: 162
- 19 جدید شاعری کا معتبر نام: ندافاضلی، وارث علوی، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 69
- 20 ندافاضلی کا تخلیقی سفر، سیفی سرونچی، ص: 96
- 21 ندافاضلی کی شاعری کے چند پہلو، پروفیسر ظہیر علی، مشمولہ اعتراف، ص: 119
- 22 زندگی کا مقدر سفر در سفر، محمد عرفان، مشمولہ ندافاضلی، مرتب پروفیسر علی احمد فاطمی، ص: 172

23 جے جدید شاعری کا معتبر نام: نڈافاضلی، وارث علوی، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 55

24 جے دیواروں کے باہر، نڈافاضلی، ص: 198

25 جے نڈافاضلی کی شاعری میں تصویریت، عبدالاحد ساز، مشمولہ نڈافاضلی، مرتب پروفیسر علی احمد فاطمی، ص:

98/99

26 جے زندہ زبان کا متلاشی: نڈافاضلی، نفیس عبدالحکیم، مشمولہ نڈافاضلی، مرتب پروفیسر علی احمد فاطمی، ص: 152

27 جے نڈافاضلی: اپنے لہجے کی دریافت، بشر نواز، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 80

28 جے نڈافاضلی کسی اسلوب کے اسیر نہیں، نئی زمین تلاشنے میں کامیاب، شاہ نواز قریشی، مشمولہ نیا دور، ص:

53

﴿نَدَافِ ضَلٰی کی نظمیں﴾

وہ کلام جو انسان کے جذبات کو متحرک کرے شاعری کے زمرے میں آتا ہے۔ جذبات کے بغیر شاعری کا تصور ممکن نہیں ہے۔ فنونِ لطیفہ میں شاعری ایک بلند پایہ فن کی حیثیت رکھتی ہے جس کی تعمیر و تشکیل میں مختلف عناصر کا رفرما ہوتے ہیں۔ یہ عناصر اس لطیف انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں کہ ان کو علاحدہ کرنا ان کی جمالیاتی زندگی کو بے رونق کر دینے کے مترادف ہے۔ خیالات و جذبات، اقدار و روایات، مدح و ذم اور حالات و واقعات وغیرہ کو غیر معمولی انداز میں موزوں کر کے پیش کرنا شاعری کہلاتا ہے۔ شبلی نعمانی شاعری کو ذوقی اور وجدانی چیز قرار دیتے ہیں۔ شاعری میں انسان کی فطری دل چسپی کے علاوہ جمالی دل چسپی بھی ہوتی ہے۔ یہ انسان کے افکار و خیالات کے اظہار کا ایسا ذریعہ ہے جو پڑھنے اور سننے والوں کے دلوں کو متاثر کرتا ہے اور روح کو تسکین بخشتا ہے۔ شاعری کی افادیت و اہمیت سے متعلق پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اپنی کتاب ”ہماری شاعری“ میں رقم طراز ہیں:

”شاعری بے حس قوتوں کو چونکاتی ہے، سوتے احساس کو جگاتی ہے،
مردہ جذبات کو جلاتی ہے، دلوں کو گرماتی ہے، حوصلوں کو بڑھاتی ہے،
مصیبت میں تسکین دیتی ہے، مشکل میں استقلال سکھاتی ہے، بگڑے
ہوئے اخلاق کو سنوارتی ہے اور گری ہوئی قوموں کو ابھارتی ہے۔“¹

نظم کے لغوی معنی لڑی، انتظام، بندوبست، کلامِ موزوں وغیرہ ہیں۔ یہ ایک مسلسل اور مربوط صنفِ سخن ہے جس کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے۔ اس کے لیے نہ کوئی ہیئت مقرر ہے اور نہ اشعار کی تعداد پر کوئی پابندی ہے۔ یہ مختصر بھی ہو سکتی ہے اور طویل بھی۔ اس میں شاعر مختلف خیالات، واقعات، احساسات اور مناظر وغیرہ کی عکاسی کرنے کے لیے ذاتی اور انفرادی تاثر کا اظہار کرتا ہے۔ یہ کسی بھی موضوع اور عنوان پر لکھی جاسکتی ہے تاہم اس کے اشعار میں خیالات کا تسلسل لازمی ہے۔ وسیع تر مفہوم میں نظم سے مراد پوری شاعری ہے لیکن شاعری کے باب میں غزل کے ماسوا تمام اصنافِ شعر کو نظم کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں شمس الرحمن فاروقی کی کتاب ”تنقیدی افکار“ کا اقتباس ملاحظہ کریں:

”ہر وہ منظومہ جو غزل نہیں ہے، نظم ہے اور نظم کی بنیادی صفت وحدت
ہے، جس کا ایک تفاعل ربط و تسلسل ہے۔ یہ ربط و تسلسل کئی طرح کا ہوتا
ہے اور ہر نظم کے ساتھ اور ہر قسم نظم کے ساتھ بدلتا بھی رہتا ہے۔“²

اردو نظم نگاری کی ابتدا دکن میں ہوئی۔ اس کے ابتدائی نقوش مذہبی اور صوفیانہ نظموں میں نظر آتے

ہیں۔ قلی قطب شاہ کے کلام میں مختلف موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں۔ انھوں نے شبِ برات، عید، بسنت، برسات اور حسن و عشق کا بیان بڑے دل کش انداز میں کیا ہے۔ ان کی نظموں کے موضوعات عوامی زندگی سے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ شمالی ہند میں اردو نظم نگاری کی ابتدا سترہویں صدی میں ہوئی۔ محمد افضل اور جعفر زہلی کے یہاں اردو نظم کے ابتدائی نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی میں اردو شاعری کا ایک اہم دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے شعرا میں فائز اور حاتم کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

اردو نظم نگاری میں نظیر اکبر آبادی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی نظموں کے مطالعے سے ہم زندگی کے گونا گوں مشاہدات سے دوچار ہوتے ہیں۔ سماجی زندگی کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ رسم و رواج، تہوار، کھیل کود، بچپن، جوانی، برسات، گرمی، چرند و پرند غرض ہم جس فضا اور ماحول میں سانس لیتے ہیں، اس کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ ان کی شاعری کو کسی ایک دائرے میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر ان کی نظر نہ گئی ہو۔ انھوں نے عوامی موضوعات کو عوامی زبان میں پیش کیا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب معاشرہ تغیر و تبدل کی منزل سے گزرتا ہے تو اس سے انسانی ذہن بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ جب انسانی ذہن میں تبدیلیوں کا آغاز ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں فکر و خیال کے نئے نئے گوشے وجود میں آتے ہیں۔ 1857 کی ناکام جدوجہد آزادی کے بعد ہندوستانی معاشرہ جس سیاسی، تہذیبی معاشی اور ثقافتی انقلاب و انتشار سے دوچار ہوا، اس نے ہمارے مفکروں، دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کے ذہن و دماغ پر گہرے نقش ثبت کیے۔ ان دانشوروں نے مفاہمت سے کام لیتے ہوئے مغربی علوم و فنون کی طرف توجہ دی جس کے زیر اثر مغربی علوم، نیچر، سائنس، مادیت اور ارضیت جیسی چیزوں کو بنیادی قدروں کی صورت میں قبول کیا جانے لگا۔ جدید نظم نگاری کا آغاز بھی اسی دور میں ہوا جو بہت حد تک انجمن پنجاب کی رہنمائی میں تھا۔ 21 جنوری 1865 کو انجمن پنجاب کا قیام عمل میں آیا۔ محمد حسین آزاد اس انجمن کے سکریٹری تھے۔ 9 اپریل 1874 کو محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں ایک لیکچر دیا اور ساتھ ہی مثنوی ”شب قدر“ سنائی تھی۔ یہاں سے اردو نظم نگاری کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ آزاد اور حالی نے نہ صرف عملی طور پر نظم نگاری کی طرف توجہ دی بلکہ فکری اعتبار سے بھی نظم نگاری کے لیے ایک سازگار فضا اور ماحول پیدا کیا۔

نظم جدید کی جو تحریک آزاد اور حالی نے شروع کی تھی وہ بیسویں صدی کے اوائل تک اپنے پورے قد و قامت کے ساتھ کھڑی نظر آرہی تھی۔ اس زمانے میں حالی نے بہت سی ایسی نظمیں تخلیق کیں جو اتحاد قومی و ملی نقطہ نظر سے آج بھی ملت کا عظیم سرمایہ سمجھی جاتی ہیں۔ حالی نے ان نظموں میں انسانی رشتوں کی اہمیت کے پس منظر میں وہ افکار پیش کیے ہیں جن پر معاشرے کی بنیادیں مضبوطی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ حالی کے ہم عصروں میں دوسرا نام اکبر الہ آبادی کا ہے جو قدامت پرستی کے علم بردار ہوتے ہوئے بھی جدید شعری رویے کے منکر نہیں ہیں۔ انھوں نے وقت کے تقاضوں کو محسوس کر لیا تھا لیکن پرانی قدروں کو بھول کر نئی قدروں کا استقبال کرنے کی کوشش کرنے والوں کے خلاف وہ نشتر زنی سے کام لیتے تھے جس کی زد میں سرسید احمد خاں کی ذات گرامی بھی آگئی۔ انھیں اپنی قدریں بہت زیادہ عزیز تھیں۔ اسی لیے وہ مشرقی اقدار کی رفعتوں سے کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کو ضمیر فروشی سے تعبیر کرتے تھے۔ حالی اور اکبر الہ آبادی کے ہم عصروں میں شبلی اور اسماعیل میرٹھی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ شبلی نے نظم نگاری کی طرف خاص توجہ نہیں دی۔ اسماعیل میرٹھی نے آسان زبان میں بچوں کے لیے بہت خوب نظمیں لکھیں جن میں زیادہ تر اصلاحی رجحان غالب ہے۔

بیسویں صدی کا آغاز جدید اردو نظم کے لیے ایک نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس دور میں اردو نظم نئی آواز سے روشناس ہوئی۔ موضوعات میں سماجی تغیرات کی علامت جاگی، قومی مسائل کو اولیت ملی، انسانی اقدار کو ترجیح دی گئی، ملی و سیاسی شعور میں پختگی آئی، قومی اور بین الاقوامی مسائل کا ذکر نظموں میں شروع ہوا۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز 1936 میں ہوا۔ یہ تحریک باقاعدہ ادبی منصوبہ بندی کے ساتھ میدان ادب میں آئی۔ اس تحریک کا مقصد ادب اور زندگی کے درمیان رشتوں کو استوار کرنا تھا۔ اس تحریک کے نمائندہ شاعروں میں علی سردار جعفری، جوش ملیح آبادی، اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، کیفی اعظمی، جذبی، مخدوم محی الدین، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی وغیرہ شامل ہیں۔ اس تحریک نے مزدوروں، کسانوں اور عام آدمی کے مسائل کو موضوع بنایا۔ ترقی پسند شعرا نے اپنے اپنے حدود میں زندگی کے مسائل کی ترجمانی کی۔ اس دور کی نظموں میں زیادہ گہرائی اور اثریت پائی جاتی ہے۔ ان شعرا کی شاعری میں شدت، احساس، تفکر، شعور، آگہی اور زندگی کا واضح نقطہ نظر ملتا ہے۔ وقت اور ماحول کی مناسبت سے شعری فکر راستہ بدلتی ہے۔

اقبال اور سرور جہاں آبادی نے اپنی نظموں میں موضوعی دائرے کو وسعت بخشی اور اس نئے رجحان کی پرورش میں حصہ لیا۔ اقبال کی شاعری کا نظریہ حیات شخصی نہیں اجتماعی ہے۔ ان کی بیشتر نظمیں حصول

آزادی کا مصدر نامہ ہیں۔ چکبست کی نظموں میں وطنیت کے جس نئے تصور نے جنم لیا اس نے جذبات کی حدیں توڑ کر اجتماعیت کو زندہ کر دیا۔ ان شعرا کے علاوہ اس دور میں کچھ ایسے بھی شاعر ہیں جنہوں نے مختلف موضوعات پر ایسی نظمیں تخلیق کیں جو ہیبتی اور فنی اعتبار سے بہت قیمتی ہیں۔ ان میں جذباتی، سماجی اور تہذیبی عوامل کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ تصویریں نئے رجحان کی عکاس ہیں۔ اس ضمن میں جوش ملیح آبادی کا نام زیادہ فعال نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری رومان اور انقلاب کا امتزاج ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں مشاہدات و تجربات کی ایسی قذیلیں جلائیں جنہیں مخالف ہوائیں بھی نہ بجھا سکیں۔

اردو نظم نگاروں کا یہی ایک قافلہ نہیں تھا جو اردو نظم کو حقیقت نگاری کے بام عروج پر لے جا رہا تھا بلکہ اس گروہ کے ساتھ ایک اور گروہ حلقہٴ ارباب ذوق کے نام سے ابھرا۔ حلقہٴ ارباب ذوق کے شعرا میں میراجی، ن۔ م راشد، قیوم نظر اور یوسف ظفر زیادہ اہم ہیں۔ جس طرح انسانی زندگی اور اس کی تہذیب و معاشرت میں تبدیلیاں آتی ہیں، اسی طرح زبان و ادب میں بھی تبدیلیاں آتی ہیں۔ وہ ادیب یا شاعر جس کے یہاں وقت کی پکار اور زمانے کا اضطراب موجود ہو حقیقتاً وہی زندہ ادیب یا شاعر ہوتا ہے۔ ادب ایک سماجی عمل ہے اور ہر سماجی عمل میں انسانی زندگی اور اس کے احساسات سے وابستگی ضروری ہے۔ وہی سچا ادب ہے جس کا رشتہ زمین سے ہو۔ زمینی رشتہ ہی ادب کی خون سے آبیاری کرتا ہے۔ یہی ادب وقت اور ماحول کا نقیب ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ادب کے خط و خال میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی، نئے رنگ و آہنگ اور نئے اسلوب کی بازیافت عمل میں آئی۔

1955 کے آس پاس جدیدیت کا آغاز ہوا۔ اردو نظم نگاری میں نئی نئی ترکیبوں اور علامتوں کا استعمال ہونے لگا۔ اس دور کی نظموں میں تنہائی، وحشت، ناامیدی، ڈر، انتشار وغیرہ جیسے عناصر نظر آتے ہیں۔ اس دور میں نظموں کے اسلوب میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ اس دور کے شعرا میں وحید اختر، قاضی سلیم، کمار پاشی، عتیق حنفی، بلراج کول، محمد علوی، ندافاضلی، زبیر رضوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ندافاضلی کا تخلیقی سفر جس دور میں شروع ہوا، وہ ذہنی انتشار کا دور تھا۔ انسانی قدروں کی پامالی، خون ریزی، وطن کا ہٹوارہ، اپنوں سے چھڑنے کا غم اور بے سروسامانی اس دور کی پہچان تھی۔ ان کی نظموں کا خمیر انہی حالات و معاملات سے اٹھا تھا۔ انہوں نے ان تمام حالات و معاملات کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنی نظموں میں بیان کیا۔ ان کی نظموں میں ان کی ذہنی کشمکش اور بیتے ہوئے لمحات کی یادیں نمایاں ہیں۔ ان کی

نظمیہ شاعری میں تصوف، فکر و فلسفہ اور جذبے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی نظمیں داخلی احساسات کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی ان کی نظموں کا بغور مطالعہ کرتا ہے تو اسے ان میں اپنا عکس نظر آتا ہے۔

نہا فاضلی نے اپنے دکھ درد کو اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ انھوں نے اس کو عصری بنا دیا۔ وہ دوسروں کے غم کو اپنا غم سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنی نظمیں شاعری میں خیال و احساس کو جس خوبی سے بیان کیا ہے، وہ اپنے آپ میں منفرد ہے۔ ان کی نظموں میں تہذیبی و ثقافتی نقوش کی مرقع کشی نظر آتی ہے۔ زندگی کے تمام رموز اور محرکات کو وہ اپنی نظموں کا موضوع بناتے ہیں۔ ان کی شاعری تصنع سے کوسوں دور دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا، اس کا اظہار اپنی شاعری میں کیا۔ انھوں نے روایتی موضوعات کو نئے اسلوب میں پیش کیا ہے۔

نہا فاضلی سیکولر ذہن کے شاعر ہیں۔ انھوں نے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شہرت و مقبولیت پائی۔ ان کا شمار اپنے دور کے صفِ اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری عوامی عناصر، غنائیت اور انسان دوستی کے رویے کی وجہ سے عوام و خواص میں مشہور و مقبول ہے۔ ان کی نظموں میں مشترکہ تہذیب اور قومی شعور کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں احساس کی لطافت اور فکر کی گہرائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے جو قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔ ان کی غزلوں کی طرح ان کی نظموں میں بھی موضوع کا تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں قدرتی مناظر سے ہم آہنگی کا احساس بھی ملتا ہے۔ فرقہ واریت اور تنگ نظری سے ان کا دور کا بھی رشتہ نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کے پیغام کو عام کیا۔ وہ اپنی نظمیں شاعری میں سوز و غم، ظلم و ستم اور حالات کے جبر کو بڑے فن کارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں غیر مانوس الفاظ سے اجتناب کرتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کو دل کش اور موثر بنانے کے لیے سادہ اور آسان الفاظ کو بروئے کار لاتے ہیں۔ راقم الحروف نے مطالعے کی آسانی کے لیے نہا فاضلی کی نظموں کو مختلف موضوعات میں منقسم کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(1) عشقیہ موضوعات

(2) سماجی و آفاقی موضوعات

(3) قومی یکجہتی

(4) فرقہ وارانہ فسادات اور سیاسی موضوعات

(5) مذہبی موضوعات

(6) ہندوستانی تہذیب

(7) رشتوں کی اہمیت

(1) عشقیہ موضوعات:

نذا فاضلی نے اپنی نظمیں شاعری میں جو عشقیہ موضوعات سمیٹے ہیں، وہ غم اور نشاط کی ہم آہنگی سے ایک نئی دنیا کی تعمیر کرتے ہیں۔ انھوں نے محبوب کے حسن کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں حسن و عشق کی ظاہری و باطنی دونوں کیفیات کو بروئے کار لایا ہے۔ وہ حسن و عشق کا بیان اس فن کاری سے کرتے ہیں کہ اس میں ہندوستانی تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کی رومانی نظموں کا غائر مطالعہ کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ان میں جنسی جذبہ نہیں ابھرتا بلکہ شائستگی اور پاکیزگی ابھرتی ہے۔ ان کی رومانوی نظموں میں ”وقت سے پہلے“، ”ایک خط“، ”اسے سمندر بلارہا ہے“، ”شکایت“، ”بے خبری“، ”فاصلہ“، ”دیوانگی رہے باقی“، ”انتظار“، ”سمجھوتا“، ”ایک مسکراہٹ“ اور ”چھوٹی سی ہنسی“ قابل ذکر ہیں۔ اس حوالے سے ان کی نظم ”اسے سمندر بلارہا ہے“ پیش خدمت ہے جس میں رومانیت الفاظ کے پیکر میں ڈھل کر ایک الگ سماں پیش کرتی ہے:

چمکتے بتیس موتیوں والی مسکراہٹ / کھلا ہوا بادلان جیسے

ڈھلا ہوا آسمان جیسے / سحر کی پہلی اذان جیسے

پتہ نہیں نام کیا ہے اس کا / خبر نہیں کام کیا ہے اس کا

وہ ٹھیک چھنچ کے بیس کی ایک جگمگاہٹ / اتر کے ہونٹوں سے

یوں میرے ساتھ چل رہی ہے / نہ چھاؤں کچھ کم ہے راستوں سے

نہ دھوپ زیادہ نکل رہی ہے / میں جس طرح سوچتا تھا

بستی اسی طرح سے بدل رہی ہے / یہ ایک ستارہ

جو میری آنکھوں میں دیر سے جھلملا رہا ہے / اسے سمندر بلارہا ہے

اس نظم میں رومانیت ایک الگ انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اس میں ایک ایسی لڑکی کی کہانی کو نظم کیا

گیا ہے جو ندا فاضلی سے انسیت رکھتی تھی۔ اس کے آنے جانے کے وقت سے لے کر اس کے ہنسنے اور ساتھ چلنے کی کیفیات کو انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ رومانیت حد سے تجاوز نہیں کرتی۔ ان کی رومانوی نظموں میں ”ایک خط“ بھی اہم ہے۔ وہ اس لیے کہ اس میں انھوں نے اپنی ایک دیرینہ معشوق کی تجدید ملاقات کی پیش کش پر اپنے گریز کا دل کش پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔ کئی نظموں میں انھوں نے نوجوانی کے رومانی جذبات کا اظہار یوں کیا ہے کہ خود پختہ کار راوی کی حیثیت سے شریک نظر آتے ہیں۔ اس طرح کی نظموں میں ”بس کا سفر“، ”ایک لڑکی“ اور ”پھریوں ہوا“ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی بعض نظموں میں نفسیات کی بڑی دل کش تصویریں نظر آتی ہیں۔ ان نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عشق و محبت کے بارے میں ان کا رویہ عام انداز سے ہٹ کر ہے۔ ان کی محبت بیمار نہیں بلکہ صحت مند جذبات کی حامل ہے۔ وہ ہر حقیقت کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی نظم ”شکایت“ ملاحظہ فرمائیں:

تمہاری شکایت بجا ہے / مگر تم سے پہلے بھی دنیا یہی تھی

یہی آج بھی ہے / یہی کل بھی ہوگی

بدلتے ہوئے موسموں کی یہ دنیا

کبھی گرم ہوگی / کبھی سرد ہوگی / فقط ایک تم ہی نہیں ہو

یہاں جو بھی اپنی طرح سوچتا ہے

زمانے کی نیرنگیوں سے خفا ہے

ہر اک زندگی اک نیا تجربہ ہے

مگر جب تک یہ شکایت ہے زندہ

یہ سمجھو / میں پر محبت ہے زندہ

اس نظم میں ندا فاضلی نے اپنا تصور عشق پیش کر کے قاری کے لیے افہام و تفہیم میں آسانی پیدا کر دی ہے۔ یہاں وہ عشق کے تصور کو نئے اور مختلف پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ پہلی نظر میں جب اس نظم کا مطالعہ کرتے ہیں تو بالکل بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ اس میں عشق کے تصور کو بیان کیا گیا ہے۔ جوں جوں ہم اس نظم پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں تو اس کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ان کی نظم ”چھوٹی سی ہنسی“ میں بھی عشق و رومان کے جذبات و احساسات کو فن کارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے:

سونی سونی تھی فضا / میں نے یوں ہی

اس کے بالوں میں گندھی خاموشیوں کو چھولیا
 وہ مڑی / تھوڑا ہنسی / میں پھر ہنسا / پھر ہمارے ساتھ
 ندیاں، وادیاں / کہسار، بادل / پھول، کنول
 شہر، جنگل / سب کے سب ہنسنے لگے / اک محلے میں
 کسی گھر کے / کسی کونے کی / چھوٹی سی ہنسی
 دور تک پھیلی ہوئی دنیا کو / روشن کر دیا ہے
 زندگی میں زندگی کا رنگ بھر دیا ہے

مذکورہ بالا نظم واحد متکلم کے صیغے میں آگے بڑھتی ہے۔ یہ نظم رومانیت سے لبریز ہے۔ اس نظم میں بتایا گیا ہے کہ وصالِ یار سے فضا خوش گوار لگ رہی ہے۔ اس خوش گوار اور پر لطف ماحول میں ندیاں، وادیاں، بادل، پھول، کہسار، شہر اور جنگل بھی خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔ محبوب کی مسکراہٹ سے بے رنگ زندگی میں خوش حالی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک اور نظم ”پھریوں ہوا“ میں بھی محبت کے جذبات و احساسات پر روشنی ڈالی گئی ہے:

ممکن ہے چند روز پریشان رہی ہو تم
 یہ بھی ہوا ہو وقت پہ سورج اگا نہ ہو
 املی میں کوئی اچھا کتارہ پکا نہ ہو
 چھت کی کھلی ہواؤں میں آنچل اڑا نہ ہو
 دو تین دن رضائی میں سردی رکی نہ ہو
 کمرے کی رات پنکھ پسارے اڑی نہ ہو
 ہنسنے کی بات پر بھی بہ مشکل ہنسی ہو تم
 کچھ دن خطوں میں آنسو بہے شور و غل ہوا
 تم زہر پی کے سونیں میں انجمن سے کٹ گیا
 پھر یوں ہوا کہ دھوپ کھلی ابر چھٹ گیا
 میں نے وطن سے کوسوں پرے گھر بسا لیا
 تم نے پڑوس میں نیا بھائی بنا لیا

یہ نفاضی کی بہت خوب صورت نظم ہے جس میں محبت میں جدائی کی تمام کیفیات کا احاطہ کیا گیا

ہے۔ اس میں زندگی کی تلخ حقیقت کو پیش کیا گیا ہے کہ محبت میں یوں لوگ مر نہیں جاتے بلکہ زندہ رہنے کی راہیں تلاش کر لیتے ہیں۔ ان کی نظم ”ایک کہانی“ کا موضوع بھی یہی ہے۔ اس نظم میں موصوف محبوبہ کو ایک ایسے لمحے کی دہلیز پر کھڑا کر دیتے ہیں جس میں ماضی کی فراموش کردہ محبت، حال کے ایک واقعے سے تازہ ہو کر مستقبل کا اندیشہ بن جاتی ہے۔ ان کی ایک اور نظم ”پگھلتا دھواں“ بھی اسی سلسلے کی ایک بہترین نظم ہے جس میں شخصی عنصر آفاقیت میں گم ہو گیا ہے:

دور شاداب پہاڑی پہ بنا اک بنگلہ
لال کھریلوں پہ پھیلی ہوئی انگور کی بیل
صحن میں بکھرے ہوئے مٹی کے راجا رانی
منہ چڑاتی ہوئی بچوں کو کوئی دیوانی
سیب کے اجلے درختوں کی گھنی چھاؤں میں
پاؤں ڈالے ہوئے تالاب میں کوئی لڑکی
گورے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے تکیہ کا غلاف
ان کہی باتوں کو دھاگوں میں سے جاتی ہے
دل کے جذبات کا اظہار کیے جاتی ہے
گرم چولہے کے قریب بیٹھی اک عورت
اک پیوند لگی ساڑھی سے تن کو ڈھانپنے
دھندلی آنکھوں سے مرے سمت نکلے جاتی ہے
مجھ کو آواز پہ آواز دیے جاتی ہے
اک سلگتی ہوئی سگریٹ کا بل کھاتا دھواں
پھیلتا جاتا ہے ہر سمت مرے کمرے میں

یہ ہر اس شخص کی داستان ہے جو شہر میں تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا سگریٹ کا دھواں اڑائے اسے یاد کرتا ہے جسے وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ یہاں یاد ایک بولتی ہوئی تصویر بن گئی ہے۔ اس نظم میں انھیں جتنے جاندار حاضراتی پیکر عطا ہوئے ہیں، وہ کسی اور نظم میں حاصل نہیں ہوئے ہیں۔ نڈافاضلی کی رومانی شاعری میں شخصی وارداتوں کا عکس گہرا ہے۔ وہ اپنی نظم ”وہ لڑکی“ میں اپنی محبت کی داستان بیان کرتے ہیں:

وہ لڑکی یاد آتی ہے

جو ہونٹوں سے نہیں پورے بدن سے بات کرتی تھی
 سسٹے وقت بھی چاروں دشاؤں میں بکھرتی تھی
 وہ لڑکی یاد آتی ہے
 وہ لڑکی اب نہ جانے کس کے بستر کی کرن ہوگی
 ابھی تک پھول کی مانند ہوگی یا چمن ہوگی
 سبیلی رات / اب بھی / جب کبھی گھونگٹ اٹھاتی ہے
 لچکتی کہکشاں جب بنتے بنتے ٹوٹ جاتی ہے
 کوئی الیسی خوشبو بال کھولے مسکراتی ہے
 وہ لڑکی یاد آتی ہے

اس نظم میں نذافاضلی نے اپنی محبوبہ کا ذکر کیا ہے جو نہ صرف لبوں سے بات کرتی تھی بلکہ اس کا پورا بدن بات کرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس کو یہ خیال ستاتا ہے کہ اسے اس لڑکی سے جدا ہوئے بہت وقت گزرا ہے۔ اس کی کوئی خبر نہیں کہ وہ اب کیسی ہوگی۔ وہ اپنے ماضی کی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے ان راتوں کو یاد کرتے ہیں جب دونوں ایک دوسرے میں کھو جاتے تھے۔ اس نظم میں رومانیت کی آمیزش میں ایک طرح کی شدت نظر آتی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے اپنی محبوبہ ”عشرت“ کا تذکرہ کیا ہے۔ یوں تو ان سے عشق و محبت کی کئی داستانیں منسوب ہیں لیکن جس لڑکی سے ان کے عشق میں تبدیلی آئی وہ عشرت تھی جو آخری وقت تک ان کے ذہن میں رہی۔ انھوں نے اپنے دونوں سوانحی ناولوں میں عشرت کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ کسی نہ کسی صورت میں ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے نذافاضلی کے سوانحی ناول ”دیواروں کے بیچ“ کا اقتباس ملاحظہ کریں:

”کالج جاتے اور وہاں سے لوٹتے وقت عشرت روز نذا کے کمرے کے سامنے سے گزرتی ہے۔ اس کے گزرنے کا وقت اس کے آنے سے ڈیڑھ گھنٹے پہلے سے شروع ہو جاتا ہے، ہاتھ کی گھڑی کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ راستے کے سارے منظر دھندلے ہو جاتے ہیں۔ نذا اس وقت سارے کام چھوڑ کر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ آتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے گزر جاتی ہے۔ لیکن نذا اس کے آنے اور گزرنے کے یہ مختصر سے لمحے سارے دن اس کے جسم میں مہکتے رہتے ہیں۔ ان

دوریوں کو پاٹنے کے لیے عشرت نے اپنی ایک سہیلی کو ہم راز کیا ہے۔
اس کا نام وجیہ ہے۔ وہ پیغام رسانی کے ساتھ دونوں کو ملانے کا نیک
فرض بھی نبھاتی ہے۔“ 3

نَدافاضلی کی زندگی کے ان واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد اگر ان کی مذکورہ نظم کو پڑھا جائے تو کچھ
زیادہ لطف آئے گا۔ ان کی نظمیں شاعری میں زندگی کی سچائیوں کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کی رومانوی نظموں میں
بھی ایک انفرادیت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات، جذبات اور احساسات کو اپنی نظموں میں کچھ
اس طرح سمو دیا ہے کہ وہ آج ہر دل کی آواز بن گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زندگی میں کافی
اتار چڑھاؤ آئے۔ جہاں ایک طرف انھوں نے اپنی زندگی کے بیشتر ایام پریشانی، مصیبت اور تکلیف میں
گزارے وہیں دوسری جانب ان کی زندگی عشق و رومان کے نغموں سے لبریز نظر آتی ہے۔ زندگی کے مسلسل
سفر میں انھیں جن تجربات و مشاہدات سے دوچار ہونا پڑا وہ پوری طرح سے ان کی شاعری میں روشن ہیں۔
عشرت کے عشق میں وہ عمر بھر مبتلا رہے۔ کافی عرصے کے بعد ان کی بہن کی مدد سے دونوں کا رشتہ ہو جاتا
ہے۔ لیکن لا ابالی پن اور مالی جوشی سے نزدیکی کے سبب وہ اس عشق سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ حالاں کہ
عشرت کو پانے کے لیے وہ زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے۔ جب عشرت اور نَدافاضلی کا رشتہ ختم ہو گیا تو وہ درد
و کرب میں مبتلا ہو گئے۔ اس درد و کرب کا اظہار انھوں نے اپنی نظم ”وقت سے پہلے“ میں کچھ اس طرح کیا
ہے:

یوں تو ہر رشتہ کا انجام یہی ہوتا ہے
پھول کھلتا ہے / مہکتا ہے / بکھر جاتا ہے
تم سے ویسے تو نہیں کوئی شکایت / لیکن
شاخ ہوسبز / تو حساس فضا ہوتی ہے
ہر کلی زخم کی صورت ہی جدا ہوتی ہے
تم نے / بیکار ہی موسم کو ستایا ورنہ
پھول جب کھل کے مہک جاتا ہے
خود بہ خود / شاخ سے گر جاتا ہے

نَدافاضلی کی شاعری میں محبت کی چمک دمک پوری مقصدیت کے ساتھ موجود ہے۔ بہت سے شعرا

نے جنس زدگی کے احساس کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے لیکن ان کی شاعری میں یہ احساس اپنی حدود کو متجاوز نہیں کرتا۔ ان کی رومانی نظموں میں پاکیزہ جذبات کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی نظمیں فحاشی و عریانی سے کوسوں دور دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی نظم ”مشورہ“ میں بھی رومانیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کی دیگر رومانی نظموں میں ”دوکھڑکیاں“، ”ایک ملاقات“، ”محبت“، ”ایک دن کی سیر“، ”دوسہیلیاں“ اور ”ایک لڑکی“ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہاں ان کی نظم ”ایک لڑکی“ پیش کی جاتی ہے:

وہ پھول پھول بدن / سانولی سی لڑکی
جوروز / میری گلی سے گزر کے جاتی ہے
سنہ / وہ کسی لڑکے سے پیار کرتی ہے
بہار ہو کر تلاش بہار کرتی ہے
نہ کوئی میل / نہ لگاؤ ہے لیکن
نہ جانے کیوں / بس اسی وقت جب وہ آتی ہے
کچھ انتظار کی عادت سی ہو گئی ہے مجھے
اک اجنبی کی ضرورت سی ہو گئی ہے مجھے
میرے درندے کے آگے / وہ پھول کا چھتر
گلی کے موڑ پہ / اکھڑا ہوا سا ایک پتھر
وہ ایک جھکتی ہوئی بدنمائی نیم کی شاخ
اور اس پہ جنگلی کبوتر کے گھونسلے کا نشان
یہ ساری چیزیں کہ جیسے مجھی میں شامل ہیں
مرے دکھوں میں، مری ہر خوشی میں شامل ہیں
میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی، یونہی گزرتی رہے
اسی طرح کسی لڑکے کو پیار کرتی رہے

مذکورہ بالا نظم میں نذافا ضلی نے سیدھے سادے الفاظ میں رومانی کیفیت کو پیش کیا ہے۔ عشق و محبت کے بارے میں ان کا یہ رویہ عام انداز سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ اس نظم پر وارث علوی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ندانہ جنس کا اسیر ہے نہ ذات کا زندانی، وہ دونوں کو ساتھ لے کر بھی

چلتا ہے اور دونوں سے بلند بھی ہو جاتا ہے، وہ حسن و محبت کی رومان پرور اور تابناک فضاؤں میں اپنے لیے کوئی دانہ دُکا مانگے بغیر پرواز کر سکتا ہے۔ حسین صورتوں سے اور محبت بھرے دلوں سے چھلکتی اتنی وسیع دنیا میں اپنی ذات میں جی کر بھی آدمی کتنا جی سکتا ہے۔ اپنے لیے کچھ بھی مانگے بغیر دوسروں کی خوشیوں، محبتوں اور لب و رخسار کے مہکتے ہوئے گلستانوں میں جینا پھر کائنات کو اپنی ذات میں سمونا ہے۔ بلکہ ذات کو کائنات کی پنہائی عطا کرنا ہے۔ اس تجربہ کا بیان اس کی ایک نظم ”ایک لڑکی“ میں ہوا ہے اور اتنی سجتا سے ہوا ہے کہ ہم ہاتھ میں ایک بیج لے کر اسے کریدتے ہیں، اچھالتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس میں تو ایک پورا درخت پنہاں ہے۔“ 4

نہ افاضلی کی نظموں میں دنیا ملتی ہے، انتشار ملتا ہے۔ ان کی رومانی نظموں میں اختر شیرانی یا دوسرے شعرا جیسی رومانیت نہیں ہے بلکہ ان کی رومانیت والی نظموں میں ایک طرح کا انتشار پایا جاتا ہے۔ ان کی رومانی نظموں میں ان کا تصورِ عشق اپنے ہم عصروں سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے تصورِ عشق میں صحت مند عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں صرف رومانیت ہی نہیں ہے بلکہ ان کی نظمیں انسان دوستی اور ہمدردی کے جذبات سے پُر دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی رومانی نظموں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ زندگی سے جڑی پریشانیوں، الجھنوں، روزمرہ کی ضرورتوں، اس سے جڑے مسائل کا سامنا اور ان کے حل کی تلاش بھی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی نظمیں شاعری کے ذریعے انسانی زندگی اور معاشرے کی تلخ اور مسخوڑکن کیفیات کو سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

(2) سماجی اور آفاقی موضوعات:

نہ افاضلی کی نظمیں شاعری کی اساس حقیقت پر ہے۔ انھوں نے سماجی مسائل کو اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔ نیز قومی و بین الاقوامی موضوعات و مسائل پر بھی اپنے قلم کی سیاہی صرف کی ہے۔ ان کی نظمیں کسی جذباتی انتہا پسندی یا لسانی انتہا پسندی کے سبب معرضِ وجود میں نہیں آئیں بلکہ ان میں ایک طرح کی تازگی اور انوکھا پن نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں تیکھا اور نوکیلا طنز بھی ملتا ہے۔ وہ عصری سماج کی ناہمواریوں کو بھی

اپنی شاعری کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں شاہ نواز قریشی لکھتے ہیں:

ندا کی شاعری میں جو تیکھا اور نوکیلا طنز ملتا ہے۔ وہ کسی اور شاعر کے
یہاں نہیں ہے۔ عصری سماج کی ناہمواریوں اور تضادات، اس سماج
میں رہنے والوں کے انفرادی و اجتماعی مسائل، ان کی نفسیات، تصنع اور
بناوٹی طرز حیات، خوابوں کی شکست و ریخت، آدرشوں کے بکھراؤ اور
اخلاقی اقدار کی بے وقعتی کی عکاسی جس تیکھے انداز میں ندا نے اپنی
شاعری میں کی ہے، وہ عدیم المثال ہے۔“ 5

ندا فاضلی نے سماج میں ہونے والی نا انصافیوں کے خلاف کھل کر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی شاعری فکر و
نظر کی پختگی کے سبب فیشن پرستی سے کوسوں دور ہے۔ ان کی نظموں میں سماجی شعور کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کی
نظمیں ”نئے گھر کی پہلی نظم“، ”گلاب کا پھول“، ”پیسے کا سفر“، ”سماجی شعور“، ”کامیاب آدمی“، ”انتشار“،
”تماشا“، ”سونے سے پہلے“ وغیرہ سماجی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان کی نظم ”گلاب کا پھول“ میں سماجی
شعور ملتا ہے۔ نظم ملاحظہ فرمائیں:

لچکتی ڈال پہ کھلتا ہوا گلاب کا پھول
لبوں کے زخم، جھکی آنکھوں کی بولتی تصویر
نئی نئی کسی بچے کے ہاتھ کی تحریر
لچکتی ڈال پہ کھلتا ہوا گلاب کا پھول
حسین لباس میں ماتم حیاتِ فانی کا
نظر کے سامنے انجامِ ہر کہانی کا
لچکتی ڈال پہ کھلتا ہوا گلاب کا پھول
بہن کی شوخ ہنسی ماں کے پیار کا درپن
چھلکتی یادوں میں بھیگا ہوا اکیلا پن
لچکتی ڈال پہ کھلتا ہوا گلاب کا پھول
ہر ایک ذہن میں نقشا بدلتا رہتا ہے
شبیبہ ایک ہے پردہ بدلتا رہتا ہے

مذکورہ بالا نظم فکر و احساس کی غماز ہے۔ اس میں ہلکا ہلکا طنز بھی ملتا ہے۔ اس میں سماجی شعور کے ساتھ

ساتھ تحلیلِ نفسی کی خاموش صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ تقسیم، تنہائی اور ہجرت کی وجہ سے ان کی زندگی میں بکھراؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس سے انھوں نے وسیع تجربہ حاصل کیا اور خود کو بکھرنے سے بچانے کی کوشش کی۔ وہ سماجی اقدار کا ڈھول پیٹنے کے بجائے اپنے اس کرب کو رہنما بناتے ہیں جو ان کی پہچان بن گیا تھا اور جو ان کی شاعری کے نئے امکانات کی خبر دے رہا تھا۔ اس سے ان کی نظمیں شاعری میں گہرائی و گیرائی پیدا ہو گئی۔ وہ اپنی نظم ”کامیاب آدمی“ میں انسان کی چھوٹی چھوٹی حرکات و سکنات کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ نظم پیش خدمت ہے:

وہ گالی کھا کے مسکراتا ہے

ہر ذلت کو بھول جاتا ہے

ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے

اسے کامیابی کا راستہ مل گیا ہے

وہ بہت جلد

دوسروں کو ستانے کے قابل ہو جائے گا

اس مختصر سی نظم میں نداءِ فاضلی نے سماج کی اس خصلت کو موضوع بنا کر سامنے لایا ہے، جہاں جھوٹے اور فریبی انسان کو بلند رتبہ دیا جاتا ہے۔ انسان اپنے مفاد کے لیے کسی بھی حد تک گر سکتا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے اس شخص کا ذکر کیا ہے جو گالی کھا کے مسکراتا ہے اور ہر طرح کی ذلت برداشت کرتا ہے۔ اپنا مطلب پورا کرنے کے لیے وہ کسی کی بھی ہاں میں ہاں ملانے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہی انسان جب اپنے مقاصد کی تکمیل پاتا ہے تو وہ دوسروں کو ستانا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح سماج اور انسان کے رشتوں میں دراریں پڑتی ہیں۔ نداءِ فاضلی سماج کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ وہ سماج سے اپنا رشتہ استوار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ ان کی ایک اور نظم ”سماجی شعور“ کو بڑی اہمیت حاصل ہے:-

میرے یار چور

ہر کام میں سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے

تم چھوٹی موٹی چیزیں چراتے ہو

اور جیل چلے جاتے ہو

لیڈر / منسٹر / سرکاری افسر

یہ سب تمہارے ہی جیسے انسان ہیں
لیکن تم / سماجی شعور سے کوسوں دور ہو
اسی لیے چور مشہور ہو

یہ نظم سیدھے سادے اور آسان پیرائے میں کہی گئی ہے۔ نڈافاضلی اس نظم کے ذریعے پیغام دیتے ہیں کہ سماج میں جس طرح کی بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ ان میں چوری بھی ایک بیماری ہے۔ چھوٹے موٹے چور پر سب کی نظر جاتی ہے لیکن جو بڑے بڑے چور سماج میں گھوٹالے کر رہے ہیں ان کی طرف کسی کی نظر نہیں جاتی ہے۔ ان کو سماج میں عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس نظم میں لیڈر، منسٹر اور سرکاری افسروں پر طنز کیا گیا ہے۔ معمولی چور کی چوری پکڑتے ہی اس کو قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے جب کہ بڑے بڑے رشوت خور آزاد گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ہمارے سماج میں پھیلی ہوئی ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔ نڈافاضلی کی نظر صرف ہندوستانی سماج یا معاشرے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کی نظر عصری سماج و معاشرے پر بھی رہتی ہے۔ وہ سماج میں رہنے والوں سے ہمدردی اور انسیت رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری عصر حاضر کی آواز ہے۔ انھوں نے اپنی ایک نظم ”انتشار“ میں عصری موضوعات کو پیش کیا ہے۔ نظم دیکھیے:

ہر ایک جرم نام ہے / جو نام سنگسار ہے
وہ نام بے قصور ہے / قصور وار بھوک ہے
جو مدتوں سے رائفل ہے / چیخ ہے / پکار ہے
یہی گناہ گار ہے

نہیں یہ بھوک تو کسی کل کی پہرے دار ہے
غریب تا بعد ار ہے / گناہ گار ہے محل
مگر محل تو خود / سیاستوں کا اشتہار ہے
سیاستوں کے ارد گرد بھی کوئی حصار ہے
عجیب انتشار ہے / نہ کوئی چور چور ہے
نہ کوئی سا ہو کار ہے / یہ کیسا کاروبار ہے
خدا کی کائنات کا / خدا ہی ذمہ دار ہے

مذکورہ بالا نظم کے آخری دو مصرعے ”خدا کی کائنات کا / خدا ہی ذمہ دار ہے“ کا لہجہ اگر بدلا جائے تو

اس کے مفہوم میں بھی تبدیلی واقع ہوگی۔ یہ نظم دراصل ظاہر و باطن کی منصوبہ بند تفہیم کی کوشش کے نتیجے میں معرض وجود میں آئی ہے، جہاں صرف خارجی بحران ہی نہیں داخلی اضطراب بھی دکھائی دیتا ہے۔ نڈافاضلی کے یہاں علمی ترجیحات اور ادب کے تفہیمی رویوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں معاشرے کی ریاکاری اور طمع پسندی پر گہرا طنز کیا ہے۔ اسی طرح وہ سماج کی برہنہ سچائیوں پر سفاکی سے طنز کے وار کرتے ہیں۔

(3) قومی یکجہتی:

نڈافاضلی نے اپنی شاعری میں قومی یکجہتی اور قومی ایکیتا کے پیغام کو واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح مشترکہ تہذیب کو بھی انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی نظموں میں بھائی چارگی اور مذہبی رواداری کا علم کافی اونچا نظر آتا ہے۔ ان کی نظم ”مردہ گھر میں بٹوارہ“ بھائی چارہ اور قومی یکجہتی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ نظم ملاحظہ فرمائیں:

ساری لاشیں / ایک سی تھیں / وہ ہی آنکھیں۔۔۔ میری جیسی
وہ ہی ٹانگیں۔۔۔ تیری جیسی / سارے بچے۔۔۔ بچوں جیسے
سارے بوڑھے۔۔۔ بوڑھوں جیسے / ساری لاشیں
چپ تھیں لیکن / مردہ گھر کے چاروں جانب
شور و غل تھا / زندگی کے تاجروں کا / موت کے سوداگروں کا
زندگی کو جس طرح / ٹکڑوں میں بانٹا جا رہا تھا
موت کو بھی / ذات اور دھرموں سے
چھانٹا جا رہا تھا / کون کس کا؟ / کس کے کتنے؟
غم تو غم ہے / از غفرانی کیا، ہر اکیا / میرے ماتم میں
وہاں جتنے بھی تھے / انسان تھے وہ
ٹوٹا پھوٹا / میرا ہندستان تھے وہ

درج بالا نظم بھائی چارہ اور قومی ایکیتا کی عمدہ مثال پیش کرتی ہے۔ اس میں ایک حساس دل کا درد ابھر کر ظاہر ہوا ہے۔ نڈافاضلی نے اس غم کو ہندو مسلم کا مشترکہ غم قرار دیا ہے کیوں کہ درد سب کا ایک جیسا ہوتا

ہے۔ ایک حساس ذہن کا مالک ہی اس درد کو محسوس کر سکتا ہے۔ وہ کسی ذاتِ پات میں خود کو قید نہیں کرتے۔
ان کی ایک اور نظم ”کھیل“ قومی یکجہتی اور مشترکہ تہذیب کی غماز ہے۔ نظم پیش خدمت ہے:

آؤ! کہیں سے تھوڑی سی مٹی بھر لائیں
مٹی کو بادل میں گوندھیں / نئے نئے آکار بنائیں
کسی کے سر پہ چُلیا رکھ دیں / ماتھے پر تلک سجائیں
کسی کے چھوٹے سے چہرے پر / موٹی سی داڑھی پھیلائیں
کچھ دن ان سے جی بہلائیں / اور یہ جب میلے ہو جائیں
داڑھی چوٹی تک سبھی کو / توڑ پھوڑ کے گڈمڈ کر دیں
مٹی جلی یہ مٹی پھر سے / الگ الگ سانچوں میں بھر دیں
نئے نئے آکار بنائیں / داڑھی میں چوٹی لہرائیں
چوٹی میں داڑھی چھپ جائے
کس میں کتنا کون چھپا ہے / کون بتائے

اس نظم میں نداءِ فاضلی نے ہندو مسلم کی شناخت کو موضوع بنایا ہے۔ چھوٹے بچے جس طرح مٹی کے کھلونے بناتے ہیں، وہ انھیں کسی بھی شکل میں ڈھال دیتے ہیں۔ نظم کے پہلے حصے میں مورتیوں کو بنانے کا ذکر ملتا ہے جب کہ دوسرے حصے میں ان کو توڑ کر نئے سانچوں میں ڈھالنے کی بات کہی گئی ہے۔ ہمارا حال بھی یہی ہے پیدا ہونے سے مرنے تک ہماری ایک ہی پہچان ہوتی ہے وہ ہے انسان ہونے کی پہچان۔ اس نظم میں نداءِ فاضلی ہندو مسلم کے فرق کو ختم کر کے انسانیت کے پیغام کو عام کرنے پر زور دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظم ”قومی یکجہتی“ میں ایک تلخ حقیقت کو بیان کیا ہے۔ وہ قومی یکجہتی وہاں پاتے ہیں جہاں گناہ گار تو پہنچتے ہیں مگر ان مقدس ہستیوں کا گزر نہیں جن کے نیک آسمانی منصوبوں نے زمین کو فتنہ و فساد سے بھر دیا ہے۔
نظم ملاحظہ کریں:

وہ طوائف / کئی مردوں کو پہچانتی ہے
شاید اسی / لیے دنیا کو زیادہ جانتی ہے
اس کے کمرے میں
ہر بھگوان کی ایک ایک تصویر لٹکی ہے
یہ تصویریں

لیڈروں کی تقریروں کی طرح نمائشی نہیں

اس کا دروازہ رات گئے تک

ہندو / مسلم / سکھ / عیسائی

ہر مذہب کے آدمی کے لیے کھلا رہتا ہے

خدا جانے اس کے کمرے کی سی کشادگی

مسجد اور مندر کے آنگنوں میں کب پیدا ہوگی

نڈا فاضلی نے اس نظم میں طوائف اور اس کے کوٹھے کی منظر کشی کی ہے جس کے کوٹھے پر ہر دھرم کے لوگ جاتے ہیں۔ اسی لیے اس نے اپنے کمرے میں ہر مذہب کے بھگوان کی تصویر لٹکائی ہے جو اس کی کشادہ دلی اور وسیع القلبی کا بین ثبوت ہے۔ سیاسی لیڈر اپنے مفاد کے لیے عام لوگوں سے بڑے بڑے وعدے کرتے ہیں لیکن اپنا مطلب پورا ہونے کے بعد وہ عوام کو ٹھینکا دکھاتے ہیں۔ مندر و مسجد میں کشادگی پیدا ہونے سے سماج میں اتحاد و اتفاق پیدا ہوگا۔ اس نظم پر سعادت حسن منٹو کے اثرات دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں میں طوائف کے کردار کو جگہ دی ہے۔ نڈا فاضلی چوں کہ منٹو کی کہانیوں کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے کرتے تھے، اس لیے ان کی شاعری میں اس طرح کے موضوعات کا آنا حیرانی کی بات نہیں ہے۔

نڈا فاضلی اپنی شاعری میں چھوٹے چھوٹے واقعات کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے ایک مکمل تصویر ابھرتی ہے۔ فن کار جس فن میں ماہر ہوتا ہے اسی کی نمائش اپنے فن پارے میں کرتا ہے۔ انہوں نے بھی اپنی زندگی کے جذبات، احساسات، مشاہدات اور واقعات کو بڑی فن کارانہ مہارت کے ساتھ عمل میں لایا ہے۔ آج کا دور بڑا پُر آشوب ہے۔ ایک دوسرے کو تعصب کا نشانہ بنانا عام سی بات ہو گئی ہے۔ معمولی باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کر کے ایک دوسرے کو ستایا جا رہا ہے۔ اس نفرت اور تعصب کو مٹانے اور ختم کرنے کے لیے انہوں نے اپنی شاعری میں ایکتا اور بھائی چارے کا پیغام دیا۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو انہوں نے جس طرح اپنی نظموں میں پیش کیا ہے وہ انھیں اپنے معاصرین میں انفرادیت عطا کرتی ہے۔ انہوں نے کبیر اور نظیر اکبر آبادی کی طرح اپنی شاعری میں قومی یکجہتی کا تصور پیش کیا۔

(4) فرقہ وارانہ فسادات اور سیاسی موضوعات:

نڈا فاضلی کی شاعری میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ چوں کہ انہوں نے غریب الوطنی کا کرب

برسوں تک برداشت کیا۔ اس لیے ان کی شاعری میں یہ کرب شدت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہنگامی موضوعات کو بھی قلم بند کیا ہے۔ گجرات کے فسادات اور ہندو مسلم فسادات کو بھی انھوں نے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے چند تلخ تجربات اور حادثات کو موضوع بنا کر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے سیاسی موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات اور سیاسی مسائل پر مشتمل نظموں میں ”ایک قومی رہنما کے نام“، ”جنگ“، ”پہچان“، ”رنگ محل“، ”ستمبر 1965“، ”ایک لٹی ہوئی بستی کی کہانی“، ”پاسپورٹ آفیسر کے نام“، ”شرط“ اور ”انسان“ وغیرہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے لال قلعے کے مشاعرے میں رتھ یا ترا کے ذمے داروں کے خلاف بے باکی سے ایک نظم پڑھی تھی جس کا عنوان ”ایک قومی رہنما کے نام“ ہے۔ نظم پیش خدمت ہے:

مجھے معلوم ہے / تمہارے نام سے منسوب ہیں

ٹوٹے ہوئے سورج / شکستہ چاند / کالا آسمان

کریوزدہ راہیں / سلگتے کھیل کے میدان

روتی چینی مائیں / مجھے معلوم ہے / چاروں طرف

جو یہ تباہی / حکومت میں / سیاست کے تماشے کی گواہی ہے

تمہیں! / ہندو کی چاہت ہے / نہ مسلم کی عداوت

تمہارا دھرم! / صدیوں سے تجارت تھا / تجارت ہے

مجھے معلوم ہے / لیکن / تمہیں / مجرم کہوں کیسے

عدالت میں / تمہارے جرم کو ثابت کروں کیسے

تمہاری جیب میں خنجر / نہ ہاتھوں میں / کوئی بم تھا

تمہارے رتھ پہ / تو / مریدا پُر شتم کا پرچم تھا

اس نظم میں نڈا فاضلی نے سیاسی رہنماؤں پر طنز کے تیر برسائے ہیں۔ یہ نظم فرقہ واریت کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ وارث علوی نے اس نظم کا تقابل فیض کی نظم ”سیاسی لیڈر کے نام“ سے کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

”فیض کی نظم ”سیاسی لیڈر کے نام“ رات، نور، سحر کے اشاروں سے کام

لیتی ہے اور علامتی اسلوب کو اپناتی ہے۔ لیکن وہ بھی ایک مخصوص تاریخی

صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ نڈا کی نظم راست اسلوب میں

ہے۔ گویا اسالیب بھی ان نظموں کی ہنگامی صفات کو آفاقیت کا جو ہر عطا
نہیں کر پاتے۔ چنانچہ ہمارا یہ سمجھنا کہ آرٹ ہنگامی موضوعات کو ابدیت
اور آفاقیت عطا کرتا ہے، جزوی صداقت کا حامل ہے۔ گویا وہ نظریہ شعر
جو موضوع کو غیر اہم اور فن کاری کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ ہر نوع کی شاعری
کا پیمانہ نہیں بن سکتا۔“ 6

نذا فاضلی نے اپنی نظموں میں اپنے عہد کے مسائل کی ترجمانی بڑی خوش اسلوبی سے کی ہے۔ ان کی
نظمیں عہد حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔ فسادات کے موضوع پر ان کی ایک اور
نظم ”جنگ“ ہے جس میں انھوں نے جنگ سے پیدا شدہ صورتِ حال کو بیان کیا ہے۔ نظم ملاحظہ کریں:

سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد

جنگ! بے گھر بے سہارا

سرخاموشی کی آندھی میں بکھر کے

ذرہ ذرہ پھیلتی ہے / تیل / گھی / آٹا

کھنکھتی چوڑیوں کا روپ بھر کے

بستی بستی ڈولتی ہے / دن دھاڑے

ہر گلی کوچے میں گھس کر

بند دروازوں کی سائیکل کھلتی ہے

مدتوں تک / جنگ / گھر گھر بولتی ہے

سرحدوں پر فتح کا اعلان ہو جانے کے بعد

اس نظم میں نذا فاضلی نے جنگ کے بعد پیدا ہونے والے مسائل اور درد و کرب کو پیش کیا ہے۔
جنگ کے نتیجے میں انسانوں کے گھر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ جانی و مالی نقصان سے انسانوں کے اذہان
مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد روزی روٹی کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے، گھر کی دوبارہ تعمیر کا مسئلہ پیدا
ہو جاتا ہے۔ جنگ میں جب کسی کی شہادت ہوتی ہے تو اس سے اس کے گھر والوں پر غموں کا پہاڑ ٹوٹتا ہے۔
اس طرح کے مسائل آئے دن کشمیر میں دیکھنے کو ملتے ہیں جن سے وہاں کی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ روز
کسی نہ کسی عورت کا شوہر مرتا ہے، کسی بہن کا بھائی مرتا ہے، کسی باپ کا اکلوتا بیٹا جامِ شہادت نوش فرماتا ہے
اور بچے یتیم ہو جاتے ہیں۔ بوڑھے ماں باپ کے لیے ان کا بیٹا زندگی کی سب سے بڑی دولت ہوتا

ہے۔ جب وہ کسی جنگ میں مارا جاتا ہے تو کیا ان کے لیے جنگ ختم ہو جاتی ہے یا پھر جنگ شروع ہوتی ہے؟
اس لیے اگر جنگ سے پہلے جنگ کے بعد ہونے والی تباہ کاریوں پر غور کیا جائے تو کبھی بھی جنگ نہیں ہوگی۔
خورشید سمیع نے اپنے مضمون میں اس نظم پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:
”پوری نظم ایک دائرے کی صورت ہے یعنی جس مصرعے سے شروع ہوتی ہے اسی مصرعے پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں میرے خیال میں وہی ترقی پسندانہ فکر ہے جو سآخر کی مشہور نظم ”پرچھائیاں“ میں ہے۔ اصل یہ ہے کہ جیت کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ، بہر حال! یہ سچ ہے کہ دونوں ہی طرف زندگی مٹیوں پر روتی ہے اور زیست فاقوں سے تلملاتی ہے۔“ 7

آج حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ سامراجی قوتیں انسان کو جنگ کے لیے اکسار ہی ہیں۔ جنگی فضا اور ماحول کو سازگار بنایا جا رہا ہے۔ یہاں نڈافاضلی کی ایک نظم پیش کی جاتی ہے جو انہوں نے اس ماں کے لیے لکھی تھی جس کے چار بچوں کو جلگاؤں کے فساد میں زندہ جلادیا گیا تھا۔ اس نظم کا عنوان ”پہچان“ ہے۔ نظم ملاحظہ فرمائیں:

نہیں یہ بھی نہیں / یہ بھی نہیں
یہ بھی نہیں۔۔۔ وہ تو / نہ جانے کون تھے
یہ سب کے سب تو میرے جیسے ہیں
سبھی کی دھڑکنوں میں ننھے چاند سورج ہیں
سبھی میری طرح سے وقت کی بھٹی کے ایندھن ہیں
جنہوں نے میری کٹیا میں اندھیری رات میں گھس کر
میری آنکھوں کے آگے / میرے بچوں کو جلایا تھا
وہ کوئی اور تھے
وہ چہرے تو کہاں اب ذہن میں محفوظ جج صاحب
مگر ہاں / پاس ہو تو سو گھٹ کر پہچان سکتی ہوں
وہ اس جنگل سے آئے تھے / جہاں کی عورتوں کی گود میں
بچے نہیں ہنستے

یہ نظم نڈافاضلی نے ہاجرہ بیگم کی نذر کی ہے جس کے چار معصوم بچوں کو کچھ درندوں نے اپنی حیوانیت

کاشکار بنایا اور ایک ماں کے سامنے ہی اس کے بچوں کو نذرِ آتش کر دیا تھا۔ یہ المیہ کا مقام ہے کہ اس ماں نے اپنے جگر گوشوں کو کس طرح زندہ جلتے اور تڑپتے دیکھا ہوگا۔ آج ہر دن ایک ہاجرہ جلائی جاتی ہے اور اس کے بچوں کو زندہ جلایا جاتا ہے۔ ایک ماں عدالت میں کھڑی بیچ صاحب کے سامنے انصاف مانگتی ہے۔ اس ماں سے سوال کیا جاتا ہے کہ کیا وہ اپنے بچوں کے قاتل کو پہچان سکتی ہے۔ وہ جواب میں کہتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کے قاتل کو سونگھ کر بھی پہچان سکتی ہے۔ وہ انسان کہلانے کے لائق نہیں بلکہ وہ تو درندے تھے۔ اسی لیے وہ دوسروں کے دکھ درد کو محسوس نہیں کر سکتے۔ نذافتِ ضلیٰ نے اس نظم میں ہاجرہ بیگم کے صبر کو بھی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس صورتِ حال کو زیرِ رضوی نے اپنی نظم ”بے نواؤں کے نام“، محمود سعیدی نے اپنی نظم ”گولی چلا دو“ اور مظہر امام نے اپنی نظم ”اکھڑتے خیموں کا درد“ میں اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان نظموں میں انسانی بے چہرگی کے احساس کو صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان نظموں میں موجودہ دور کے نشیب و فراز، قدروں کی پامالی اور تہذیب کے بکھراؤ سے سماج میں پھیلی ہوئی نا آسودگی اور رشتوں کی ناپائیداری کو بیان کیا گیا ہے۔ نذافتِ ضلیٰ کی مذکورہ نظم انسان کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کرتی ہے۔ جب بھی ملک میں کسی ماں کے بچوں کے ساتھ اس طرح کی درندہ حرکت کی جائے گی، ان کی یہ نظم ذہن میں نمودار ہوگی۔ اس نظم کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

”مورناچ میں میری ایک نظم ”پہچان کے عنوان سے ہے۔ یہ نظم میں نے ہاجرہ بیگم کے نام منسوب کی ہے، جس کے چار بچے جلگاؤں کے فساد میں زندہ جلا دیے گئے تھے۔ اس حادثے کی خبر میرے ذہن میں کئی دنوں سے پڑی ہوئی تھی۔ ایک دن دوپہر کے وقت کسی کام سے مکتبہ جامعہ جو بھنڈی بازار میں ہے، گیا تو جیسے ہی میں نے کار روکی، تو سارے لوگوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا، پتہ لگا وہاں کہیں یہ گولی چل رہی ہے۔ میں گاڑی موڑ کر ایک گلی میں ایک پہچان کی دوکان میں چلا گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی حیران ہوا کہ مجھے فوراً گھر واپس لوٹنے کو کہا لیکن لوٹنے پر مجھے تعجب ہوا کہ راستے میں شعوری طور پر جو نظم میرے ذہن میں مشکل ہو چکی تھی۔ اس کا تعلق میرے اپنے خوف کے بجائے ہاجرہ بیگم کے اس المیہ سے تھا، جسے میں نے اخبار کی خبر کی صورت میں پڑھا تھا اور بجائے

ظاہر میں بھول چکا تھا، درد سے درد کا رشتہ تخلیقی صورت میں ”پہچان“ نظم

کا عنوان بن گیا۔“ 8

ندا فاضلی کی شاعری میں زندگی کی تمام سچائیاں اپنی پوری معنویت کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور گہرے مشاہدات و تجربات کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے۔ یہاں ان کی وہ نظم پیش کی جاتی ہے جو فسادات سے متعلق ہے۔ اس نظم میں انھوں نے وہ سب کہہ دیا ہے جو آج ہماری سیاسی زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ یہ نظم ”ایک ٹٹی ہوئی بستی کی کہانی“ کے عنوان سے ہے۔ نظم ملاحظہ کریں:

بچی گھنٹیاں / اونچے مینار گونجنے

سنہری صداؤں نے / اُجلی ہواؤں کی پیشانی پر

رحمت کے / برکت کے / پیغام لکھے

وضو کرتی صبحیں / کھلی کہنیوں تک منور ہوئیں

جھلملائے اندھیرے / بھجن گاتے آنچل نے

پوچا کی تھالی سے بانٹے سویرے / کھلے دوار

بچوں نے بستہ اٹھایا / بزرگوں نے پیڑوں کو پانی پلایا

نئے حادثوں کی خبر لے کے / بستی کی گلیوں میں اخبار آیا

خدا کی حفاظت کی خاطر / پولس نے / پجاری کے مندر میں

ملا کی مسجد میں / پہرہ لگایا / خدا! ان مکانوں میں لیکن کہاں تھا

سلگتے محلوں کے دیوار و در میں / وہی چل رہا تھا

جہاں تک دھواں تھا

درج بالا نظم میں ندا فاضلی نے فسادات اور تقسیم ملک سے پیدا شدہ صورتِ حال کو بیان کیا ہے۔

فسادات اور تقسیم کے نتیجے میں لاکھوں لوگوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ہر طرف افراتفری کا ماحول برپا

ہو گیا۔ بستیاں برباد ہو گئیں اور آبادیوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ اس افراتفری کے ماحول میں ندا فاضلی کا پورا

خاندان پاکستان ہجرت کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ آج بھی کچھ ایسے شری پسند انسان نظر آتے ہیں جو انسانیت کو

مجرور کرنے میں لگے ہیں۔ یہ مرض نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں پایا جاتا ہے۔ ندا فاضلی کی

فسادات سے متعلق نظموں میں تاریخ اور سیاست کا جبر آرٹ کی جمالیات کو مجروح نہیں کرتا۔ یہی ان کے

شاعرانہ اظہار کی طاقت ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم ”انسان“ ملاحظہ فرمائیں:

انسان میں حیوان یہاں بھی ہے وہاں بھی
اللہ نگہبان یہاں بھی ہے وہاں بھی
خون خوار درندوں کے فقط نام الگ ہیں
ہر شہر بیاباں یہاں بھی ہے وہاں بھی
ہندو بھی سکون سے ہے مسلمان بھی سکون سے
انسان پریشان یہاں بھی ہے وہاں بھی
رحمن کی رحمت ہو کہ بھگوان کی مورت
ہر کھیل کا میدان یہاں بھی ہے وہاں بھی
اٹھتا ہے دل و جاں سے دھواں دونوں طرف ہی
یہ میر کا دیوان یہاں بھی ہے وہاں بھی

اس غزل نما نظم میں نڈا فاضلی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اصل میں حیوان انسان کے اندر ہی چھپا ہوا ہوتا ہے۔ وہ تو صرف موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ موقع پا کر وہ اپنی اصل شکل اختیار کر کے انسانیت کو نوج ڈالتا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کو موضوع بنایا ہے۔ دونوں جگہوں پر فرقہ وارانہ فسادات برپا ہو رہے ہیں جس کا خمیازہ عام انسانوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ خون خوار درندے دونوں جگہوں پر دکھائی دیتے ہیں جو شہروں اور بستیوں کو ویران کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں پر آئے دن جو ظلم و تشدد ہو رہا ہے اس کے ذمے دار ہمارے سیاسی رہنما ہیں جو اپنا مفاد پورا کرنے کے لیے نہ صرف فسادات برپا کرنے میں کمر بستہ رہتے ہیں بلکہ انسانیت کا قتل عام کرنے میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔ جس طرح میر تقی میر کے دیوان سے درد و غم کا دھواں اٹھتا ہے، اسی طرح کی صورت حال ہندو پاک میں فسادات اور ظلم و تشدد سے رونما ہو رہی ہے۔ نڈا فاضلی نے ایک اور نظم ”فرد کی موت“ میں بھی اسی صورت حال کو پیش کیا ہے:

چڑیوں کی گنتی ہوتی ہے

ان کے نام نہیں ہوتے

ساری چڑیاں ایک سی ہوتی ہیں

بھیڑ بکریوں کی گنتی ہوتی ہے

ان کے نام نہیں ہوتے
 ساری بھیڑ بکریاں ایک سی ہوتی ہیں
 مسلمانوں کی بھی گنتی ہوتی ہے
 ان کے نام نہیں ہوتے
 سارے مسلمان ایک سے ہوتے ہیں

علاقائی تعصب اور فرقہ وارانہ فسادات آج طرزِ زندگی بن گئے ہیں۔ آج فسادات اور جنگ پر جو
 نظمیں کہی جا رہی ہیں، ان میں نہ افاضلی کی نظمیں اپنا ایک الگ انداز رکھتی ہیں۔ یہ نظمیں ان نظموں سے کئی
 لحاظ سے الگ ہیں جو تقسیمِ وطن کے بعد لکھی گئیں۔ ان کا موضوع فساد ہو یا جنگ ان میں ایک الگ سوچ نظر
 آتی ہے۔ وہ سرحد کو سرے سے ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ فسادات پر مبنی اس نظم میں انھوں نے یہ بتانے کی
 کوشش کی ہے کہ جس طرح بھیڑ بکریوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ہانکا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسانوں کو
 بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ مذہبی اور نسلی نفرت آج کل عام ہو گئی ہے۔
 جنگ پر لکھی گئی نظموں میں ان کی ایک اور نظم ”شرط“ ملاحظہ کریں:

تم فوج میں بھرتی ہونا چاہتے ہو
 ضرور ہو! لیکن یاد رہے

جنگ کے دوران تمہارا ملک جو کہے گا وہ سچ ہوگا
 اور اس سچ کے لیے / تمہیں اپنی جان سے کھیلنا ہوگا
 تمہارے دوستوں / اور دشمنوں کی
 فہرست سیاستوں کی طرح بدلتی رہے گی
 جنگ کے ختم ہونے کے بعد
 تم امرِ شہید بھی ہو سکتے ہو
 اور بے وقوف بھی!!

جنگ پر لکھی گئی نظموں میں نہ افاضلی نے یہ سوال اٹھایا ہے کی جب دو ملکوں میں جنگ ہوتی ہے،
 سپاہی لڑتا ہے، مرتا ہے اور شہید کہلاتا ہے۔ دونوں ملکوں کے سپاہی سوچتے ہیں کہ وہ حق پر ہیں۔ اب سوال پیدا
 ہوتا ہے کہ اصل میں کون حق پر ہے؟ نہ افاضلی کے بنیادی افکار میں انسان کی مادی ترقی اور فطرت کا عدم
 توازن ابتداء ہی سے اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس کا اظہار وہ مختلف پیرائے میں کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے

مدرٹریسا (Mother Teresa) کے خدمتِ خلق اور انسانیت نواز کردار کو جس اسلوب سے سراہا ہے، وہ منفرد ہے۔ اسی طرح اپنی نظم ”معاہدہ“ میں انھوں نے پیغام دیا ہے کہ کرۂ ارض کی ساری ترقی قدرت سے ہم آہنگی کے توازن یا معاہدے پر قائم تھی۔ اب وہ توازن قائم نہیں رہا اور معاہدہ ٹوٹ گیا ہے۔ اس لیے انسان کو قدرت کی تباہ کاریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنے ماحولیاتی شعور و فکر کی پختگی کے اعتبار سے نڈافاضلی اپنے معاصرین سے بہت آگے ہیں۔ ان کی ایک اور نظم ”ستمبر 1965“ جنگ کے موضوع پر ہے۔ نظم پیش خدمت ہے:

کسی قصائی نے / ایک ہڈی چھیل کر پھینکی
گلی کے موڑ سے / دو کتے بھونکتے اٹھے
کسی نے پاؤں اٹھائے / کسی نے دُم پٹکی
بہت سے کتے کھڑے ہو کر شور کرنے لگے
نہ جانے کیوں مرا جی چاہا

اپنے سب کپڑے اتار کر / کسی چوراہے پر کھڑا ہو جاؤں
ہر ایک چیز پہ جھپٹوں / گھڑی گھڑی چلاؤں
نڈھال ہو کے، جہاں چاہوں
ہزاروں سال کی سچائیوں کو / جھٹلا دوں

مذکورہ بالا نظم میں نڈافاضلی نے ”کشمیر“ کو موضوع بنایا ہے۔ 1965 میں کشمیر کو حاصل کرنے کے لیے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑی تھی۔ اس کو انھوں نے نفرت کے لہجے میں بیان کیا ہے۔ اس نظم میں مختلف علامتوں کے ذریعے ایک تلخ حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے بڑی فن کارانہ ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ سیاست پر ان کی گہری نظر ہوتی تھی۔ وہ کئی بار سیاست کا شکار ہوئے۔

اس کے علاوہ نڈافاضلی کی چند دیگر نظموں میں بھی ان کی سیاسی حسیت، ظلم و جبر اور بربریت کے خلاف احتجاج کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ نظم ”مت رو بے بی“ اس یہودی بچے کے نام معنون ہے، جس کے والدین بمبئی کے تاج ہوٹل پر دہشت گردانہ حملے میں مارے گئے تھے۔ ایک اور نظم ”ملالہ“ میں مشہور افغانی طالبہ کے جذبہ علم کی ستائش اور اس پر قاتلانہ حملے کی مذمت کی گئی ہے۔ ایک اور نظم ”منٹو کا پاگل خانہ“ میں انھوں نے ہندو پاک کے مابین پختی سیاسی نفرت و عداوت کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اسی طرح ”پاسپورٹ

آفسر کے نام، ”سرحد پار کا ایک خط“ اور ”جب تلک وہ جیا“ جیسی تخلیقات سے جھلکتا ہے کہ ان کی شاعری سیاسی و سماجی زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اپنے بیانیے کی دیسی بوباس اور لب لہجے کی انفرادیت کے باعث انھوں نے ادب میں اپنی شناخت قائم کی۔

(5) مذہبی موضوعات:

نذا فاضلی کی نظمیں شاعری میں مذہبی رواداری کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ہر عمر اور ہر مزاج کے انسان کی نمائندگی ملتی ہے۔ دنیا کی ہر وہ شے جو تکمیلیت کے حصول کے لیے بے قرار ہو، خود سے گزر جاتی ہے کہ یہی اس کا مقدر ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس مرحلے میں ایک مخصوص قسم کی انفرادیت جنم لیتی ہے، جو شخصیت میں ایک طرح کی ماورائیت اور غیر محدودیت سے عبارت ہے۔ زندگی کے خارجی مسائل اور حادثات نے انسان کو بے حس و بے جان کر کے رکھ دیا ہے۔ بے شمار آدمیوں کے اس جنگل میں انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ ہانکا جا رہا ہے۔ انسانیت پامال ہو رہی ہے۔ سب کچھ ایک دکھاو نظر آتا ہے۔ اصل صورت تو نذا فاضلی کی نظم ”لفظوں کا پل“ پیش کرتی ہے:

مسجد کا گنبد سونا ہے / مندر کی گھنٹی خاموش
جُودانوں سے لپٹے / سارے آدرشوں کو
دیمک کب کی چاٹ چکی ہے
رنگ / گلابی / نیلے / پیلے / کہیں نہیں ہیں
تم اُس جانب / میں اِس جانب
بچے میں میلوں گہرا غار
لفظوں کا پل ٹوٹ چکا ہے
تم بھی تنہا / میں بھی تنہا

نذا فاضلی کی اس نظم کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ تمام مذہبی روایات اور قدریں مٹ چکی ہیں۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ قدروں کا وجود ہے بھی یا نہیں؟ آج محبت، وفا اور خلوص جیسے الفاظ اپنی معنویت کھو چکے ہیں۔ کبھی یہ الفاظ ہمارے گہرے تاثرات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اب واقعی بے معنی نظر آتے ہیں۔ نذا فاضلی اپنے مخصوص انداز میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آج کا انسان تنہائی کا شکار اس لیے ہے کیوں کہ ”لفظوں کا پل“

ٹوٹ چکا ہے۔ آج کل مذہبی اصطلاحات کا استعمال اس کثرت سے ہونے لگا ہے کہ جو الفاظ عملی طور پر برتے جانے تھے وہ محض بولنے کے لیے رہ گئے ہیں۔ اس طرح اقوال اور افعال کے تضادات اور مذہبی اقوال کے پس پردہ سیاست نے صورتِ حال کو اور پیچیدہ کر دیا۔ مذہبی سیاست اور سیاسی مذہبیت نے مذہب کے صحیح معنی و مفہوم کو مسخ کر کے انسان کو الجھا دیا ہے۔ مذا فاضلی نے مختلف نظموں میں مذہب اور خدا کو موضوع بنایا ہے جن میں ”خدا کا گھر نہیں کوئی“، ”ابھی کچھ اور قصہ ہے“، ”انتقام“ اور ”حمد“ قابل ذکر ہیں۔ اس ضمن میں ان کی نظم ”ابھی کچھ اور قصہ ہے“ پیش خدمت ہے جس میں اس مرکزی خیال کو پیش کیا گیا ہے کہ انجیل مقدس کے مطابق حضرت عیسیٰ مصلوب ہونے کے بعد دوبارہ ظاہر ہوئے تھے:

نہیں!! ٹھہرو!! ابھی پردہ نہیں کھینچو!

ڈرامہ ختم ہونے میں ابھی کچھ سین باقی ہیں

یہاں تک تو وہ مجرم ہے جو سولی پر لٹکتا ہے

یہاں تک تو بدن ہے وہ جو کیلوں سے کسکتا ہے

یہاں تک تو وہ غم ہے اماں کی آنکھوں سے چھلکتا ہے

جواب تک ہو چکا ہے ا کھیل کا وہ ایک حصہ ہے

یہاں سے آگے جو لکھا ہے اوہ کچھ اور قصہ ہے

تماشہ کو تماشا ئی / یہیں گھر چھوڑ بیٹھیں گے

جورشتہ از ندگی کا موت سے ہے / توڑ بیٹھیں گے

مذہب کا نظام انسانی ذہن کو بہت سے تضادات سے نجات دلاتا ہے۔ اس سے انسانوں کو بہت سارے سوالوں کے بنے بنائے جواب بھی مل جاتے ہیں۔ انھیں اپنے مسائل پر غور کر کے حل تلاش کرنے نہیں پڑتے۔ اسی لیے انسان اس نظام سے سکون محسوس کرتا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ محبت کے رشتے ٹوٹ چکے ہیں۔ عقائد، مسلک اور عبادت کے طریقہ کار میں بھی تبدیلی آ گئی ہے۔ اب تو عالم یہ ہے کہ خدا پرستی کے پردے میں کبھی ذاتی اور کبھی سیاسی اغراض و مقاصد حاصل کیے جاتے ہیں۔ ان کی ایک اور نظم ”خدا کا گھر نہیں کوئی“ دیکھیے جس میں خدا کے تصور کو پیش کیا گیا ہے:

خدا کا گھر نہیں کوئی

بہت پہلے ہمارے گاؤں کے اکثر بزرگوں نے

اسے دیکھا تھا / پوچھا تھا / یہیں تھا وہ
 یہیں بچوں کی آنکھوں میں / مہکتے سبز پیڑ پودوں میں
 وہ رہتا تھا / ہواؤں میں مہکتا تھا / ندی کے پاس بہتا تھا
 ہمارے پاس وہ آنکھیں کہاں ہیں / جو پہاڑی پر
 چمکتی / بولتی / آواز کو دیکھیں / ہمارے کان بہرے ہیں
 ہماری روح اندھی ہے / ہمارے واسطے
 اب پھول کھلتے ہیں / نہ کو نیل گنگناتی ہے
 یہ خاموشی اکیلے میں سنہرے گیت گاتی ہے
 ہمارا عہد! / ماں کے پیٹ سے اندھا ہے بہرا ہے
 ہمارے آگے پیچھے / موت کا تاریک پہرا ہے

مذکورہ بالا نظم کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ ندافاضلی کو کائنات کی ہر شے میں
 خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ دنیا میں چاروں طرف جو بھی اشیا ہیں ان سبھی میں کسی نہ کسی صورت میں خدا کا نور جلوہ
 گر ہے۔ اس نظم میں جس خیال کو پیش کیا گیا ہے وہ صوفیانہ خیال سے مملو ہے۔ جب انسان کے افعال و
 اعمال اچھے ہوں گے تو وہ اپنے مالک حقیقی کا قُرب پاسکتا ہے۔ ندافاضلی کی اس طرح کی نظمیں مذہبی اور نسلی
 تفریق مٹانے پر زور دیتی ہیں۔ آج کا انسان اپنی بصیرت کھو چکا ہے۔ اس کی نگاہیں اب روشن نہیں رہیں۔
 اس تیز رفتار معاشرے نے اس سے کائنات کے اندرونی روابط اور رشتوں کو دیکھ سکے کی صلاحیت چھین لی
 ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بہت پہلے گاؤں کے بزرگوں نے خدا کو پہچانا تھا، دیکھا اور پوچھا تھا، ہواؤں میں اس کو
 مہکتے اور ندی کے ساتھ بہتے دیکھا تھا لیکن اب ہمارے کان بہرے ہو گئے ہیں اور ہماری روح اندھی ہو گئی
 ہے۔ اب نہ ہم اس کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ اس کی آواز کو سن سکتے ہیں۔ اس نظم میں انھوں نے وحدت الوجود
 کے ذریعے خدا کے تصور کو پیش کیا ہے۔ اگر خدا چاند، ستاروں، آفتاب، زمین اور فطرت سے الگ کوئی چیز
 نہیں تو انسانی عوامل اور اس کی ضرورتوں سے بھی الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ ان کی نظم ”حمد“ اس رشتے کی بہت
 اچھی ترجمانی کرتی ہے۔ نظم دیکھیے:

نیل گگن میں بیٹھے / کب تک چاند ستاروں سے جھانکو گے
 پر بت کی اونچی چوٹی سے / کب تک دنیا کو دیکھو گے

آدرشوں کے بند صحیفوں میں / کب تک آرام کرو گے
میرا چھپر ٹپک رہا ہے / بن کر سورج اسے سکھاؤ
خالی ہے آٹے کا کنستر / بن کر گیہوں اس میں آؤ
ٹوٹ گیا ہے ماں کا چشمہ / شیشہ بن کر اسے بناؤ
چپ چاپ ہیں آنگن میں بچے / بن کر گیندا انھیں بہلاؤ
شام ہوئی ہے / چاندا گاؤ / پیڑ ہلاؤ / ہوا چلاؤ
کام بہت ہیں / ہاتھ بٹاؤ اللہ میاں
میرے گھر میں / آہی جاؤ اللہ میاں

اس نظم میں نداء فاضلی نے خدا کا تصور پیش کیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ خدا دنیا میں آکر ان کا ہاتھ بٹائے۔ نیلے آسمان پر بیٹھا چاند ستاروں سے نہ جھانکے بلکہ بہتر ہوگا کہ وہ اس کی ٹپکتی ہوئی چھت کو ٹھیک کر دے۔ خالی کنستر کو گیہوں سے بھر دے اور اداس بچوں کو بہلا دے۔ دراصل نداء فاضلی نے ہمیشہ ہی صوفی اور پنڈت کے گمان پر انسان کے ذاتی تجربوں کو فوقیت دی ہے۔ ”میرے گھر میں آہی جاؤ اللہ میاں“ ان کی دی ہوئی فٹ نوٹ کے مطابق یوپی کے ایک لوک گیت کا مصرع ہے۔ گویا لوک گیتوں میں خدا کا یہ معصومانہ تصوّر زندہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مذہب کی غلط تعبیروں اور سیاست دانوں کی غلط کاریوں نے انسانی رشتوں میں دوریاں پیدا کی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ نفرت اور عداوت کو بھی ہوا دینے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اس حوالے سے بشر نواز اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

”یہ خدا ہے جو ایک جے جمائے معصوم سے معاشرے کی ہر چیز میں جلوہ نمائی کرتا ہے۔ اس خدا کو آسمانی دھند لکوں میں ڈھونڈنے کے بجائے، ندانے زمین پر سانس لیتے رشتوں میں تلاش کیا ہے جو وحدانیت کے تصور خدا سے زیادہ قریب ہے۔ رشتوں کی اس تنظیم کے ٹوٹ جانے اور اس کے ساتھ انسانی فطری معصومیت کی دردناک موت کے بعد انسانیت ضرورت سے زیادہ تنہا اور غیر محفوظ ہو جاتی ہے۔“ 9

نداء فاضلی کی شاعری میں خدا پر نظمیں ملک میں فرقہ پرستی کا ردِ عمل ہیں۔ خدا ان کے دماغ میں اتنا نہیں جتنا دل میں ہے۔ وہ ایک دانشورانہ حربہ ہے تنگ نظر مذہبیت کے خلاف نبرد آزمائی کا۔ بہت سے شعرا

نے فرقہ پرستی اور فسادات کے خلاف نظمیں لکھی ہیں جو بہت اثر انگیز ہیں۔ انھوں نے اپنی نظمیں شاعری میں اس خدا کا تصور پیش کیا جو فطرت کے رگ وریشے میں قوتِ نموبن کر دوڑتا ہے۔ انھوں نے اپنی ایک نظم ”انتقام“ میں مذہب اور خدا کے تصور کو موضوع بنایا ہے۔ اس حوالے سے نظم ملاحظہ کریں:

مسجدوں مندروں کی دنیا میں / مجھ کو پہچانتے کہاں ہیں لوگ
روز میں چاند بن کے آتا ہوں / دن میں سورج سا جگمگاتا ہوں
کھٹکھٹاتا ہوں ماں کے گہنوں میں / ہنستار ہوتا ہوں چھپ کے بہنوں میں
میں ہی! / مزدور کے پسینے میں / میں ہی! / برسات کے مہینے میں
میری تصویر آنکھ کا آنسو / میری تحریر / جسم کا جادو
مسجدوں مندروں کی دنیا میں / مجھ کو پہچانتے نہیں جب لوگ
میں! / زمینوں کو بے ضیا کر کے / آسمانوں میں لوٹ جاتا ہوں
میں خدا بن کے / قہر ڈھاتا ہوں

نہ افاضلی نے اس نظم میں بتایا ہے کہ خدا انسان کی مذہبی فتنہ پروازیوں سے بیزار ہو کر مندر و مسجد کی دنیا سے دور چلا گیا ہے۔ وہ روز چاند بن کر آتا ہے اور سورج بن کر جگمگاتا ہے۔ ماں کے گہنوں میں کھٹکتا ہے اور چھپ کر بہنوں میں ہنستا ہے۔ وہ مزدور کے پسینے میں بھی ہے اور برسات کے مہینے میں بھی وہ جلوہ گر ہے۔ چناں چہ وہ غصہ ہو کر آسمان پر لوٹ جاتا ہے اور قہر ڈھاتا ہے۔ جب تک وہ مظاہرِ فطرت میں تھا، درختوں، پرندوں، بچوں کی ہنسی، ماں کے پیار، نسائی پیکر کے حسن اور انسانی محنت میں تھا، رحمتوں اور برکتوں کی صورت تھا۔ جب اسے مندر و مسجد میں قید کیا جاتا ہے تو فتنہ و فساد جنم لیتے ہیں۔ دراصل نہ افاضلی کے یہاں سیکولر خدا کا تصور ملتا ہے۔ وہ خدا اور انسان کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی بہترین ترجمانی حضرت موسیٰ اور گڑ ریا کی وہ حکایت یا کہانی کرتی ہے، جس میں گڑ ریا کہتا ہے کہ اگر اسے خدا ملے تو اسے نہلائے گا، کھانا کھلائے گا اور کنگھی بھی کرے گا۔ وہ مذہبی دکھاوے پر سخت طنز کرتے ہیں اور دونوں مذاہب کے لوگوں کے غلط رسم و رواج کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نماز کے لیے عالی شان مسجدیں بنائی جاتی ہیں لیکن غریب انسان کے پاس رہنے کے لیے جگہ بھی نہیں ہے۔ اسی طرح ہندو مذہب کی ایک غلط رسم پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پتھر کی مورتیوں پر گھی، پوری اور مٹھائیاں چڑھائی جاتی ہیں جو وہ کھاتی نہیں لیکن باہر جو بھوکا بھکاری بیٹھا ہے، اسے کوئی ایک وقت کی روٹی دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔

غرض انتشار کے اس ماحول میں نڈا فاضلی جیسے شاعر کی سخت ضرورت ہے جو نا انصافی، سماجی بدعنوانی، فرقہ پرستی اور مذہبی بے راہ روی کے خلاف اپنی بات بے باکی سے کہہ سکے۔

(6) ہندوستانی تہذیب:

تہذیب انسانی زندگی کی تمام سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں علم، عقیدہ، آرٹ، اخلاق، قانون، رسومات اور ایسی تمام چیزیں شامل ہیں جن کا تعلق سماج سے ہوتا ہے۔ کسی بھی تہذیب میں زبان و ادب اور فنونِ لطیفہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہندوستان میں مختلف افکار و نظریات اور عادات و اطوار کے لوگ رہتے ہیں۔ یہاں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، بودھ، جین اور پارسی مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔ نڈا فاضلی کی نظمیں شاعری میں ہندوستانی تہذیب کی عکاسی ملتی ہے۔ ہندوستانی مٹی کی بوباس اور خوشبو ان کی شاعری میں رچی بسی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ہندوستانی تہذیب کو زندہ رکھا۔ ان کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن میں گاؤں، شہر اور ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے۔ ”ایک دن کی سیر“، ”سردی“، ”پہلا پانی“، ”نیا دن“، ”چھوٹے شہر کی رات“، ”میرا شہر“، ”برسات“، ”نیا روگ“، ”مجھے یاد ہے“، ”دوسہیلیاں“، ”بمبئی“، ”پکھلتا دھواں“، ”سحر“، ”گھٹن“، ”جیب کٹنے کے بعد“، ”کسان“ وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ یہاں ان کی نظم ”مجھے یاد ہے“ پیش خدمت ہے:

مجھے یاد ہے / میری بستی کے سب پیڑا پر بت
 ہوائیں / پرندے / مرے ساتھ روتے تھے ہنتے تھے
 میرے ہی غم میں / ادرا یا! / کناروں پر سر کو پکٹتے تھے
 میری ہی خوشیوں میں / پھولوں پہ / شبنم کے موتی چمکتے تھے
 یہیں! / سات تاروں کے جھرمٹ میں / الاشکل سی
 جو تھک روشنی تھی / وہی! / جگنوؤں کی / چراغوں کی
 بلی کی آنکھوں کی / تابندگی تھی / اندی!

میرے اندر سے ہو کے گزرتی تھی / آکاش
 آنکھوں کا دھوکا نہیں تھا / یہ بات ان دنوں کی ہے
 جب اس زمیں کو / عبادت گھروں کی ضرورت تھی

مجھی میں خدا تھا

اس نظم میں نَدَافِ ضَلٰی نے گاؤں کے ماحول کی عکاسی جس خوبی کے ساتھ کی ہے وہ اپنے آپ میں ایک نیا احساس ہے۔ اس میں انھوں نے پیڑ پودوں کے ساتھ، ہواؤں، پرندوں، پھولوں، جگنوؤں، چراغوں وغیرہ کا ذکر کر کے گاؤں کی تصویر کشی کی ہے۔ گاؤں کی ان تصویروں کو وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جس کا تعلق یا رشتہ گاؤں سے رہا ہو۔ انھیں اپنے آس پاس کی چیزوں سے کافی لگاؤ تھا۔ گاؤں دیہات میں انسان ایک دوسرے کے دکھ سکھ اور درد غم سے باخبر رہا کرتے تھے۔ وہاں انسانی ہمدردی کو عبادت کا درجہ حاصل ہوا کرتا تھا۔ لیکن آج کے دور میں انسان مادیت پرست اور مفاد پرست بن گیا ہے جس کے نتیجے میں ان اقدار کا نام و نشان مٹ گیا ہے۔ اسی طرح نَدَافِ ضَلٰی کی ایک اور نظم ”ایک دن کی سیر“ گاؤں کی تصویر پیش کرتی ہے۔

اترتی دھوپ کا ایک گول ٹکڑا / ہوا میں ڈولتا پیپل کا پتا
کھلی کھڑکی میں اک گوری کلائی / گلابی اُون میں لپٹی سلائی
سرک کو کاٹتی اک کالی بلی / اچانک چھٹھاتی کوئی لڑکی
منڈیری پر رکھا اک ٹوٹا پنجرہ / جھکے چھجے سے گرتا باسی گجر
یہ دھندلی دھندلی بے معنی لکیریں / بظاہر کچھ نہیں مفہوم جن کا
ہنسی آئے گی میرے دوستوں کو / اگر میں ان کو کوئی نام دے دوں
گزشتہ ماہ کا بھوپال کہہ دوں

نَدَافِ ضَلٰی نے اس نظم میں گاؤں کی بہترین منظر کشی کی ہے جہاں دھوپ نکلتے ہی پیپل کے پتے کا سایہ زمین پر پڑتا ہے۔ کھلی کھڑکی سے ایک خوب صورت لڑکی کی کلائی نظر آتی ہے جو اپنے ہاتھوں سے گلابی اُون سے سلائی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ عام طور سے گاؤں دیہات کی لڑکیاں فرصت کے وقت میں بُنائی کا کام بھی کرتی ہیں۔ اسی طرح وہاں پرندے اور جانور شوق سے پالے جاتے ہیں۔ لڑکیاں اپنے بالوں کی خوب صورتی بڑھانے کے لیے پھولوں کی مالا بھی استعمال کرتی ہیں جسے گجرا کہا جاتا ہے۔ اس مختصر نظم میں مختلف تصویریں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ نَدَافِ ضَلٰی کی نظم ”بھور“ میں بھی اسی موضوع کو پیش کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جب گاؤں میں لوگ صبح سویرے جاگ کر اپنے کام میں لگ جاتے ہیں تو چاروں طرف کام کرنے کی آوازیں گونج اٹھتی ہیں۔ اسی طرح ایک اور نظم ”سردی“ میں بھی گاؤں کے مناظر دکھائے گئے

ہیں۔ نظم ملاحظہ کریں:

کھرے کی جھینی چادر میں

جو بن روپ چھپالے

چوپالوں پر

مسکانوں کی آگ اڑاتی جائے

گا جر توڑے / مولیٰ نوچے / پکے ٹماٹر کھائے

گودی میں اک بھیڑ کا بچہ

آنچل میں کچھ بوٹ

دھوپ سکھی کی انگلی پکڑے / ادھر ادھر منڈلائے

اس نظم کے ذریعے ندافاضلی بتاتے ہیں کہ شہروں کے مقابلے میں گاؤں میں سردیوں میں کھرا زیادہ نظر آتا ہے۔ جب سورج نمودار ہوتا ہے تو گھنا کھرا دھوپ کوزمین تک آنے نہیں دیتا۔ گاؤں کے چوپالوں میں بزرگ بیٹھتے ہیں جو بچوں اور نوجوانوں کو اپنے مفید مشوروں سے نوازتے ہیں۔ اسی طرح گا جر، مولیٰ، ٹماٹر، بھیڑ کا بچہ وغیرہ گاؤں کے ماحول کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نظم میں محبوبہ کا سراپا اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ قاری کو سرسری طور پر اس کا احساس تک نہیں ہوتا ہے۔ ”پہلا پانی“ اور ”نیادن“ جیسی نظموں میں بھی انھوں نے گاؤں کی زندگی کو زیر بحث لایا ہے۔ برسات کے دنوں میں کس طرح گھروں کی چھتوں سے پانی ٹپکتا ہے، اس منظر کو انھوں نے فن کارانہ مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ اپنی نظموں کا تانا بانا اسی ماحول سے بنتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی نظمیں تصنع اور توہم پرستی سے آزاد ہوتی ہیں۔ ان کا شعری اظہار گاؤں، شہر اور ہندستانی تہذیب کا پورا منظر نامہ پیش کرتا ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر علیم اللہ حالی اپنے مضمون ”ندافاضلی کی شعریات“ میں لکھتے ہیں:

”ندا کا غیر اعرابی بلکہ غیر سامی فکر اور وسیلہ اظہار اردو کے اپنے سرزمین

سے مربوط ہونے کا جواز پیدا کرتا ہے۔ ان معنوں میں ہم ندا کی شاعری

کو میر اور نظیر کے ڈکشن کی روشنی میں زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ ان

کا تو ان شاعری اظہار ہندستانی کلچر میں اپنا بھرپور تاثر پیش کرتا ہے۔“

در اصل نَدَافاضلی کی نظمیں شاعری کا خمیر ہندستانی مٹی سے اٹھا ہے۔ انھوں نے اپنی نظم ”سحر“ میں گاؤں کی صبح کا ذکر بڑے دل کش انداز میں کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی نظموں میں اسکول جاتے ہوئے بچوں کی تصویر کشی بھی کرتے ہیں۔ ”بھوت“ اور ”شام“ جیسی نظموں میں بھی گاؤں کی منظر کشی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی شاعری قصباتی زندگی کی آسودگی اور ٹھنڈک سے دور صنعتی شہر کے معاشرتی تضاد کی روداد پیش کرتی ہے۔ گوالیار سے بمبئی کا سفر کرنے کے بعد انھوں نے شہری زندگی کے درد و کرب کو اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں قصباتی معصومیت ملتی ہے جب کہ بڑے شہر میں آنے کے بعد ان میں ہر چیز سے لڑنے کا انداز جنم لیتا ہے۔ اس طرح ان کا المیہ پورے معاشرے کا المیہ بن جاتا ہے۔ اس تناظر میں بشر نواز اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں:

”نَدَا کی ابتدائی شاعری میں قصباتی معصومیت اور سادگی ملتی ہے۔ بڑے شہر میں آنے کے بعد اس سادگی کا تصادم یہاں کے تجارتی تعلقات اور اس سے پیدا ہونے والی ریاکاری سے ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں نَدَا کے ہاں جھنجھلاہٹ اور ہر چیز سے لڑ جانے کا انداز جنم لیتا ہے۔ لیکن ٹھوکر سے اُجالا کشید کرنے کے شعور میں پھر ایک نئی دنیا کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جس میں سبھی ایک درد کے مارے ہیں۔ تضادات، دکھ درد، یہاں بھی ہیں لیکن یہ کسی ایک فرد کا المیہ نہیں ہے۔ نَدَا نے اپنی فنی سوجھ بوجھ سے اپنے المیہ کو پورے معاشرے کا المیہ بنا دیا ہے۔“ 11

معاشرتی زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار اور بے حسی کو دیکھ کر نَدَا فاضلی کے اندر ایک کرب کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنی شاعری کو حقیقت کا محور بناتے ہیں اور تخلیق کو زندگی کی کڑوی سچائیوں سے آراستہ کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افکار و خیالات سے جمود کا طلسم توڑ کر ایک نیا جہاں آباد کیا۔ انھوں نے شاعری کے ذریعے انسان کی بے حسی اور ہندستان کی زوال آمادہ مشرقی تہذیب پر گہرا طنز کیا ہے۔ انھوں نے معاشرے میں جہاں کہیں بھی برائیاں دیکھیں ان کو بڑی بے باکی سے منظرِ عام پر لانے کی سعی کی ہے۔ ان کی شاعری ارضی اور زمین سے جڑی ہوئی شاعری ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں نہ صرف گاؤں کی منظر کشی کی ہے بلکہ شہری زندگی کے مسائل کو بھی بڑی پختگی سے برتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظم ”بمبئی“ میں شہری زندگی کے کرب کو

یوں بیان کیا ہے:
 یہ کیسی بستی ہے / میں کس طرف چلا آیا
 فضا میں گونج رہی ہیں ہزاروں آوازیں
 سُلگ رہی ہیں ہواؤں میں ان گنت سانسیں
 جدھر بھی دیکھو / کھولے، کولہے، پنڈلیاں، ٹانگیں
 مگر کہیں کوئی چہرہ نظر نہیں آتا
 یہاں تو سب ہی بڑے چھوٹے اپنے چہروں کو
 چمکتی آنکھوں کو، گالوں کو، ہنستے ہونٹوں کو
 سروں کے خول سے باہر نکال لیتے ہیں
 سویرے اُٹھتے ہی / جیبوں میں ڈال لیتے ہیں
 عجیب بستی ہے! / اس میں نہ دن، نہ رات، نہ شام
 بسوں کی سیٹ سے سورج طلوع ہوتا ہے
 جھلسستی ٹین کی کھولی میں چاند سوتا ہے
 یہاں تو کچھ بھی نہیں! / ریل اور بسوں کے سوا
 زمیں پر ریگلتے بے حس سمندروں کے سوا
 عمارتوں کو لگتی عمارتوں کے سوا
 یہ قبر قبر جزیرہ کسے جگاؤ گے
 خود اپنے آپ سے اُلجھو گے ٹوٹ جاؤ گے
 یہاں تو کوئی بھی چہرہ نظر نہیں آتا

نہا فاضلی نے اس نظم میں شہر کی مصروف زندگی کو زیرِ بحث لایا ہے۔ بمبئی ایک ایسا شہر ہے جہاں چاروں طرف شور ہی شور سنائی دیتا ہے۔ یہاں ہر گلی اور ہر راستے میں انسانوں کی بھیڑ دکھائی دیتی ہے مگر کوئی جانا پہچانا چہرہ نظر نہیں آتا۔ جس طرف بھی نگاہ جاتی ہے اس طرف ناریل کے پیڑ اور سمندر کی کشادگی دکھائی دیتی ہے۔ درخت، آسمان، ہوا، سمندر اور انسان سب اجنبی سے نظر آتے ہیں۔ اس حالت میں کسی کی شخصیت کو پہچانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ شہر اتنا عجیب ہے کہ نہ دن کا پتہ چلتا ہے، نہ رات کا اور نہ ہی شام کا پتہ چلتا ہے۔ اس شہر میں ریلوں اور بسوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ بڑی بڑی عمارتیں بھی دکھائی

دیتی ہیں جو چھوٹی عمارتوں کو نگلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس شہر میں لوگوں کا حال یہ ہے کہ کسی کو بھی ایک دوسرے کی فکر نہیں ہے، کیوں کہ ہر آدمی اپنی ہی ذات میں گم دکھائی دیتا ہے۔ نذا فاضلی نے اپنی اس نظم میں بمبئی شہر کی پریشانیوں کا ذکر بڑے فن کارانہ انداز میں کیا ہے۔ بڑے شہر میں کوئی کسی کا یا نہیں ہوتا اور نہ ہی ایک دوسرے کے غم میں شریک ہونے کی فرصت ہوتی ہے۔ ان کی کلیات میں ایک ایسی نظم شامل ہے جس میں شہر اپنے تضادات سے چور ایک کیفیت میں ڈوبا ہوا ملتا ہے۔ اس نظم کا عنوان ”میرا شہر“ ہے۔ نظم پیش خدمت ہے:

یہ ہی شہر / جواب / سمندر کنارے / بنا چھاؤں کے ناریل کے سہارے
 جھکائے ہوئے سر کو بیٹھا ہوا ہے / اکیلا سا / چپ چپ سا سہا ہوا ہے
 کبھی یہ بھی / چاروں طرف بھاگتا تھا / بڑا زندہ دل تھا / یہ راتوں میں
 دن کی طرح جاگتا تھا / کبھی جینز پہنے / جوانوں کے جیسا
 کبھی چلتی لوکل میں / گانوں کے جیسا / کبھی آرتی اور
 اذانوں کے جیسا / کبھی دور کے / آسمانوں کے جیسا
 صدا اس کی / ہر خواب میں گونجتی تھی
 کھٹکتا ہوا ایسا کلدار تھا وہ / شرابی / جواری / بھکاری / پجاری
 خود اپنی ہی ہستی میں سرشار تھا وہ / نظر لگ گئی شاید اس کو کسی کی
 یہ بادل سا گھر گھر / برستا بہت تھا / کبھی اس کی جیبوں میں
 ڈھیروں ہنسی تھی / یہ ہنستا بہت تھا

اس نظم میں بڑے شہر کا پورا کرب اور حیرانی و پریشانی کا اظہار ملتا ہے۔ اس میں شہر کی کیفیات، پھیلاؤ، گہما گہمی بالکل گاؤں دیہات کی تہذیب سے ملتی جلتی ہے۔ اس نظم کے تعلق سے وارث علوی لکھتے ہیں:

”نذا کی شاعری کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ ان میں پہلی بار بڑے شہر میں غریب الوطن شاعر کا پورا کرب، حیرانی، پریشانی کا اظہار ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جدید شاعروں میں کسی کے یہاں نگر کویتا کی اتنی اچھی اور رنگارنگ کیفیات کی حامل شاعری کی مثال نہیں ملتی، جتنی کہ نذا

نہا فاضلی نے اپنی نظموں میں گاؤں کی سرسبز، شاداب اور حسین وادیوں سے لے کر شہر کے ہنگاموں، انسانی دکھ درد، زندگی، موت، نفرت، محبت وغیرہ کو بھی موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے، اس کو غیر معمولی انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں آسمان کی باتیں نہیں کرتے بلکہ زمین پر زندگی بسر کرنے والوں کی حقیقی ترجمانی کرتے ہیں اور ان کے مسائل کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج انسان کو سمجھنا بہت مشکل ہو گیا ہے کیوں کہ اس کا ظاہر کچھ اور ہے اور باطنی طور پر وہ کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ انھوں نے ایک اور نظم ”گھٹن“ میں شہر کی مصروف زندگی کو پیش کیا ہے۔ جب آدمی دن کو کام پر جاتا ہے اور واپس لوٹنے پر وہ گھر میں بھی کام کرتا ہے۔ اسی کام اور محنت کو نہا فاضلی نے اس نظم میں بیان کیا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے ایک بت تراش کی روزمرہ زندگی کو پیش کیا ہے جو شہر میں رہتا ہے۔ گھر واپسی پر وہ گھر والوں سے لڑتا جھگڑتا ہے اور آخر میں ایک پتھر کو تراش کر ایک خوب صورت مورتی بناتا ہے۔ اسی طرح ایک اور نظم ”جیب کٹنے کے بعد“ میں بھی شہری زندگی کی کشمکش کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں گاؤں کی یاد کو شہر کی مصروف زندگی میں گم ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس نظم سے عام انسانوں کے معاشی مسائل بڑے پیمانے پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں گاؤں، شہر اور خاندانی رشتے پوری معنویت کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ اس ضمن میں انور خان کے مضمون کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

”گھریلو رشتے، گھر آنگن، ہندستانی مزاج و موسم کا عکس نہا کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں مگر اس سے بھی اہم عنصر جو انھیں اپنے نوع کے دوسرے شاعروں سے الگ کر دیتا ہے، وہ ہے ان کی شاعری میں آج کے انسان کی ذہنی کشمکش کا بھرپور اظہار۔ شاید وہ بھی اور بہت سے شاعروں کی طرح اپنے بنائے ہوئے دائروں میں محصور ہو جاتے مگر بمبئی شہر کی ہنگامہ خیز، پُر آشوب زندگی نے انھیں ایک بڑے تجربے سے

دوچار کیا۔“ 13

نہا فاضلی کی شاعری بالخصوص نظموں میں ہندستانی تہذیب کی روح نظر آتی ہے۔ گاؤں کی مٹی کی بو باس اور خوشبو ان کی نظموں کی فضا کو معطر کر دیتی ہے۔ انھیں اپنے وطن کے ندی نالوں، پہاڑوں، جنگلوں، جھاڑیوں، ہرے بھرے کھیت کھلیانوں، درختوں، پرندوں وغیرہ سے پیار ہے۔ گاؤں سے وابستگی دراصل ان کے خون میں شامل ہے۔ ان کی نظمیں لوگوں کے جذبات و احساسات، ان کے رسم و رواج، رہن سہن اور

ہندستانی تہذیب کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔

(7) رشتوں کی اہمیت:

نَدافاضلی کی شاعری میں خاندانی رشتوں کی اہمیت پر کافی زور ملتا ہے۔ گھر اور رشتوں کے تصور کو انھوں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ انھیں اپنے والدین، چھوٹے بچوں اور دوست و احباب سے کافی لگاؤ تھا۔ انھوں نے بچوں کے لیے کئی نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ایک نظم میں وہ بچوں کو روشنی کے فرشتے قرار دیتے ہیں۔ بچہ دلش کا مستقبل ہوتا ہے، جب وہ اسکول جاتا ہے تو اس کے ساتھ دلش کا مستقبل بھی جا رہا ہوتا ہے۔ اسکول جا کر وہ روشن خیال بن جاتا ہے اور اس روشن خیالی سے وہ ہر طرح کی مشکلوں کو دور کرتا ہے۔ اس حوالے سے نَدافاضلی کی نظم ”روشنی کے فرشتے“ ملاحظہ کریں:

ہو اسویرا زمین پر پھر ادب سے آکاش / اپنے سر کو جھکا رہا ہے
کھلی فضا میں نیا اجالا / تمام بستی سجا رہا ہے / کہ بچہ اسکول جا رہا ہے
ندی میں اشان کر کے سورج / سنہری ململ کی پگڈی باندھے
سڑک کنارے / کھڑا ہوا مسکرا رہا ہے / کہ بچہ اسکول جا رہا ہے
ہوائیں! / سرسبز ڈالیوں میں / دعاؤں کے گیت گارہی ہیں
مہکتے پھولوں کی لوریاں / سوتے راستوں کو جگا رہی ہیں
گھنیرا پیپل! / گلی کے کونے سے ہاتھ اپنے ہلا رہا ہے
کہ بچہ اسکول جا رہا ہے / فرشتہ نکلا ہے روشنی کا
ہر ایک رستہ / چمک رہا ہے / یہ وقت وہ ہے
زمین کا ہر ذرہ / ماں کے دل سادھڑک رہا ہے
پرانی اک چھت پہ وقت بیٹھا / کبوتروں کو اڑا رہا ہے
کہ بچہ اسکول جا رہا ہے / کہ بچہ اسکول جا رہا ہے

اس نظم میں نَدافاضلی نے ایک بچے کے گھر سے نکل کر اسکول جانے کی کہانی کو پیش کیا ہے۔ ان کی شاعرانہ سوچ اور تخلیقی ہنرمندی نے اسے جو وسعت دی ہے وہ بے مثال ہے۔ اس نظم کا مطالعہ کرنے سے بچپن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ بچہ جو سچائی کی علامت ہے، اس کی تلاش میں وہ مسجدوں، مندروں، بے چراغ

گلیوں، ساحلوں اور چاندستاروں تک پہنچتے ہیں۔ یہ نظم انھوں نے ”شردھا“ نامی ایک چھوٹی سی بچی کو دیکھنے کے بعد کہی تھی۔ جورات بھر کی سوئی ہوئی، تازہ آنکھیں، تازہ چہرہ، بستہ ڈالے ہوئے اسکول کی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس بچی کے پاس سے گزرے اور سلام کیا۔ ایک اجنبی کے منہ سے سلام سن کر اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کے لیے انھوں نے چھ مہینے صرف کیے۔ جب نذافاضلی بار بار اس کے سامنے سے گزرتے رہے تو اس کے چہرے پر ایک دن مسکراہٹ آ گئی۔ انھوں نے یہ نظم اسی بچی کی یاد میں لکھی تھی۔ انھوں نے اپنی بیٹی ”تحریر“ کے لیے کئی نظمیں کہیں، جن میں ”چھوٹی سی شاپنگ“ قابل ذکر ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

گوٹے والی / لال اوڑھنی اس پر / چولی گھاگرا
اسی سے میچنگ کرنے والا / چھوٹا سا اک ناگرا
چھوٹی سی / یہ شاپنگ تھی / یا! / کوئی جادو ٹونا
لمبا چوڑا شہر اچانک / بن کر / ایک کھلونا
اتہاسوں کا جال توڑ کے / داڑھی / پگڑی
اونٹ چھوڑ کے / الف سے اماں / بے سے بابا
بیٹھا باج رہا تھا / پانچ سال کی بچی
بن کر بے پورا ناچ رہا تھا

یہ نظم نذافاضلی نے اس وقت کہی تھی جب ان کی بیٹی ”تحریر“ پانچ سال کی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ جے پور شاپنگ کرنے کے لیے گئے تھے۔ وہ اپنی بیٹی سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ اپنی بیٹی کے پیار میں وہ اتنا کھو گئے کہ ان کو اپنی بیٹی کے ساتھ پورا جے پور ناچتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح ایک اور نظم ”جسے لکھتا ہے سورج“ میں بھی انھوں نے اپنی بیٹی کی حرکتوں کو موضوع بنایا ہے۔ اس نظم میں وہ بتاتے ہیں کہ جب ان کی بیٹی ان کے کمرے میں آئی تو اس نے مسکراتے ہوئے کتابوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی۔ بچوں کے لیے کھلونوں سے بڑھ کر کوئی چیز معنی نہیں رکھتی۔ وہ کھلونوں سے ہی اپنا دل بہلاتے رہتے ہیں۔ دنیا کی تمام خوشیاں انھیں کھلونوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنی بیٹی بلکہ دوسرے بچوں کے جذبات و احساسات کو بھی اس نظم میں پیش کیا ہے۔ بچوں کا فطرت کے ساتھ کافی گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ وہ کھیل کھیل میں بے جان چیزوں سے بھی مگو گفتگو ہو جاتے ہیں۔ نذافاضلی اپنی بیٹی کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں اور اس کے

معصوم اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے ساتھ اپنا رشتہ استوار رکھا اور ان سے جو کچھ بھی انھوں نے اخذ کیا اس کا اظہار اپنی شاعری میں کیا۔ اسی خیال کو انھوں نے اپنی نظم ”رخصت ہوتے وقت“ میں بھی پیش کیا ہے:

رخصت ہوتے وقت / اس نے کچھ نہیں کہا
لیکن ایرپورٹ پر اٹیچی کھولتے ہوئے
میں نے دیکھا / میرے کپڑوں کے نیچے
اس نے / اپنے دونوں بچوں کی تصویر چھپا دی ہے
تعب ہے / چھوٹی بہن ہو کر بھی
اس نے مجھے ماں کی طرح دعا دی ہے

اس نظم کے مطالعے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ نذا فضلی کو اپنے آس پاس اس بچے کی کمی اس وقت محسوس ہوتی ہے، جب ان کی چھوٹی بہن رخصت ہوتے وقت اٹیچی کے کپڑوں میں اپنے بچوں کی تصویر رکھتی ہے۔ اٹیچی کھول کر بچوں کی تصویر دیکھ کر ان کے احساس میں اتھل پتھل ہوتی ہے۔ انھیں یہ خیال بے چین کر دیتا ہے کہ چھوٹی بہن ہو کر بھی اس نے انھیں ماں کی طرح دعا دی۔ یہ انسانی زندگی کی ایسی سچائی ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس نظم کے اندر وہ معصوم خواہش دہی ہوئی دکھائی دیتی ہے جو گھر اور گھر ہستی کے خوابوں میں گھرے شاعر کے دل کی پکار ہے۔ بچوں کی تصویر شاعر کو ان کا نگہبان، سرپرست اور پالنے ہار بناتی ہے۔ ماں کی دعا بچے کے لیے یہی ہوتی ہے کہ وہ بلند اقبال ہو اور سو سال تک جیے۔ ایک بہن نے تنہا بھائی کو صرف اپنے بچوں کی تصویریں دے کر اس کے بنجر وجود میں انسانی رشتوں کے کتنے سرچشموں کے دہانے کھول دیے ہیں۔

ماں کے بارے میں آج کا انسان جن خیالات و تصورات سے ایک خاص طرح کے ماحول سے گزرتا ہے۔ نذا فضلی نے اس کی ترجمانی اپنی نظموں میں کی ہے۔ ان کی والدہ خالص ہندوستانی درمیانی طبقے کی شریف خاتون تھیں۔ انھوں نے ماں کو کئی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بہت زیادہ قریب تھے۔ انھوں نے ماں سے اپنی عقیدت کا اظہار اپنی ایک نظم ”کچی دیواریں“ میں یوں کیا ہے:

میری ماں / ہر دن اپنے بوڑھے ہاتھوں سے
ادھر ادھر سے مٹی لا کر

گھر کی کچی دیواروں کے زخموں کو بھرتی رہتی ہے
تیز ہواؤں کے جھونکوں سے / بے چاری کتنا ڈرتی ہے
برسوں کی سیلی دیواریں / چھوٹے موٹے پیوندوں سے
آخر کب تک رک پائیں گی / جب کوئی بادل
گرے گا / ہر کرتی ڈھے جائیں گی

نَدافاضلی کی اس نظم سے وہ شخص زیادہ باتیں کر سکتا ہے، جس نے اپنی ماں کو جھری دار چہرے اور
ہاتھ پر ابھری مٹی کے ساتھ، گوبر اور مٹی سے کچی دیواروں کے زخموں کو بھرتے دیکھا ہو۔ ان کی ایک نظم ایسی
ہے جس کو بڑے بڑے نقادوں نے سراہا ہے۔ غزل کے فارم میں ان کی اس نظم کا عنوان تو نہیں ہے لیکن اس
کو ”ماں“ کا عنوان دیا جاسکتا ہے۔ اس نظم کو اردو کی چند بہترین نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ نظم ملاحظہ
فرمائیں:

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے ! چوکا باسن چمٹا پھکنی جیسی ماں
بانس کی کھری کھاٹ کے اوپر، ہر آہٹ پہ کان دھرے
آدھی سوئی، آدھی جاگی، تھکی دوپہری جیسی ماں
چڑیوں کی چہکار میں گونجے رادھا موہن، علی علی
مرغے کی آواز سے بجاتی گھر کی کنڈی جیسی ماں
بیوی، بیٹی، بہن، پڑوسن تھوڑی تھوڑی سی سب میں
دن بھر اک رسی کے اوپر چلتی نٹنی جیسی ماں
بانٹ کے اپنا چہرہ، ماتھا، آنکھیں جانے کہاں گئیں
پھٹے پرانے اک البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں

پانچ اشعار پر مشتمل اس نظم میں گہرائی اور گیرائی اپنی انتہا کو پہنچتی نظر آتی ہے۔ اس نظم کے ذریعے
نَدافاضلی نے اپنی ماں کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس نظم میں ماں کی محبت، اس کی زندگی کی محنت اور تمام تر
مشکلات کا بیان ملتا ہے۔ انھوں نے اس نظم میں بیسن کی روٹی، کھٹی چٹنی، چوکا، باسن، چمٹا، پھکنی، بانس،
کھاٹ، مرغے کی آواز، تھکی دوپہری، گھر کی کنڈی اور چنچل لڑکی جیسی لفظیات کا استعمال کیا ہے۔ ان سب
چیزوں میں انھیں ماں کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ اس نظم میں ماں کے گھریلو کام کاج کو وضاحت کے ساتھ بیان

کرتے ہیں۔ انھوں نے ماں کی ایسی تصویر بنائی ہے جو پوری تہذیب کی تصویر بن گئی ہے۔ وارث علوی اس نظم کو اردو کی چند بہترین نظموں میں شمار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک نظموں کا کوئی بھی انتخاب اس نظم کے بغیر ممکن نہیں۔ وارث علوی اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

”ماں کے موضوع پر تو اقبال کی نظم ”والدہ مرحومہ کی یاد میں“ ایک اچھی نظم شمار کی جاتی ہے۔ لیکن نظم فلسفیانہ خیالات سے اتنی بوجھل ہے کہ نہ تو ماں کی تصویر ابھرتی ہے نہ شخصی تاثر پُر تاثیر ڈھنگ سے اظہار پاتا ہے۔ میرے نزدیک اردو میں ماں کے موضوع پر صرف دو نظمیں یادگار رہیں گی۔ فراق کی نظم ”جگنو“ اور ندا کی منقولہ بالا نظم۔“ 14

نہا فاضلی کی اس نظم میں ماں کی ممتا کا روپ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد گرہستن کے روپ میں اس کو دکھایا گیا ہے جو چوکا، برتن، چمٹا، پھکنی کے کاموں میں منقول ہے۔ پھر گھر کی رکھوالی کے روپ میں ماں نظر آتی ہے۔ اس کے بعد گاؤں کی تپتی دوپہر، بانس کی چارپائی، دوپہر کی آدھی جاگی، آدھی سوئی نیند کا بیان اس نظم کی دل کشی میں اضافہ کرتا ہے۔ فراق اور نہا فاضلی کا کمال یہی ہے کہ ان کی محولہ بالا نظموں میں ماں کا جانا پہچانا روپ نہایت حقیقت پسندانہ طرز پر سامنے آتا ہے۔ نہا فاضلی کی نظم پانچ سات تصویروں کا ایک البم ہے لیکن ان تصویروں میں سفرِ حیات کی تمام اہم منزلوں کا عکس نظر آتا ہے۔ اس نظم پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروفیسر کوثر مظہری لکھتے ہیں:

”ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ندانے ماں پر پورا ناول تحریر کر دیا ہے، کتنی جہتیں ہیں۔ اردو شاعری میں ماں کو طرح طرح سے عقیدتوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، غزل میں، نظم میں۔ لیکن فی الحقیقت ندانے جس طرح کی نظم اور جس ڈکشن میں کہی ہے، میں نے ایسی نظم کہیں نہیں پڑھی۔ ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ایسی شاعری کا تجزیہ کرنے سے جذبہ و احساس کی لطافت ماند پڑ جاتی ہے۔ آخر کے شعر میں تو ماں کے وجود کو اپنی نئی نسل میں بانٹ کر خرچ کر کے مٹ جانے کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔“ 15

منقولہ بالا اقتباسات سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ نہا فاضلی کی اس نظم کو فراق اور اقبال کی

نظموں پر فوقیت دی گئی ہے۔ اصل میں نذا فاضلی کی یہ نظم ان کی ماں سے بے پناہ محبت کی دلیل پیش کرتی ہے۔ نذا فاضلی کی نظم نگاری میں حوالہ جاتی عنصر بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی شخصی نظموں میں ایک جلاوطن شاعر کا درد پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے والد کو اپنی ایک نظم میں موضوع بنا کر انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ جب ان کے والد کا انتقال کراچی میں ہوا تو دونوں ہمسایہ ملکوں میں سرحدی کشیدگی کے باعث وہ اپنے والد کے جنازے میں شامل نہیں ہو سکے۔ اس سانحے کو انھوں نے اپنی نظم ”والد کی وفات پر“ میں پیش کیا ہے۔ نظم ملاحظہ کریں:

تمہاری قبر پر / میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا

مجھے معلوم تھا / تم مر نہیں سکتے

تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اڑائی تھی

وہ جھوٹا تھا / وہ تم کب تھے

کوئی سوکھا ہوا پتہ ہوا سے بل کے ٹوٹا تھا

مری آنکھیں / تمہارے منظروں میں قید ہیں اب تک

میں جو بھی دیکھتا ہوں / سوچتا ہوں / وہ وہی ہے

جو تمہاری نیک نامی اور بدنامی کی دنیا تھی

کہیں کچھ بھی نہیں بدلا / تمہارے ہاتھ

میری انگلیوں میں سانس لیتے ہیں / میں لکھنے کے لیے

جب بھی قلم کا غذا اٹھاتا ہوں

تمہیں بیٹھا ہوا میں اپنی ہی کرسی میں پاتا ہوں

بدن میں میرے جتنا بھی لہو ہے / وہ تمہاری

لغزشوں کا کامیوں کے ساتھ بہتا ہے

مری آواز میں چھپ کر تمہارا ذہن رہتا ہے

مری بیماریوں میں تم / مری لاچار یوں میں تم

تمہاری قبر پر جس نے تمہارا نام لکھا ہے / وہ جھوٹا ہے

تمہاری قبر میں میں دفن ہوں / تم مجھ میں زندہ ہو

کبھی فرصت ملے تو فاتحہ پڑھنے چلے آنا

اس نظم میں نَدافاضلی کے درد و کرب کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو وہ ان کے نمازِ جنازہ میں شریک نہیں ہو پائے تھے۔ ایسے میں ان کے حساس دل پر گہرے اثرات مرتب ہوئے، جس کو انھوں نے اپنے کمالِ فن سے نظم کی صورت میں پیش کیا۔ والد کے مر جانے کے بعد وہ ان کا عکس اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔ ایک انٹرویو میں وہ بتاتے ہیں کہ وہ ایک دن سو رہے تھے تو ان کے پاؤں کا انگوٹھا ہل رہا تھا۔ ان کو یاد آتا ہے کہ یہ عادت تو ان کے والد کی تھی۔ اب یہی عادت ان کے اندر بھی پیدا ہو گئی تھی۔ بشرِ نواز اس نظم پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”زندگی اور موت کا بظاہر یہ تضاد والد کی موت پر ایک نظم میں ایک نئی اور غیر متوقع جہت اختیار کرتا ہے اور زندگی کے تسلسل کا احساس دلاتا ہے۔ یہاں موت ہر چیز کا اختتام نہیں بنتی بلکہ ایک سلسلہ در سلسلہ سفر بن جاتی ہے۔ شکلیں اور چہرے بدلتے ہیں لیکن زندگی چلتی رہتی ہے۔ یہ نظم اپنے موضوع کے برتاؤ اور جذباتی نظم و ضبط کے لحاظ سے اردو کی اہم نظموں میں سے ایک ہے۔“ 16

نَدافاضلی نے اس نظم میں بظاہر سیدھے سادے الفاظ کا استعمال کیا ہے لیکن اس کے باوجود پوری نظم ایک اکائی کی صورت میں اپنی معنوی تہیں کھولتی چلی جاتی ہے۔ وہ اپنے والد کو خود میں زندہ پاتے ہیں اور ان کی قبر میں خود کو مردہ قرار دیتے ہیں۔ اس نظم میں زندگی کی تلخ حقیقت کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ ان کی ایک بہترین نظم ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک انسان کے بڑے بڑے کارنامے اس کی شخصیت کے متعلق اتنا کچھ نہیں بتا سکتے جتنا کہ ایک معمولی سی غلطی بیان کر کے رکھ دیتی ہے۔ انسان کے معمولی سے معمولی کام میں اس کی پوری زندگی سما جاتی ہے۔ انسان کی حسرتیں اور دبی کچلی خواہشیں لاشعور میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ وہاں یہ متحرک ہو کر زندہ ہو جاتی ہیں اور غیر محسوس طور پر فن میں ترتیب و تزئین کے ساتھ ابھرتی ہیں۔ وہ مستحکم اور پاکیزہ رشتے جو جسموں سے روحوں تک پھیلے ہوئے ہیں، سارے عالم کو منتشر ہونے سے بچاتے ہیں۔ رشتوں کا یہ چکر ہی زندگی کی خوشیوں اور سچائیوں کا ضامن ہے۔ وہ بننے بگڑتے اور ٹوٹتے جڑتے رشتوں کے سچے قدردان ہیں۔

نَدافاضلی نے مذکورہ بالا موضوعات کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ انھوں نے عام آدمی کے مسائل کو کئی نظموں میں پیش کیا ہے۔ ”چھوٹا آدمی“، ”آخری سچ“، ”تمہیں سلام“، ”اپنا

دائرہ، ”کوئی اکیلا کہاں ہے“ اور ”ناراض آدمی“ جیسی نظموں میں وہ عام آدمی کو موضوع بناتے ہیں۔ یہ عام آدمی سیاست، مذہب، ادب اور تجارت کی دنیا میں الگ الگ طریقوں سے استحصال کا شکار ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ اس کے نام سے ہر کام کی شروعات ہوتی ہے لیکن اپنا مقصد پورا ہو جانے کے بعد اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں نظم ”چھوٹا آدمی“ پیش خدمت ہے:

تمہارے لیے / سب دعا گو ہیں / تم جو نہ ہو گے
تو کچھ بھی نہ ہوگا / اسی طرح مر مر کے جیتے رہو تم
تمہیں ہر جگہ ہو / تمہیں مسئلہ ہو / تمہیں حوصلہ ہو
مصور کے رنگوں میں / تصویر بھی تم
مصنف کے لفظوں میں / تحریر بھی تم
مقرر کے نعروں میں / تقریر بھی تم
تمہارے لیے ہی / خدا باپ نے
اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کیا ہے
سبھی آسمانی کتابوں نے تم پر / تمہارے عذابوں کو
آساں کیا ہے / خدا کی بنائی ہوئی اس زمیں پر
جو سچ پوچھو / تم سے محبت ہے سب کو
تمہارے دکھوں کا امدادانہ ہوگا
تمہارے دکھوں کی ضرورت ہے سب کو

یہ وہی آدمی ہے جو ہر دور میں ہار جیت کی طاقت ہے۔ اس کے اپنے خواب ہیں، اپنا سنگھرش ہے اور اس میں تبدیلی کی چنگاریاں بھی روشن ہیں۔ یہ چھوٹا آدمی اپنی طاقت اور شعور کے ساتھ حالات کو بدلنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ اس نظم میں نڈا فاضلی نے بتایا ہے کہ اس دنیا کی سختیوں کو برداشت کرتا ہوا اور تجربات کی بھٹی سے گزرتا ہوا عام آدمی ہی اس دنیا کا حقیقی کردار ہے جب کہ اس کے مسائل و مصائب کا استحصال کر کے مذہب اور سیاست کی دنیا نے اپنی چمک دمک بنا رکھی ہے۔ اس عام آدمی کی دائمی کشمکش اور جدوجہد ہی زندگی کے کارواں کو آگے بڑھا رہی ہے۔ وارث علوی نے اس نظم پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے:

”چھوٹا آدمی یا عام آدمی شعروادب کا موضوع ہے۔ سیاسی شطرنج کا مہرہ ہے۔ مذاہب کا ادنیٰ شکار ہے اور تاریخ میں ہمیشہ ستایا ہوا، کچلا ہوا اور

دکھوں کا انبار بے پایاں رہا ہے۔ اقبال کے یہاں عظمتِ انسانی کے
نغمے اور فوق الانسان کے فلسفے ہیں۔ ترقی پسندوں نے عوام کی طاقت
کے گیت گائے ہیں۔ فیض اور دوسرے شعرا نے ”ہم لوگ“ کے
عنوانات سے بعض اچھی نظمیں لکھی ہیں لیکن ”چھوٹے آدمی“ کو کسی
شاعر نے اس طرح نہیں دیکھا جیسا کہ ندانے دیکھا ہے۔“ 17

ندا فاضلی نے اپنی دو نظموں ”آخری سچ“ اور ”اپنا دائرہ“ میں عام آدمی کے چھوٹے چھوٹے کاموں
کی عظمت کو سراہا ہے۔ کسی کا ہل چلانا، کسی کا پانی بھر کر لانا، کسی کا جھاڑو لے کر صفائی کرنا، کسی گملے میں پھول
کھلانے اور کسی حد تک گندگی دور کرنے میں اس کا اہم رول رہا ہے۔ گو کہ کچھ لوگ کالے کرتوت کرتے رہتے
ہیں لیکن اس دنیا کو سازگار بنائے رکھنے کا وہی آدمی ضامن ہے جو کسی بچے کی پھنسی ہوئی تیلی چھڑا دے یا جب
اندھیرا ہو تو شمع جلائے۔ ان کی نظم ”ناراض آدمی“ ان کی تخلیقی شخصیت کی شناخت میں جس طرح معاون
ثابت ہوئی ہے، اسی طرح دورِ حاضر کے ہر حساس انسان کی بے بسی، محرومی، انتشار اور جستجو کا خوب صورت
استعارہ بھی ہے۔ نظم ”کوئی اکیلا کہاں ہے“ میں انھوں نے تنہائی کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں
میں تنہائی کا گہرا احساس پایا جاتا ہے۔ آج کے دور میں تنہائی انسان کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ انھوں نے اس نظم
میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اکیلا پن آدمی کی فرصت کا فلسفہ ہے۔ ہر آدمی سماجی، نفسیاتی اور مابعد الطبیعیاتی
سطح پر اکیلے پن کے احساس کا کم یا زیادہ شکار ہے۔ وارث علوی کے مطابق تنہائی ایک احساس ہے جس کا
کوئی مداوا نہیں۔ چاہے وہ ہرے بھرے شہر میں رہتا ہو یا بھرے پرے خاندان میں۔ یہ بالکل وہی احساس
ہے جو سب کچھ پا کر بھی کسی چیز کی کمی کو محسوس کرتا ہے۔

ندا فاضلی کی شاعری میں لفظ ”گھر“ بار بار در آیا ہے۔ اپنوں سے بچھڑنے کا غم اور کھوئے ہوئے گھر
کی تلاش ان کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔ ان کے یہاں گھر صرف چار دیواری اور چھت کا ہی نام نہیں
ہے بلکہ یہ ایک ذہنی کیفیت ہے جس میں سکون اور تحفظ کا احساس ہے۔ ان کے یہاں گھر کی نوعیت دوسرے
شاعروں سے بالکل مختلف ہے۔ ”نئے گھر کی پہلی نظم“، ”دور کا ستارہ“، ”گھر کا منظر“، ”لگاؤ“، ”اپنا گھر“ اور
”میرا گھر“ جیسی تخلیقات میں انھوں نے اپنے گھر اور گھر سے دوری کو موضوع بنایا ہے۔ گھر سے بے گھر
ہو جانا، گھر کی تلاش میں سرگرداں رہنا اور جس گھر کو اپنا گھر سمجھنا اس میں ایک اجنبی کی طرح رہنا، غرض نئے
نئے طریقوں سے لفظ گھر ان کی شاعری میں آیا ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم ”دور کا ستارہ“ ملاحظہ ہو:

میں برسوں بعد / اپنے گھر کو تلاش کرتا ہوا / اپنے گھر پہنچا
 لیکن میرے گھر میں / اب میرا گھر کہیں نہیں تھا
 اب میرے بھائی اجنبی عورتوں کے شوہر بن چکے تھے
 میرے گھر میں / اب میری بہنیں
 انجانے مردوں کے ساتھ مجھ سے ملنے آتی تھیں
 اپنے اپنے دائروں میں تقسیم / میرے بھائی بہن کا پیار
 اب صرف تحفوں کا لین دین بن چکا تھا
 اب میرے گھر میں / وہ نہیں تھے
 جو بہت سوں میں بٹ کر بھی / پورے کے پورے میرے تھے
 جنہیں میری ہر کھوئی چیز کا پتا یاد تھا
 مجھے کافی دیر ہو گئی تھی / دیر ہو جانے پر ہر کھویا ہوا گھر
 آسمان کا ستارہ بن جاتا ہے

جو دور سے بلاتا ہے / لیکن پاس نہیں آتا ہے

اس نظم میں ندا فاضلی نے اپنے مشاہدات و تجربات بیان کیے ہیں کہ کس طرح وہ اپنے ہی گھر میں
 اجنبیت کے درد و کرب سے دوچار تھے۔ ان کو کھوئے ہوئے گھر کی تلاش آخری عمر تک رہی۔ گھر کا چھن جانا،
 ماں باپ سے پکھڑ جانا، بہن بھائیوں سے دوری اختیار کرنا ایسے مسائل ہیں جن سے وہ زندگی بھر وابستہ
 رہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری میں شہر کی تباہی، تہذیبی اقدار کی پامالی، سیاسی و سماجی مسائل، بے چینی،
 تنہائی، رشتوں کی تبدیلی، تلاشِ ذات وغیرہ جیسے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں محبت کی
 رنگینیاں، روزمرہ کی جھلکیاں، اپنوں کی نظر اندازیاں، ماں کی ممتا، باپ کی شفقت، بچے کی مسکراہٹ، بہن کا
 پیار، گاؤں کی تہذیب، چڑیوں کی چہک، کچے آموں کی مہک وغیرہ آپس میں مل جل کر غزل، نظم، گیت اور
 دوہوں کے حوالے سے زندگی کے تمام ذائقوں سے آشنا کرتی ہے۔

اسلوب و زبان:

نَدافاضلی نے اپنی نظموں میں خیال و احساس کو جس نزاکت سے پیش کیا ہے وہ اپنے آپ میں منفرد ہے۔ ان کی نظموں میں احساس کی لطافت اور فکر کی گہرائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے اظہار کا اسلوب قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اسلوب سے مراد وہ طرزِ تحریر ہے جو فن کار اپنی تخلیق میں اپنے جذبات و احساسات کو پیش کرنے کے لیے اپناتا ہے۔ اسلوب وہ قوتِ اظہار ہے جس میں صدیوں کی تہذیب بولتی ہوئی نظر آتی ہے۔ نَدافاضلی اپنے منفرد طرزِ اظہار کے متنوع اسالیب کے ساتھ اردو نظم نگاری میں متحرک و فعال نظر آتے ہیں۔ انھوں نے سادہ اسلوب، ندرتِ خیال اور سچے جذبات و احساسات کی بدولت اپنی نظموں کا دامن تاب دار موتیوں سے بھر دیا۔ جذبات کی شدت اور اظہار کی سادگی ان کی شاعری کے بنیادی عناصر ہیں۔

نَدافاضلی کی شاعری میں پیچیدہ الفاظ کم ہی نظر آتے ہیں۔ وہ سادہ اور سلیس الفاظ کو اپنی شاعری کا ذریعہ اظہار بناتے ہیں۔ جو بھی موضوعات ان کے مشاہدے میں آتے ہیں۔ انھیں نظم میں ڈھالنے کے لیے وہ الفاظ کی تلاش نہیں کرتے بلکہ وہ انھیں ان الفاظ کا پیکر عطا کرتے ہیں جن کا سیدھا رشتہ عوام سے ہوتا ہے۔ ان کی نظموں میں سادگی و سلاست کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یہی سادگی و سلاست ان کی شاعری کو پُر اثر اور بامعنی بناتی ہے۔ ان کی زیادہ تر نظمیں راست اسلوب میں ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں بیانیہ، کہانی کا عنصر، واقعات، کردار، بذلہ سنجی، نقطہ آفرینی، طنز، قولِ محال، علامتوں اور شعری پیکروں سے خوب کام لیا ہے۔ کبھی کبھی ان کی نظموں میں سامنے کی بات، سامنے کی بات ہی رہتی ہے، لیکن ان کی کامیاب نظموں میں حیرت اور چونکا دینے والی بات سے نظم منفرد حسن کی حامل بن جاتی ہے۔ وارثِ علوی نے انھیں صاف ستھرے اسلوب کا شاعر کہا ہے۔ جس نظم کے عنوان سے نَدافاضلی کے دوسرے شعری مجموعے (مورناچ) کا نام مستعار ہے، وہ سراسر علامتی و استعاراتی طرزِ اظہار کی وجہ سے خاصی الجھی ہوئی نظم ہے۔ یہ پیرایہ اظہار اس لیے چونکا نے والا ہے کہ ان کا اسلوب بالراست، علامتی اور استعاراتی ہونے کے باوجود کبھی گنجلک یا مبہم نہیں رہا۔ یہ نظم ان کی دوسری نظموں سے اس لیے مختلف ہے کہ ”مورناچ“ کسی بھی احساس، جذبے یا شے کا استعارہ ہو سکتا ہے۔ یعنی اسے پڑھنے کے بعد مختلف قارئین اس کے مختلف مفاہیم نکال سکتے ہیں۔ ایک کھرا شاعر استعاراتی اسلوب درحقیقت فکری اور جذباتی پیچیدگیوں کے سبب لاشعوری طور پر استعمال کرنے لگتا

ہے۔ اس طرح انفرادی احساس زمان و مکان کی حدود سے آزاد ہو کر ہمہ گیر اقدار کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ لیکن اسلوبی اور موضوعاتی پیچیدگیوں کے سبب ترسیل کے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں اور تخلیقات کسی حد تک مبہم ہو جاتی ہیں۔ نظم ”مورناچ“ ملاحظہ کریں:

دیکھتے دیکھتے / اس کے چاروں طرف

سات رنگوں کا ریشم بکھرنے لگا

دھیمے دھیمے کئی کھڑکیاں سی کھلیں

پھڑپھڑاتی ہوئی فاختائیں اڑیں

بدلیاں چھا گئیں / بجلیوں کی لکیریں چمکنے لگیں

سماری بنجر زمینیں ہری ہو گئیں / ناچتے ناچتے

مور کی آنکھ سے / پہلا آنسو گرا

خوب صورت سجیلے پروں کی دھنک

ٹوٹ کر ٹکڑا ٹکڑا بکھرنے لگی

پھر فضاؤں سے جنگل برسنے لگا / دیکھتے دیکھتے

سات رنگوں کا ریشم، بجلیاں، بنجر زمینوں کا ہرا ہونا، جنگل وغیرہ ایسی فضا بندی کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں جو مورناچ سے مناسبت رکھتی ہو۔ اس کے علاوہ نظم کا آہنگ بھی بہت دل کش ہے۔ یہ دونوں حقائق بجائے خود نظم کی تخلیق کا جواز ہیں۔ تاہم مشکل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم مورناچ کے لغوی معنوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے علامتی یا استعاراتی پہلو پر غور کرنے لگتے ہیں۔ نداء فاضلی کا شعری اسلوب اس نظم میں ان کی دوسری نظموں کے مقابلے میں زیادہ علامتی اور پیچیدہ ہے۔ ان کے یہاں اسلوب شعر اندرونی تخلیقی اُتچ اور موضوع کے مطابق تشکیل پاتا ہے۔ ان کے اسلوب پر وارث علوی اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

”نداء کے یہاں اسالیب کی رنگارنگی ہے۔ ایک اسلوب تو ”ماں“ کا

ہے۔ جسے ہم کسی مانوس مروج یا بہتر اصطلاح یا صنفِ شاعری کی عدم

موجودگی میں تشبیہی تشخص کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا اسلوب اشعار کو انسانی

تشخص عطا کرنے کا ہے۔ جس کی نمائندہ مثال نداء کی نظم ”دو کھڑکیاں

نَدَافِضلی کی نظموں کا اسلوب سادہ، نادر، دل کش اور سہل ہے۔ جسے سمجھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوتی ہے۔ اسلوب کی یہ سادگی ان کے ہم عصر شعرا شہر یار، زبیر رضوی، باقر مہدی، مخمور سعیدی اور مظہر امام وغیرہ کے یہاں نہیں ملتی۔ ان شعرا نے اپنی بات کہنے کے لیے بھاری بھر کم الفاظ کے ساتھ مشکل تراکیب، استعارات اور تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ نَدَافِضلی کے یہاں اختصار پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں کی طرح بات کو پھیلانے سے اجتناب کیا ہے۔

نَدَافِضلی کو اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ایک اہم مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ انھوں نے اردو اور ہندی کے سادہ الفاظ کو ایک ہی مالا میں پرو کر نظم میں دل کشی اور جاذبیت پیدا کی ہے۔ ان کی نظمیں طرزِ احساس، ہیئت و تکنیک، اسلوب اور رنگ و آہنگ کے اعتبار سے بہت اہم تصور کی جاتی ہیں۔ ان کی زبان صاف، شیریں اور سادہ ہے۔ نَدَافِضلی نے اپنے جذبات و احساسات قاری تک پہنچانے کے لیے سادہ اور آسان زبان کو بروئے کار لایا ہے۔ انھوں نے آسان لفظیات اور آہنگ کی دل کشی سے نظموں کو جو فضا بخشی ہے، وہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ایسی لفظیات کو برتا ہے جس کا استعمال ہم روزمرہ کی زندگی میں کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب کسی سے مستعار نہیں ہے بلکہ انھوں نے خود اس کی اختراع کی ہے۔ ان کے نزدیک زبان دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک اعلیٰ طبقے کی زبان جو کرسی پر بیٹھ کر لکھی اور بولی جاتی ہے۔ دوسری زبان عام بول چال کی زبان ہوتی ہے جسے مزدور یا عام انسان بول چال کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ نَدَافِضلی نے عام آدمی کی زبان کو اپنی شاعری کے لیے منتخب کیا ہے۔

لب و لہجہ:

نَدَافِضلی کی شاعری جدید شاعری کے عام چہرے کی طرح ہر دم رونے بسورنے کی قائل نہیں ہے۔ وہ زندگی کے درد و کرب کو زندگی کا مقدر نہیں سمجھتے ہیں۔ شاعر کبھی ذات کو کائنات کے پیرائے میں بیان کرتا ہے اور کبھی کائنات کو ذات کے پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ شاعری میں ربط و تسلسل کا ہونا ایک غیر فطری عمل ہے۔ لہجہ اور اسلوب جس کا دار و مدار زبان و بیان پر ہے، ایک ارتقائی سفر طے کر کے مستحکم ہو جاتا ہے۔ یہی شاعر کی اصل پہچان ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایک شاعر نَدَافِضلی ہیں جنھوں نے اپنے مخصوص اسلوب، زبان اور لب و لہجے سے ایک منفرد شناخت قائم کی۔

نڈافاضلی نے قدیم روایت کی پاسداری کی ہے اور اپنے لب و لہجے، اسلوب اور زبان و بیان کے ساتھ ساتھ جدید شاعری کے تقاضوں کو بھی خوب نبھایا ہے۔ وہ منٹو کے افسانہ ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“ کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس افسانے سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنی ایک مختصر سی نظم ”منٹو کا پاگل خانہ“ کہی تھی۔ نظم ملاحظہ کریں:

تم	نے	مارا	ایک	ہمارا
ہم	نے	مارا	ایک	تمہارا
جیل	کے	اندر	جیل	کے
وہ	ہی	موسم	وہ	ہی
منٹو	کے	پاگل	خانے	سے
نکلا	نہیں	ابھی	بھڑا	

بھڑارے کے سبب پاگلوں کا تبادلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کیا جاتا تھا۔ تبادلے کے دوران ٹوبہ ٹیک سنگھ آدھا ہندستان اور آدھا پاکستان میں تھا۔ اس کشمکش میں پاگلوں کا باشعور لوگوں کی بہ نسبت مثبت باتیں کرنا سیاست دانوں پر ایک طمانچہ ہے۔ نڈافاضلی نے اس نظم میں وہی کہانی پیش کی ہے جو منٹو نے اپنے افسانے میں بیان کی تھی۔

نڈافاضلی کا لب و لہجہ تازہ، متحرک اور نیا ہے۔ اردو اور ہندی زبانوں کے امتزاج نے ان کے لب و لہجے کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ ان کے بیانیے میں خود پسندی، مبالغہ اور بلند آہنگی کا کوئی گز نہیں ہے۔ عام طور پر وہ اپنی بات دھیمے لہجے میں آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ اکثر اپنے خیالات کی ندرت سے چونکا دینے والی فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی شاعری کا ایک دل کش وصف لفظوں کا تجسیمی اظہار رہا ہے۔ ان کی اس نوع کی نظمیں ان کے ہر شعری مجموعے میں موجود ہیں۔ انھوں نے اپنے پہلے شعری مجموعے ہی سے اپنے بیانیے کی دیسی بوباس اور لب و لہجے کی انفرادیت کے باعث ادب شناسوں کی توجہ حاصل کر لی تھی۔ نڈافاضلی کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ انھوں نے کرتب بازیوں میں الجھے بغیر اپنا لہجہ پالیا۔ وہ اپنے موضوع اور لہجے کو ہم آہنگ کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ اپنے انداز، اسلوب اور لہجے سے جدید شاعری کی بھیڑ میں اپنا الگ مقام رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر زیبا محمود اپنے مضمون ”نڈافاضلی کا شعری اظہار“ میں لکھتی ہیں:

”نڈافاضلی۔۔۔ اپنی مخصوص فکر، اپنے مخصوص اسلوب، اپنی مخصوص

زبان کی بنیاد پر اہم مقام و مرتبہ کے حامل ہیں۔ نئی شاعری یا جدید شاعری کی تاریخِ نَدَافِ ضلیٰ کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔“ 19

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نَدَافِ ضلیٰ کا شمار موجودہ دور کے صفِ اول کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری عوامی عناصر، غنائیت اور انسان دوست رویے کی وجہ سے خاص و عام میں اپنا لوہا منوانے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ ان کی نظموں میں نہ تو فرسودگی ملتی ہے اور نہ ہی کسی طرح کا کوئی ابہام بلکہ ان کی شاعری کا خمیر اپنے سماج اور معاشرے سے اٹھا ہے۔ ان کے اظہار کا اسلوب قاری کو مسرور و محصور کرتا ہے۔ وہ غیر مانوس الفاظ سے اجتناب کرتے ہیں اور سادہ و آسان الفاظ کا استعمال کر کے اپنی شاعری کو دل کش اور پُر اثر بناتے ہیں۔ تنگ نظری اور فرقہ واریت کو وہ پسند نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ اس سے کوسوں دور نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری ایکتا، رواداری، بھائی چارہ اور یکجہتی کا پیغام دیتی ہے۔ نَدَافِ ضلیٰ اور ان کے معاصرین اپنے عہد کے تجربوں میں شریک رہے، ایک جیسے مسائل سے دوچار رہے، لیکن نَدَافِ ضلیٰ نے اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنی ایک الگ دنیا بنائی۔ جہاں کسی اور کا حکم نہیں چلتا۔ انھوں نے نثر و نظم میں جس خوبی اور مہارت سے کام لیا ہے، اس سے ان کے معاصرین عام طور پر محروم نظر آتے ہیں۔

حواشی:

- 1۔ ہماری شاعری، مسعود حسن رضوی ادیب، ص: 20
- 2۔ تنقیدی افکار، شمس الرحمن فاروقی، ص: 177
- 3۔ دیواروں کے بچ، ندافاضلی، ص: 96
- 4۔ جدید شاعری کا معتبر نام: ندافاضلی، وارث علوی، مشمولہ اعتراف، ص: 56/57
- 5۔ ندافاضلی کسی اسلوب کے اسیر نہیں، نئی زمین تلاشنے میں کامیاب، شاہ نواز قریشی، مشمولہ نیادور، ص: 52
- 6۔ جدید شاعری کا معتبر نام: ندافاضلی، وارث علوی، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 67
- 7۔ شہر سے گاؤں تک دھندلائے ہوئے منظر، خورشید سمیع، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 157
- 8۔ بحوالہ ندافاضلی کا تخلیقی سفر، سیفی سرونجی، ص: 66
- 9۔ ندافاضلی: اپنے لہجے کی دریافت، بشر نواز، مشمولہ اعتراف، ص: 85
- 10۔ ندافاضلی کی شعریات، پروفیسر علیم اللہ حالی، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 130
- 11۔ ندافاضلی: اپنے لہجے کی دریافت، بشر نواز، مشمولہ اعتراف، ص: 87/88
- 12۔ بحوالہ ندافاضلی کا تخلیقی سفر، سیفی سرونجی، ص: 14
- 13۔ ندافاضلی کی شاعری میں شہر، انور خان، مشمولہ اعتراف، ص: 97
- 14۔ جدید شاعری کا معتبر نام: ندافاضلی، وارث علوی، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 53
- 15۔ بحوالہ ندافاضلی: حیات و جہات، محمد یوسف رضا، ص: 151
- 16۔ ندافاضلی: اپنے لہجے کی دریافت، بشر نواز، ص: 82
- 17۔ جدید شاعری کا معتبر نام: ندافاضلی، وارث علوی، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 62
- 18۔ ایضاً، ص: 56
- 19۔ ندافاضلی کا شعری اظہار، ڈاکٹر زیبا محمود، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 164

﴿اُردو دوہے کی روایت﴾

دوہا ایک لوک صنفِ شاعری ہے۔ یہ قدیم ہندی (اپ بھرنش) زبان کی مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔ دوہا ہندوستانی فنونِ لطیفہ کی ایک کلاسیکی روایت ہے۔ یہ ہندوستان کی کئی زبانوں میں مروج ہے۔ بعض علمائے ادب کے نزدیک اس کا آغاز پراکرتوں سے ہوا ہے۔ جب کہ بعض دانشوروں کے مطابق دوہا سنسکرت زبان کے لفظ ”دو گدھک“ سے بنا ہے۔ اس کو کئی ناموں جیسے دوہرا، دوپد، دوہی، دُہا اور دوہا وغیرہ سے پکارا گیا لیکن یہ اب صرف ”دوہا“ نام سے ہی اپنی شناخت رکھتا ہے۔ فراز حامدی نے اپنے ایک شعر میں دوہے کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے:

تیرہ گیارہ ماترا بیچ بیچ و شرام
دو مصرعوں کی شاعری دوہا جس کا نام

دوہے کا وزن ”فعلن فعلن فاعلن (و شرام) فعلن فعلن فاع“ پر مشتمل ہوتا ہے۔ دوہے کے اس بنیادی بحر و وزن میں ذرا سا تغیر و تبدل اور اس کے عروضی تار و پود میں ذرا سی چھیڑ چھاڑ اس کے آہنگ کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ ماتراؤں کی پابندی، وقفے کی موجودگی اور متعینہ بحر و وزن کے استعمال سے جو نغمگی اور موسیقیت ابھرتی ہے وہی دوہے کی جان اور اصل شناخت ہے۔ دوہے کے دونوں مصرعے معنوی اعتبار سے مکمل ہوتے ہیں۔

دوہا ہندی شاعری کی ایک صنف ہے جو اردو میں بھی ایک شعری روایت کے طور پر مستحکم ہو چکی ہے۔ دوہا دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے دو مصرعوں میں 48 ماترائیں ہوتی ہیں۔ ایک مصرعے میں دو حصے ہوتے ہیں، پہلے حصے میں 13 جب کہ دوسرے میں 11 ماترائیں ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر شاہ نواز عالم اپنے مضمون ”ندا فاضلی بحیثیت دوہا نگار“ میں دوہے کی ہیئت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”بہ اعتبار ہیئت دوہا دو مصرعوں کی ہندی نظم ہے جس میں چار حصے ہوتے ہیں جسے ہندی میں ”چرن“ کہتے ہیں۔ کل ملا کر 48 ماترائیں ہوتی ہیں۔ ایک مصرعے میں دو حصے ایک تیرہ ماترا والی اور دوسری گیارہ ماترا والی۔ اس کے ہر مصرعے کو دو چرنوں (حصوں) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلے حصے میں 3+4+6 اور دوسرے حصے میں 1+4+6 ماترائیں ہوتی ہیں۔ وقفے سے پہلے کا حصہ ”و شم چرن“ اور بعد کا حصہ ”سم چرن“ کہلاتا ہے۔ و شم چرن میں 13 اور سم چرن میں 11 ماترائیں ہوتی

ہیں۔ گنوں کے اعتبار سے سم چرن ہمیشہ شگن یا رگن پر ختم ہوتا ہے اور
و شم چرن جگن یا گن پر۔ دونوں چرنوں کے درمیان و شرام یا وقفے کا لحاظ
لسانی سطح پر تو رکھا جاتا ہی ہے معنوی سطح پر ہو تو سونے پر سہاگہ۔ اگر کوئی
ایسا لفظ یا ترکیب استعمال ہو جس کا ایک حصہ کٹ کر ”و شم چرن“ میں رہ
جائے تو یہ دو ہے کا بڑا عیب ہے اور اسے بقی بھنگ یا شکست ناروا کہتے
ہیں۔ اس لیے ہر حصے کے درمیان و شرام یا عرضی وقفہ لازمی ہے۔“ 1

دو ہے کو بنیادی طور پر عرضی صنفِ سخن تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں بڑی مہارتیں درکار ہوتی ہیں۔
ماہرین دوہانے اس کے لیے بنیادی آہنگ ”دوہا چھند“ موزوں قرار دیا ہے۔ اسی وزن میں بیش تر کلاسیکی
دو ہے کہے گئے ہیں۔ اس چھند کے مطابق دوہا چار حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے اور تیسرے حصے میں تیرہ
تیرہ ماترائیں ہوتی ہیں جب کہ دوسرے اور چوتھے حصے میں گیارہ گیارہ ماترائیں ہوتی ہیں۔ ہندی کے اس
عرضی نظام کو ”پنگل“ کہا جاتا ہے۔

دو ہے کی خارجی ہیئت غزل کے مطلع کی سی ہوتی ہے۔ دوہا غزل کے شعر کی طرح معنوی اعتبار سے
مکمل ہوتا ہے۔ اگرچہ اس میں ردیف کی قید نہیں ہوتی مگر قافیے کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ دو ہے میں کسی
بھی مضمون یا خیال کو چند الفاظ میں قلم بند کیا جاسکتا ہے۔ دو ہے کے مضامین میں بھگتی، توحید، اخلاق، تصوف
اور پسند و نصائح کے علاوہ دیگر عصری موضوعات کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کے علاوہ دو ہے میں
ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

دو ہے کا آغاز ساتویں صدی اور آٹھویں صدی کا زمانہ بتایا جاتا ہے۔ ”سرہ پا“ کو دو ہے کا موجد قرار
دیا جاتا ہے۔ ”دوہا گوش“ ان کی مشہور تصنیف ہے۔ چندر بردائی کی کتاب ”پرتھوی راج راسو“ میں دو ہے کو
ایک صنف کی حیثیت سے پورے اہتمام کے ساتھ برتا گیا ہے۔ ڈاکٹر شاہ نواز عالم اپنے مضمون ”ندا فاضلی
بحیثیت دوہانگار“ میں لکھتے ہیں:

”دو ہے کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ سرہ پا (کذا) (815-770) کو
دو ہے کا موجد مانا جاتا ہے۔ ان کی مشہور و معروف تصنیف ”دوہا گوش“
ہے۔ لیکن دوہا ایک صنف کی حیثیت سے پورے اہتمام کے ساتھ چندر
بردائی کی کتاب ”پرتھوی راج راسو“ میں برتا گیا۔ چندر بردائی پرتھوی راج

کا درباری شاعر تھا۔ اس نے اپنی کتاب گیارہویں صدی میں لکھی۔ اس میں انھوں نے راج کمار کی شجہ گتا اور پرتھوی راج کی محبت، فراق و وصال سے متعلق احوال دوہا چھند میں لکھا۔ اس کے زیادہ تر دوہے رومانیت سے لبریز ہیں۔ دوہے کے عروض پر پہلی دستاویزی کتاب ”کرت مخری“ مانی جاتی ہے جس کے مصنف ”رام رن“ ہیں۔“ 2

ہندی دوہا نگاری میں کبیر، تلتسی داس، سور داس اور عبدالرحیم خانِ خاناناں وغیرہ بہت اہم ہیں۔ دکنی شعرا کے کلام میں بھی دوہے کی مثالیں ملتی ہیں۔ بارہویں صدی میں مسلمان صوفیوں نے دوہا نگاری میں دل چسپی دکھائی۔ ان صوفیائے کرام نے اپنی بات عوام تک پہنچانے کے لیے شاعری کا سہارا لیا۔ انھوں نے دوہے میں عربی فارسی زبان کی آمیزش کی اور اس صنف کو عوام الناس میں مقبول اور ہر دل عزیز بنایا۔ اس کے بعد لمبے عرصے تک اردو ادب کی تاریخ دوہے کی روایت سے خالی نظر آتی ہے لیکن اب اس کا چلن پھر سے بڑھ رہا ہے۔ دوہے میں غنائیت ہوتی ہے اور یہی اس کی مقبولیت کا باعث بنتی ہے۔ امیر خسرو، کبیر، تلتسی داس اور عبدالرحیم خانِ خاناناں وغیرہ کے دوہے آج بھی قاری کو متاثر کرتے ہیں۔

اردو ادب کے ابتدائی دور میں صوفی شعرا نے دوہے کو بہت ترقی دی۔ صوفی، سنتوں اور دیگر رہنمائے قوم نے اپنے گیان اور پند و نصائح کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے دوہوں کا سہارا لیا۔ اس حوالے سے شیخ فرید الدین گنج شکر (1173-1265)، شیخ حمید الدین سوالی ناگوری (1193-1274)، شیخ شرف الدین بوعلی قلندر (1208-1324) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس ضمن میں ان کا ایک دوہا بطور مثال پیش کیا جاتا ہے:

کاگا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو، پیا ملن کی آس
(بابا فرید گنج شکر)

جو بسترے تو بے سکت، سنکوچے تو سوئے
ایک پُرکھ کے نام دس، برلا جانے کوئے
(سوالی ناگوری)

بجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے

بدھنا ایسی رین کر، بھور کبھو نہ ہوئے

(بوعلی قلندر)

اردو میں دوہانگاری کا آغاز ابوالحسن یحییٰ الدین امیر خسرو (1253-1325) کے دوہوں سے ہوتا ہے۔ ان کا شمار فارسی زبان کے جید علما میں کیا جاتا ہے۔ امیر خسرو کے بہت سارے دوہے ایسے ہیں جو آج بھی زبان زد خاص و عام ہیں۔ انھوں نے اپنے دوہوں کو ہندوستانی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی اور ان کی زبان بھی اس وقت کے عین مطابق تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دوہے سینہ بہ سینہ لوگوں تک پہنچے ہیں۔ ملا وجہی نے امیر خسرو کا ایک دوہا ”سب رس“ میں نقل کیا ہے۔

پنکھا ہو کر میں ڈلی، ساقی تیرا چاؤ

منجھ جلتی جنم گیا، تیرے لیکھن باؤ

اسی طرح امیر خسرو کا یہ دوہا حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر درج ہے۔

گوری سووے سیج پر، مکھ پر ڈارے کیس

چل خسرو گھر اپنے، سانجھ بھی چودلیں

امیر خسرو کا ایک اور دوہا یہاں پیش کیا جا رہا ہے جو عوام و خواص میں مشہور ہوا۔ نذا فاضلی مشاعروں میں اکثر اس دوہے کو دہراتے تھے۔

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ

تن میرا من پیو کا، دوؤ بھئے اک رنگ

امیر خسرو کے بعد جن شعرا کے نام اس ضمن میں اہم ہیں ان میں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (1263-1381)، بھگت کبیر (1470-1588)، میراں جی شمس العشاق (1516-1586) وغیرہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بھگت کبیر کو مذکورہ بالا دوہانگاروں میں کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے عقیدت مند بہت سارے لوگ تھے جن کو ”کبیر پنہتی“ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ کبیر ہندو مسلم دونوں طبقوں میں یکساں مشہور تھے۔ ان کی شاعری کو دونوں جانب کے لوگوں نے اپنے اپنے انداز سے محفوظ بھی کیا ہے۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں ہندو مسلم اتحاد کو بیان کیا ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہی گنگا جمنی تہذیب کے حامی رہے ہیں۔ ان کا فلسفہ ہندو مسلم نظریات و روایات تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ ان کا کینوس بہت وسیع تھا جس کی وجہ سے دونوں جانب کے لوگ ان کا تعلق اپنے مذہب سے جوڑتے ہیں۔ حالاں کہ ان کا فلسفہ تعلیم

انسانیت، ایثار و قربانی، پیار، خلوص، سچائی اور آپسی بھائی چارے کے گرد گھومتا ہے۔ یہی ان کا مذہب بھی تھا جس کا پرچار وہ ساری عمر کرتے رہے اور اسی پر عمل پیرا رہے۔ اس ضمن میں ان کے چند ایک دوہے پیش خدمت ہیں:

نہائے دھوئے کیا بھیا جو من میل نہ جائے
مین سدا جل میں رہے، دھوئے باس نہ جائے

میرا مجھ میں کچھ نہیں، جو کچھ ہے سب تیرا
تیرا تجھ کو سونپتا، کیا لاگے ہے میرا

(کبیر)

میراں جی شمس العشاق کو اردو کا پہلا باقاعدہ دوہا نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی تخلیقات خوش نامہ، خوش نغز اور مغز مرغوب میں کثرت سے دوہے ملتے ہیں۔ ”خوش نامہ“ ایک سوسترا شعار پر مشتمل ہے جس میں ”خوش“ نامی ایک نیک سیرت لڑکی کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ ”خوش نغز“ میں کل بہتر (72) دوہے موجود ہیں۔ ”مغز مرغوب“ میں 23 دوہے شامل ہیں۔ میراں جی شمس العشاق کے چند ایک دوہے ملاحظہ فرمائیں:

اللہ، محمد، علی، امام، دائم ان سوں حال
سب خاصوں سوں اللہ اللہ تو رکھوں کیا کمال

نگری نگری پھرا مسافر، گھر کا رستا بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا، اپنا پرایا بھول گیا

(میراں جی شمس العشاق)

میراں جی شمس العشاق نے پہلی بار ہندی کے قدیم مرجعہ دوہے سے الگ ہٹ کر اردو دوہوں کی بنیاد ڈالی جس کی تقلید ان کے بعد آنے والے شعرا نے کی۔ اس بات کی وضاحت ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی اپنی کتاب ”اردو شاعری میں دوہے کی روایت“ میں یوں کرتے ہیں:

”میراں جی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے پنگل کے ایسے

نئے اوزان کو جو گجراتی، مراٹھی، راجستھانی، پنجابی اور سندھی زبانوں
میں دوہے کی ہیئت میں استعمال کیے جاتے تھے، اردو دوہوں میں پہلی
بار استعمال کیا اور ہندی کے قدیم مروجہ دوہے سے الگ ہٹ کر اردو
دوہوں کی بنیاد ڈالی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متاخرین نے بھی ان کی
تقلید کی۔“ 3

میراں جی شمس العشاق کے بعد جن شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ان میں قاضی محمود
دریائی، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شاہ علی محمد جیوگام دھنی، برہان الدین جاتم، خوب محمد چشتی، عبدالرحیم خان
خانائے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا نے دوہے کو نئے پڑاؤ میں داخل کیا جس سے اس صنف کو مزید تقویت
حاصل ہوئی۔

قاضی محمود دریائی کا شمار گجرات کے برگزیدہ صوفیاء میں ہوتا ہے۔ ان کو گجرات کا ”خواجہ خضر“ کہا جاتا
ہے۔ ان کے دیوان میں ہندی الفاظ کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔
دیکھت نین مرگ میں موئی جھیل ہوئی نسوان
پنکھی پنپتی دیکھت موئی کالی کیتی جان
(قاضی محمود دریائی)

شیخ عبدالقدوس گنگوہی اپنے زمانے کے ایک بزرگ عالم تھے۔ انھیں عربی، فارسی کے علاوہ برج
بھاشا پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ ان کے دوہوں میں برج بھاشا، بندیلی، اودھی، راجستھانی، بھوجپوری
اور پنجابی وغیرہ مقامی بولیوں کے اثرات کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے ان کا ایک دوہا ملاحظہ
فرمائیں:

جیدھر دیکھوں ہے سکھی، دیکھوں اور نہ کوئے
دیکھا بوجھ بچار منہ، سبھی آپس میں سوئے

(عبدالقدوس گنگوہی)

شاہ علی محمد جیوگام دھنی گجرات کے ممتاز صوفی بزرگوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے فارسی کی
چند بحروں کے علاوہ پنگل کے چھندوں جیسے چوپئی، چوپائی اور دوہے کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ اس ضمن
میں ان کا دوہا دیکھیے:

جنہیں پریم نہ چاکھیا سو کیا بوجھے ساؤ
راؤن کپڑا بو لڑی بون اسا نہیں راؤ

(علی محمد جیوگام دھنی)

برہان الدین جاتم میراں جی شمس العشاق کے فرزند تھے۔ وہ اپنے وقت کے بڑے عارف اور صوفی تھے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں دوہے کے اوزان کو کثرت سے استعمال کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کے چند ایک دوہے پیش خدمت ہیں:

جب لگ تن نہیں چھوڑ یا جیو کوں تب لگ ہونا دور
جب لگ نظر نہیں چھوڑی آنکھ کو تب لگ ہونا نور

جب لگ سپنا نہیں چھوڑ یا کان کو یو سب اعضا حال
جب لگ فہم نہیں چھوڑ یا دل کوں بو جھت ہو نرال

(برہان الدین جاتم)

میاں خوب محمد چشتی گجرات کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار وہاں کے درویشوں میں ہوتا ہے۔ ”چھند چھنداں“ ان کا منظوم رسالہ ہے جس میں انھوں نے فارسی عروض کو ہندی عروض میں سمجھانے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے پہلے پنگل کے چھندوں کو موضوع بحث بنایا اور بعد میں فارسی عروض کو سمجھایا ہے۔ ان کے دوہوں میں عربی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال اس خوبی کے ساتھ ہوا ہے کہ دوہے کے وزن اور آہنگ میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

حمد خدا کی خوب کر کہہ صلوٰۃ رسول
پچھیں صنعت شعر کی کہے تو ہوئے قبول

(خوب محمد چشتی)

عبدالرحیم خان خاناناں فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت اور ہندی زبانوں سے بہ خوبی واقف تھے۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں عربی اور فارسی زبان کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ اس سلسلے میں چند ایک دوہے ملاحظہ فرمائیں:

رحمن دھاگا پریم کا، مت توڑو چھٹکائے

ٹوٹے سے پھر نا ملے، ملے گانٹھ پڑ جائے

کہہ رحیم کیسے بنے، ان ہونی ہوئے جائے
ملا رہے اور نہ ملے تا سوں کہا بسائے

(عبدالرحیم خان خاناں)

اس کے بعد جن شعرا نے دوہانگاری میں نام کمایا ان میں مرزا جعفر زہلی، مرزا محمد رفیع سودا، قلندر بخش جرأت، نظیر اکبر آبادی، امانت لکھنوی، بہادر شاہ ظفر، طالب بناری، عظمت اللہ خان وغیرہ سر فہرست ہیں۔

میر جعفر زہلی نے ہجو یہ وطنیہ شاعری کی روایت قائم کی۔ ان کی شاعری میں اس دور کے معاشرتی اور تہذیبی حالات کی واضح تصویر نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہندی پنگل اور دوہا چھندوں کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ ذیل میں ان کے چند ایک دوہے نقل کیے جاتے ہیں:

اہل دنیا جھک جھک بک بک قیل و قال
آو سر چو کی ڈومنی گاوے تال بے تال

جو چاہو سکھ چین تم دگر چلو گھر چھانڑ
جس گھر میں سنپت نہیں تا سوں بھلا بدلیں

(میر جعفر زہلی)

مرزا محمد رفیع سودا نے اردو شاعری کی ہر بہت سی صنف میں طبع آزمائی کی لیکن جو مقام انھیں قصیدے کے میدان میں حاصل ہوا، کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہو سکا۔ مرثیے کی صنف میں بھی انھوں نے جدت سے کام لیا۔ غزل گو شاعر کی حیثیت سے بھی ان کا درجہ بلند ہے۔ انھوں نے دوہے کے اوزان کو بھی اپنی شاعری میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ برتا ہے۔ ان کے دوہوں میں دیسی اور فارسی زبان کے نرم و نازک الفاظ کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے ان کے چند ایک دوہے پیش خدمت ہیں:

دیکھ خفا جس کو ذرا کہتے مجھے رسول
لال کو میرے فاطمہ کیوں تیں کیا ملول

کب سنتے ہیں دوزخی اب یہ آہ و نغان
بھول گئے سب اس گھڑی نانا کا احسان

(سودا)

شاہ قلندر بخش یحییٰ امان جرأت دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے دیوان میں کچھ دوہے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کا ایک دوہا یہاں نقل کیا جاتا ہے:

لگی پہ جب آنسو بہے دل نے دکھ یوں پائے
گھر مفلس کا آہ جوں برکھا میں جل جائے

(جرأت)

نظیر اکبر آبادی کو ”عوامی شاعر“ کہا جاتا ہے۔ ان کا بیشتر کلام عوام کی پسندیدگی سے متعلق ہے۔ انھوں نے نظم نگاری میں منفرد مقام بنایا۔ سودا نے دوہے کے لیے جو راہ اختیار کی نظیر اکبر آبادی بھی اسی راہ پر چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے دوہوں میں برج بھاشا کے الفاظ زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کے چند ایک دوہے پیش خدمت ہیں:

سننے والے بھی رہیں ہنسی خوشی دن رین
اور پڑھیں جو یاد کر ان کو بھی سکھ چین

خوشی رہے دن رات وہ، کبھی نہ ہو دلگیر
پہان اس کے بھی رہیں جس کا نام نظیر

(نظیر اکبر آبادی)

سید آغا حسن امانت لکھنوی کی شہرت ڈرامہ ”اندر سبھا“ کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے شاعری کی ابتدا سلام اور نو حے لکھنے سے کی۔ اندر سبھا میں امانت لکھنوی نے غزلوں اور ٹھمریوں کے علاوہ دوہوں سے بھی کام لیا ہے۔ امانت لکھنوی کے دوہوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ہمیں کھڑی بولی یعنی اردو کا نکھرا ہوا روپ نظر آتا ہے۔

راجا ہوں میں قوم کا اندر میرا نام
ہن پریوں کی دید کے نہیں مجھے آرام

محلوں میں رہتا ہوں میں عشق ہے میرا کام
شہزادہ ہوں ہند کا نام مرا گلفام

(امانت لکھنوی)

مرزا ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر مغلیہ خاندان کے آخری تاج دار تھے۔ بہادر شاہ ظفر
نے زیادہ توجہ غزلوں کی طرف دی۔ غزلوں کے علاوہ ان کی ٹھمریاں بھی مشہور و مقبول ہوئیں۔ انھوں نے
اپنے تیسرے دیوان کے آخر میں دوہے کی ہیئت میں کچھ اشعار لکھے ہیں۔ یہ دوہے پنجابی زبان کے اچھے
دوہے کہے جاسکتے ہیں۔

اس دنیا وچ ہم نے دیکھے دکھ پر دکھ دن رین
ایسے دکھ کے گھر وچ تم جو ڈھونڈھو ہو سکھ چین

سب کے من میں کھوٹ ہے اور سب کی کھوٹی چال
کون لگا وے جیا اپنا ان لوگاندی نال

(بہادر شاہ ظفر)

منشی و نائک پرساد طالب بنارسی نے ڈرامہ نگاری میں شہرت پائی۔ انھوں نے شاعری کے میدان
میں بھی قدم جمائے۔ انھوں نے اپنے ڈرامے ”راجا گوپی چند“ میں دوہے بھی لکھے ہیں۔

گورے گورے ہاتھ میں کنگن کی ہے آب
جیوں چندن کی ڈار پہ تازہ پھول گلاب

جس تن کو تو مل مل دھوئے چندن عطر لگائے
ہے ہے اک دن یہ سندر تن مائی میں مل جائے

(طالب بنارسی)

عظمت اللہ خان نے جدید شاعری میں بڑھتے ہوئے عربی و ایرانی اثرات کو نہ صرف کم کرنے کی
کوشش کی بلکہ پنگل کے مترنم چھندوں کے استعمال پر بھی زور دیا۔ انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ اردو عروض کی
بنیاد پنگل پر رکھی جائے۔ اس حوالے سے ان کے چند دوہے درج کیے جاتے ہیں:

تجھ میں لاکھوں خوبیاں کیوں کر کوئی گنائے
مرتے ہیں کس بات پر کیوں کر کوئی بتائے

چال چھیلی مست سی، ایک قیامت ڈھائے
بات سریلے گیت سی، دل کو ناچ نچائے

(عظمت اللہ خان)

اس کے بعد جن شعرا نے دوہا نگاری کو بامِ عروج تک پہنچایا ان میں قتیل شفائی، جمیل الدین
عالی، بیکل اتساہی، کشور ناہید، جمال پانی پتی، پرتو روہیلہ، کرشن مراری، قدرت نقوی وغیرہ کے نام کافی
اہمیت کے حامل ہیں۔ ان شعرا نے دوہے کی صنف کو نئے آہنگ و اسلوب سے آشنا کیا۔

قتیل شفائی نے غزل، نظم اور گیت کے علاوہ دوہے میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ وہ بنیادی طور پر
غنائی مزاج رکھنے والے شاعر ہیں۔ عام طور سے ان کے دوہے اڑتالیس حرفی ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی ان
کے دوہے چھیالیس حرفی بھی ہوتے ہیں۔ ان کے دوہوں کا خاص موضوع زندگی کے حقائق ہیں جن کو وہ
اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتے ہیں۔

کاگا زور سے بولیو، میرے منڈیرے آج
ساس نند کے سامنے، رکھو میری لاج

جہاں نہیں من شانتی، جہاں نہیں تن گیان
گھر ہو یا بن باس ہو، دونوں ایک سمان

(قتیل شفائی)

جمیل الدین عالی بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ان کی نثری خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اُردو دوہا
نگاری میں جمیل الدین عالی کا نام معتبر سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے چار سو سے زیادہ دوہے لکھے ہیں۔ ان کا پہلا
شعری مجموعہ ”غزلیں دوہے گیت“ کے نام سے شائع ہوا۔ غزلوں، دوہوں اور گیتوں کے علاوہ انھوں نے
قومی و ملی تنظیمیں اور ترانے بھی لکھے ہیں جن میں ”جیوے جیوے پاکستان“ بہت مشہور ہوا۔ ان کے دوہوں
میں مضامین کا تنوع پایا جاتا ہے۔ اُردو دوہا نگاری کو استحکام بخشنے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے

جدید اردو شاعری میں دوہوں کی قدیم روایت کو حیاتِ نو بخش کر اس میں تازگی پیدا کی۔ جمیل الدین عالی کو جدید دوہے کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے چند دوہے پیش کیے جاتے ہیں:

عالی اب کے کٹھن پڑا دیوالی کا تہوار
ہم تو گئے تھے چھیلا بن کر بھیا کہہ گئی نار

اُردو والے ہندی والے، دونوں ہنسی اڑائیں
ہم دل والے اپنی بھاشا، کس کس کو سکھلائیں

(جمیل الدین عالی)

بیگل اتساہی نظم، غزل اور گیت کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں عصری حسیت اور جدید رجحانات کے ساتھ ساتھ کلاسیکی روایات کا احترام بھی پایا جاتا ہے۔ ان کے ادبی گیتوں کو بلا تفریق مذہب و ملت عوام کا شرفِ قبولیت حاصل ہے۔ ان کے دوہے اور گیت ہندوستانی فضا کی مہک میں رچے بسے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں اور گیتوں میں دوہے کے وزن اور آہنگ سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اڑتالیس حرفی اور چوٹن حرفی دوہے لکھے ہیں۔ ذیل میں ان کے چند ایک دوہے نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

شبنم سے آتش ملے، ملے سنگ سے خون
دھوپ کھلائے چاند کو، اندھے کا قانون

دو جا ہوتا ہی نہیں جب تم ہوتے پاس
ہجر کو رتبہ دے گیا مومن کا احساس

آنکھوں والے سب کچھ دیکھیں پھر بھی ہیں خاموش
فریادی فریاد کرے اور منصف ہیں بے ہوش

دوہا لکھنے میں چلا، لکھ گیا سرسی چھند
اُردو ادب کے شہر میں رتبہ ہوا بلند

(بیگل اتساہی)

کشورناہید کا شمار پاکستان کی ممتاز شاعرہ میں ہوتا ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعہ ”لب گویا“ میں اڑتیس دوہے موجود ہیں۔ ان کے دوہوں میں صنفِ نازک کے جذبات کا اظہار صداقت اور خلوص کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ذیل میں ان کے چند دوہے نقل کیے جاتے ہیں:

آنکھ کی پتلی سب کچھ دیکھے دیکھے نہ اپنی ذات
اجلا دھاگا میلا ہوئے لگیں جو میلے ہات

بھائی مرے پردیس سدھارے، بہنیں ہوئیں پرانی
کس سے جا کے کہوں کہانی، ساجن ہے ہر جانی

(کشورناہید)

جمال پانی پتی اڑتالیس حرفی دوہے پر زیادہ زور دیتے ہیں لیکن انھوں نے خود 54 حرفی دوہے کہے ہیں۔ ان کے دوہوں میں موضوعات کا تنوع نہیں پایا جاتا۔ انھوں نے زیادہ تر دوہے ایک ہی موضوع یعنی ”سے“ پر لکھے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے چند دوہے پیش کیے جاتے ہیں:

سے کی رچنا، سے کا پھیر اور سے کے سب بہروپ
کیا اندھیارے، کیا اجیالے کیا چھاؤں کیا دھوپ

دیا بجھا پھر جل جائے اور رت بھی پلٹا کھائے
پھر جو ہاتھ سے جائے سے وہ، کبھی نہ لوٹ کے آئے

(جمال پانی پتی)

پرتو روہیلہ کا اصل نام مختار علی خان ہے۔ انھوں نے روایتی دوہے سے انحراف کیا۔ انھوں نے چٹان حرفی اور چھپن حرفی دوہوں کو ہی وسیلہ اظہار بنایا ہے۔ ان کے دوہوں کا اہم موضوع کیفیت ہجر کا بیان ہے۔ اس ضمن میں ان کے چند ایک دوہے ملاحظہ فرمائیں:

میرے کان میں ایسی ساجن تیری آہٹ آئے
سپنوں کی ڈوری بھی مورکھ ہاتھوں سے چھٹ جائے

دور پرے کا دیپک بن کر چمکے اس کا پیار

بچ میں میرے تن کی ندیا کیسے لاکھوں پار

(پرتور و ہیلہ)

کرشن مراری دراصل غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے دوہے بھی لکھے ہیں۔ ان کے دوہوں میں تغزل کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے دوہوں میں زبان کی صفائی، فنی پختگی اور جذبے کا مخلصانہ اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے روایت کی پاس داری کرتے ہوئے اڑتالیس حرفی دوہے کہے ہیں۔ ان کا ایک دوہا نمونے کے طور پر نقل کیا جاتا ہے:

دل جن پر ہوتا رہا، سو دل سے قربان
وقت پڑا تو بن گئے سارے ہی انجان

(کرشن مراری)

قدرت نقوی نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے پچاس حرفی اور باون حرفی دوہے کہے ہیں۔ انھوں نے دوہے کی ہیئت اور اس کے وزن کو اردو شاعری کی مختلف اصناف میں برتنے کا مشورہ دیا۔ اس حوالے سے ان کے چند ایک دوہے پیش خدمت ہیں:

برکت سوز الفت کی دل میرا پر تاب
میں قطرہ قطرہ ٹپکوں دنیا ہو سیراب

طے کر کے فضا اور خلا سیاروں پر پہنچے
انسان دکھیارے کیوں ہیں یہ کوئی نا سوچے

(قدرت نقوی)

ناصر شہزاد، بھگوان داس اعجاز، ظفر گورکھپوری، شاہد میر، فراز حامدی، عابد پیشاوری، مخمور سعیدی اور ندا فاضلی نے اس صنف میں خاصی شہرت و مقبولیت پائی۔ ان شعرا میں ندا فاضلی نے اپنے منفرد اسلوب سے دوہے کی صنف کو رنگ و آہنگ عطا کیا۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں فنی لوازمات کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کے دوہوں کا موضوع روزمرہ زندگی کے عام مسائل ہیں۔ نیز ان کے دوہے مشترکہ تہذیب کی بھرپور عکاسی بھی کرتے ہیں۔

﴿نَدَافِ ضَلٰی کے دو ہے﴾

نہا فاضلی نے اپنی شاعری کا آغاز 1960 کے آس پاس کیا۔ وہ بنیادی طور پر غزل، نظم اور گیت کے شاعر ہیں مگر انھوں نے دوہوں میں بھی اپنے منفرد اسلوب نگارش سے ایک نئی راہ تلاش کی۔ انھوں نے اپنے منفرد انداز بیان کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں ایک الگ پہچان بنائی۔ ان کے دوہے فنی پختگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کے تمام دوہے ماتراؤں کے شماری نظام پر کھرے اترتے ہیں۔ انھوں نے دوہوں میں بھی آسان اور سادہ الفاظ کا انتخاب کیا جس سے ان کے دوہے بوجھل محسوس نہیں ہوتے۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں اپنے مزاج کے اعتبار سے رنگ آمیزی کی ہے۔ یہی رنگ آمیزی کبیر اور سور داس کے یہاں پائی جاتی ہے۔ اس رنگ آمیزی میں انھوں نے اپنی زبان اور لہجے کا خاص خیال رکھا ہے۔

نہا فاضلی کا شمار ہندوستان میں دوہا نگاری کے ارتقا میں دلچسپی رکھنے والے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے دوہے قاری کو زندگی کے اسرار و رموز کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان کے دوہے فن کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ ان کے دوہوں کی بندش نہایت چست ہے۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں روزمرہ زندگی کے عام مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اس ضمن میں ان کا ایک دوہا ملاحظہ کیجیے:

سودا لینے ہاٹ میں، کیسے جائے نار
چاقو لے کے ہاتھ میں، بیٹھا ہے بازار

مذکورہ بالا دوہے میں سودا، ہاٹ، نار، چاقو، بازار جیسے الفاظ روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں۔ ہاٹ اور بازار میں مناسبت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بازار کا دائرہ ہاٹ سے کچھ بڑا ہوتا ہے۔ نہا فاضلی نے اپنے دوہوں میں عام فہم زبان کا سہارا لیا اور عام انسان کے مسائل کو پیش کیا۔ پروفیسر اسرار اللہ انصاری اپنے مضمون میں نہا فاضلی کی دوہا نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”موجودہ دور میں اردو اور ہندی شاعری میں دوہے کا چلن بھی عام ہوا ہے۔ بیشتر شعرا اس صنف میں طبع آزمائی کرنے لگے ہیں۔ نہا فاضلی نے بھی دوہے کہے ہیں اور بہت خوب کہے ہیں۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے دوہے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں یکساں مقبول ہوئے۔ آسان اور عام فہم لفظیات کا سہارا لے کر انھوں نے عام آدمی اور سادہ زندگی جینے والوں کی فکر، مسائل و مصائب، تنہائی، نا آسودگی، محرومی، خواہشات اور جستجوؤں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔“ 4

نَدَافاضلی کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ اپنی بات کو آسان الفاظ کے پیرائے میں پیش کرنا کمال فن کی مثال سمجھی جاتی ہے۔ یہ بات نَدَافاضلی کے دوہوں میں بہ درجہ اتم پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں نہایت شستہ، سلیس، صاف اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دوہے قاری کے دل میں گھر کر جاتے ہیں۔

نَدَافاضلی کے دوہوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کے سات شعری مجموعے ہیں جن میں ”لفظوں کا پل“، ”مورناچ“، ”آنکھ اور خواب کے درمیان“ اور ”کچھ اور“ میں کوئی دوہا درج نہیں ہے۔ ان کے چوتھے شعری مجموعے ”کھویا ہوا سا کچھ“ میں 48 دوہے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے شعری مجموعے ”شہر میرے ساتھ چل“ میں 6 دوہے، ”زندگی کی طرف“ میں 10 دوہے اور ”سب کا ہے ماہتاب“ میں 22 دوہے موجود ہیں۔ اس طرح ان کے دوہوں کی کل تعداد 86 ہے۔

نَدَافاضلی نے اپنے اسلوب اور زبان و بیان سے اردو ہندی کے تفرق کو کافی حد تک کم کیا ہے۔ انھوں نے ہندی شاعروں کا مطالعہ بھی کیا اور ان سے استفادہ بھی کیا۔ اس وجہ سے ان کے دوہوں میں ہندی کے الفاظ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انھوں نے مروجہ اردو کے ساتھ ہندی کے الفاظ کو ملایا جس سے ان کے دوہوں کی تازگی دوبالا ہو گئی ہے۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں ہندی لوک روایت کو بھی پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کے چند ایک دوہے نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

اچھی سنگت بیٹھ کر، سنگی بدلے روپ
جیسے مل کر آم سے، میٹھی ہو گئی دھوپ

سیتا، راوَن رام کا، کریں دبھاجن لوگ
ایک ہی تن میں دیکھئے، تینوں کا سنجوگ

نَدَافاضلی نے اپنے دوہوں میں کسی خاص نظریے کو پیش نہیں کیا ہے بلکہ ان کے دوہوں میں خیال کی وسعت دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے دوہوں میں گہرائی و گیرائی دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں کسی بھی روایت کو جانچے اور پرکھے بغیر پیش نہیں کیا۔ وہ کسی بھی گروہ کے نظریات کو اپنے فن پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا اس میں ان کے قلم کی طہارت دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں غیر جانب داری سے کام لیا ہے۔ انھوں نے توہم پرست نظریات و غلط اعتقادات اور جھوٹی

روایات کو سرے سے رد کیا ہے۔ انھوں نے مذہبی اجارہ داری اور مادہ پرستی کو کئی دوہوں میں پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے چند ایک دوہے دیکھیے:

ساتوں دن بھگوان کے، کیا منگل کیا پیر
جس دن سوئے دیر تک، بھوکا رہے فقیر

سب کی پوجا ایک سی، الگ الگ ہر ریت
مسجد جائے مولوی، کوئل گائے گیت

نرفاضلی کی شعر گوئی کا آغاز اس وقت ہوا جب فرد اپنی ذات میں گم ہو چکا تھا اور وہ ایک نئی دنیا کی تلاش کر رہا تھا۔ ایسے میں انسان کو اپنی معنویت کھودینے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ انھوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، اس میں بے چہرگی کا مرض عام تھا۔ ان کے دوہوں میں رشتوں کی گم ہوتی معنویت اور فرد کی بے چہرگی کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے چند ایک دوہے پیش خدمت ہیں:

مجھ جیسا اک آدمی، میرا ہی ہم نام
اٹھا سیدھا وہ چلے، مجھے کرے بدنام

مائی سے مائی ملے، کھو کے سبھی نشان
کس میں کتنا کون ہے، کیسے ہو پہچان

نرفاضلی کی شاعری میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے اور یہی بات ان کے دوہوں پر بھی صادق آتی ہے۔ انھوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کا بغور مطالعہ کر کے انھیں اپنے دوہوں میں جگہ دی۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں عام آدمی کے درد اور بے چینی کو زیر بحث لایا ہے۔ یہ وہ آدمی ہے جو زندگی گزارنے کے لیے صعوبتیں اٹھاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مظالم سہتا ہے، بھیک مانگتا ہے اور محنت مزدوری کرتا ہے لیکن پھر بھی اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ ان کے دوہے اخلاقیات، حب الوطنی، ایثار و قربانی اور بھائی چارہ جیسے موضوعات سے لبریز ہیں۔

سیدھا سادھا ڈاکیہ، جادو کرے مہان
ایک ہی تھیلے میں بھرے، آنسو اور مسکان

نقشہ لے کر ہاتھ میں، بچہ ہے حیران
کیسے دیکھ کھاگئی، اس کا ہندستان

نڈافاضلی نے اپنی جمالیاتی جس کو غزل اور نظم کی طرح دوہے کے اظہار کا ذریعہ بھی بنایا۔ ان کے دوہوں میں انسانی اقدار کی پامالی، رشتوں کی بے حرمتی اور ایک قسم کی ناسٹلجیائی کیفیت نظر آتی ہے۔ اس حوالے سے عبدالسمیع اپنے مضمون ”نڈافاضلی کے دوہے“ میں رقم طراز ہیں:

”نڈافاضلی کی شاعری بالخصوص دوہوں کے موضوعات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ان کی نگاہ عرفان ذات، انسانی دکھ پر رہتی ہے، ساتھ ہی وہ انسانی قدروں کی پامالی، خاندانی رشتوں کی بے حرمتی اور مذہبی اجارہ داری کے خلاف ایک محاذ قائم کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ انسان کو اپنی مٹی اور تہذیب سے جو والہانہ عشق ہو سکتا ہے اس کی بہترین صورت نڈافاضلی کی شاعری میں موجود ہے۔“ 5

نڈافاضلی کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مذہب کو اس کی روحانیت کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ کوئی بھی مذہب انسانی اقدار اور جذبات و احساسات کو مجروح کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن اب مادہ پرستی نے مذہب کو نام و نمود کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ نڈافاضلی نے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

بچہ بولا دیکھ کر، مسجد عالی شان
اللہ تیرے ایک، کو اتنا بڑا مکان

اندر مورت پر چڑھے، گھی، پوری، لوبان
مندر کے باہر کھڑا، ایشور مانگے دان

وہ صوفی کا قول ہو، یا پنڈت کا گیان
جتنی بیٹے آپ پر، اتنا ہی سچ مان

نڈافاضلی کبیر داس سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ کبیر مسجد اور مندر میں فرق نہیں کرتے بلکہ انھیں دونوں ایک جیسے لگتے ہیں۔ لیکن جب مادہ پرستی کے عناصر مذہب میں نمودار ہوئے تو یہ اپنے اساسی

مقصد سے دور ہوتے گئے۔ نذافاضلی کو مندر و مسجد اور دوسری عبادت گاہوں میں وہی گورکھ دھندہ نظر آتا ہے جسے کبیر نے محسوس کیا تھا۔ ایک طرف انھیں مسجد کے عالی شان ہونے کا شکوہ ہے تو دوسری جانب بچے کے بے مکان ہونے کا احساس ہے۔ دراصل انسان کے درد سے آگاہ ہونا اور پھر اس کا مداوا کرنا خدا کے نزدیک سب سے بڑی عبادت ہے۔

مذکورہ بالا دوسرے شعر پر غور کیا جائے تو انھیں مندر کا چڑھاوا اور نذر و نیاز بھی روحانیت اور انسانی اقدار سے خالی نظر آتے ہیں۔ نذافاضلی کی شاعری میں مذہب کی سیاست بڑے پیمانے پر بے نقاب ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

تیسرے شعر میں نذافاضلی نے انسان کو یہ پیغام دیا ہے کہ وہ دنیا کو اپنے تجربات و مشاہدات سے دیکھے، پرکھے اور پھر صداقت کو قبول کرے۔ صوفی، قول، پنڈت، گیان جیسے الفاظ مذہب سے وابستہ ہیں۔ صوفی اور قول اسلامی روایت سے متعلق ہیں جب کہ پنڈت اور گیان کا تعلق ہندو دھرم سے ہے۔ ہمارے معاشرے میں مذہب کا جو مقام ہے اور اس کے نام پر جو ظلم و ستم اور استحصال کیا جاتا ہے، اس کی تصویر نذافاضلی کے دوہوں میں نظر آتی ہے۔

نذافاضلی کا مطالعہ و مشاہدہ کافی گہرا ہے۔ انھوں نے زندگی کو کافی قریب سے دیکھا اور اس کے تلخ حقائق کو اپنے دوہوں کا موضوع بنایا۔ ان کے دوہوں میں طنز کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے سماج کے ہر طبقے اور ہر مذہب پر اپنی شاعری خصوصاً دوہوں میں طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ انھوں نے دوہے کو نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اور اس کے موضوعاتی دائرے کو وسعت بخشی۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں فلسفہ حیات کے ساتھ ساتھ سماج میں بیہودہ رسم و رواج پر طنز بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کا دوہا ملاحظہ کریں:

عیسیٰ اللہ ایشور، سارے منتر سیکھ
جانے کب کس نام سے، ملے زیادہ بھیک

نذافاضلی نے مذکورہ بالا دوہے میں موجودہ دور کے انسان کے ڈھونگی پن کا ذکر کیا ہے۔ جن لوگوں نے خدا کو خانوں میں بانٹ دیا ہے، وہ موقع پاتے ہی عیسیٰ، اللہ اور ایشور کے نام پر اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ نذافاضلی نے اپنے دوہوں میں پنڈت، صوفی، مولوی غرض ہر ایک فرد پر بھرپور تنقید کی ہے۔ ان

کے خیال کے مطابق یہی لوگ سماج کو بانٹنے کے ذمے دار ہیں جو مذہب کی آڑ میں لوگوں کو نفرت سکھاتے ہیں۔ وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ اگرچہ سارے مذاہب الگ الگ ہیں لیکن ان کا مقصد ایک ہے۔ انھوں نے تمام مذاہب کے فلسفے کو آپسی بھائی چارے کا سبب گردانا ہے۔ اس حوالے سے ان کے چند ایک دوہے پیش خدمت ہیں:

ہندو کا ہو دان یا، مسلم کی خیرات
گیہوں چاول دال کا، کیا مذہب کیا ذات

چاہے گیتا باچھے، یا پڑھے قرآن
میرا تیرا پیار ہی، ہر پستک کا گیان

پھوٹی کرن اذان کی، جاگے پنچھی ڈھور
چڑیوں کی چہکار میں، کرے تلاوت بھور

مذکورہ بالا تیسرے دوہے میں نندا فضلی نے گاؤں کا نقشہ کھینچا ہے۔ جب صبح کو اذان ہوتی ہے تو گاؤں میں جو جانور ہوتے ہیں وہ سبھی جاگ جاتے ہیں اور ان کے بولنے کی آوازیں بھی آنے لگتی ہیں۔ اسی طرح چاروں طرف سے چڑیوں اور دوسرے پرندوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ نندا فضلی کو چڑیوں کی چہکار میں عبادت کا عکس نظر آتا ہے۔ کیوں کہ ہر کوئی اپنے اپنے طریقے اور اپنی اپنی زبان میں خدائے برحق کی عبادت کرتا ہے۔

نندا فضلی نے اپنے دوہوں میں عصرِ حاضر کے حالات و واقعات کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے حقائق کو سامنے لانے میں حسین استعارات، تشبیہات اور علامات کا استعمال کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے چند دوہے دیکھیے:

دھرموں کو لکھنے لگے، رستوں کے کنگال
وشنو کے اوتار نے، چھوڑ دیا نیپال

دور سمندر پار سے، کوئی کرے بیوپار

پہلے بھیجے سرحدیں، پھر بیچے ہتھیار

نڈا فاضلی نے ہندوستان کے سیاست دانوں پر بھی طعنے کیا ہے کیوں کہ وہ بہ خوبی جانتے ہیں کہ کس طرح وہ عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہندو پاک کی نفرت و غربت کے ذمے دار ہیں۔ انھوں نے ان کے مکرو فریب کے بارے میں بے باک رویہ اپنایا ہے۔

نڈا فاضلی کے دوہوں میں رومانیت کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے دوہوں میں عشق کی مختلف کیفیات کا ذکر ملتا ہے۔ کہیں یہ عشق خدا کے روپ میں، کہیں ماں باپ، بھائی بہن تو کہیں حسین لڑکی کے روپ میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کے دوہے روح کے تاروں اور انسانی جذبات کو اس طرح چھیڑتے ہیں کہ بے ساختہ واہ یا غم کی ایک کیفیت دلوں پر چھا جاتی ہے۔

چڑیوں کو چکار دے، گیتوں کو دے بول
سورج بن آکاش ہے، گوری گھونگھٹ کھول

میں رویا پردیس میں، بھیگا ماں کا پیار
دکھ نے دکھ سے بات کی، بن چھٹی بن تار

انسان زندگی کی بنیادی ضروریات کو حاصل کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے گھر، اپنے گاؤں اور اپنی مٹی کو کبھی بھول نہیں پاتا۔ گھر سے ہجھڑا ہوا شخص بار بار اپنے گھر کی جانب لوٹ جانا چاہتا ہے۔ اسے اپنے گھر، گاؤں اور مٹی سے اتنا لگاؤ ہوتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں وہ کشش محسوس کرتا ہے۔ علاوہ ازیں معمولی سی شے کے کھونے کا افسوس ایسے کرتا ہے جیسے کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہو۔ ان کے دوہوں میں اس قسم کی کیفیت ملتی ہے جس میں کچھ کھوجانے کا درد محسوس کیا جاسکتا ہے۔

نڈا فاضلی کے دوہوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں گاؤں کی زندگی، وہاں کا رہن سہن، لہلہاتے کھیت کھلیان، سرسبز و شاداب زمین، نہریں اور دیگر دل فریب مناظر سے کتنی گہری وابستگی تھی۔ وہاں کے لوگوں میں پیار، خلوص، ایثار و قربانی کا جذبہ غرض ہر چیز کو انھوں نے قریب سے دیکھا ہے۔ اس بات کو وہی شخص پوری مہارت کے ساتھ صفحہ قرطاس پر اتار سکتا ہے جو اپنے وطن، اپنی زمین اور اپنے ملک سے قریب ہو۔ یہ خصوصیات نڈا فاضلی میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ وہ جہاں بھی رہے گاؤں کی طرز زندگی کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس حوالے سے چند ایک دوہے پیش کیے جاتے ہیں:

گھر کو کھوجیں رات دن، گھر سے نکلے پاؤں
وہ رستہ ہی کھو گیا، جس رستے تھا گاؤں

سنا ہے اپنے گاؤں میں، رہا نہ اب وہ نیم
جس کے آگے ماند تھے، سارے وید حکیم

بوڑھا پیپل گھاٹ کا بتیائے دن رات
جو بھی گزرے پاس سے، سر پر رکھ دے ہات

پہلے دوہے میں گھر اور گاؤں کے کھوجانے کا غم محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جب کہ دوسرے دوہے میں
نیم کی موت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ گھر، گاؤں اور نیم دراصل ایک تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں جن سے
ہماری دیہی زندگی تشکیل پاتی ہے۔ ان سب کے کھوجانے کا مطلب تہذیب کا مٹ جانا ہے۔

تیسرے دوہے میں پیپل کو علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ پیپل کا درخت سایہ دار تو ہوتا ہی
ہے۔ اس کے سائے تلے کئی زندگیاں نشوونما پاتی ہیں۔ پیپل کو شفیق بزرگ کا استعارہ مانا جاتا ہے۔

نڈا فاضلی نے تاریخ کے اہم پنوں کو بھی اپنے دوہوں میں جگہ دی ہے۔ وہ تاریخ پر اچھی نظر رکھتے
تھے۔ انھوں نے اپنے ایک دوہے میں اشارتاً ہندوستان کی بد حالی کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ پریم چند کے
دور میں کسانوں کو جو مسائل درپیش تھے، وہی مسائل آج بھی آزاد ہندوستان میں کسانوں کو درپیش ہیں بلکہ
اب وہ پہلے سے زیادہ پیچیدہ اور خطرناک نظر آتے ہیں۔ اس تناظر میں نڈا فاضلی کا دوہا پیش کیا جاتا ہے:

منشی دھنپ رائے تو، ٹنگے ہیں بن کے یاد
سننے والا کون ہے، ہوری کی فریاد

مذکورہ بالا دوہے سے لطف اندوز ہونے کے لیے پریم چند کے ناول ”گنودان“ کا مطالعہ کرنا لازمی
ہے۔ نڈا فاضلی نے اپنے دوہوں میں ہندوستان کے بڑے بڑے لیکھک، سیاست داں اور مذہبی شخصیات کو
شامل کر کے تاریخ کو دوبارہ زندہ کرنے کی سعی کی ہے۔ اس حوالے سے ان کے چند دوہے پیش کیے جاتے
ہیں:

اسٹیشن پر ختم کی، بھارت تیری کھوج

نہرو نے لکھا نہیں، قلی کے سر کا بوجھ

پوجا گھر میں مورتی، میرا کے سنگ شام
جتنی جس کی چاکری، اتنے اس کے دام

کرکٹ، نیتا، ایکٹر، ہر محفل کی شان
ردی میں تلنے لگا، غالب کا دیوان

نہدافاضلی کی شاعری میں ہجرت، در بدری اور اپنوں سے الگ ہونے کا غم جا بہ جانظر آتا ہے۔ اس کا
اظہار وہ کبھی اشاروں اور کنایوں کے ذریعے کرتے ہیں تو کبھی برملا انداز میں بھی اس کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ
انسانی دکھ اور اس دکھ کی جمالیات کا اظہار اپنے دوہوں میں کرتے ہیں:

دکھ کی نگری کون سی، آنسو کی کیا ذات
سارے تارے دور کے، سب کے چھوٹے ہات

نہدافاضلی مذکورہ بالا دوہے میں کہتے ہیں کہ دکھ کسی ایک مقام سے وابستہ نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح
آنسو کی پہچان اس کے نکلنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ دکھ اور غم سے نجات حاصل کرنا بہت مشکل کام ہے۔
نہدافاضلی نے اپنے دوہوں میں ماں کی عظمت کا بیان بھی کیا ہے۔ وہ ماں کو قدرت کا ایک معجزہ قرار
دیتے ہیں۔ اس ضمن میں چند ایک دوہے پیش خدمت ہیں:

ماں قدرت کا معجزہ، ہر دم رہے جوان
جب بوڑھی ہونے لگے، بن جائے سنتان

نزل نشچل پریم تھا، یا ہاتھوں میں سواد
ہر بھاجی ہر دال میں، ماں آتی ہے یاد

گرجا میں عیسیٰ بیس، مسجد میں رحمان
ماں کے پیروں سے چلے، ہر آنگن بھگوان

مذکورہ بالا دوسرے دوہے میں انھوں نے وہی تصور پیش کیا ہے جو انھوں نے اپنی غزل نما نظم ”میسن

کی سوندھی روٹی پہ کھٹی چٹنی جیسی ماں“ میں بیان کیا ہے۔ تیسرے دوہے میں انھوں نے ماں کی عظمت کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ ماں کی ذات ایسی ہے جسے اولاد کا غم اپنے غم سے بھی بڑا نظر آتا ہے۔

نَدَافِضلی کے دوہوں میں روایت کی پاس داری بھی دیکھنے کو ملتی ہے لیکن انھوں نے جدید رجحانات کے دامن کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا بلکہ ان میں ایک مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے دوہوں میں قدیم و جدید نظریات و روایات کا ایک ملاپ اور حسین سنگم ملتا ہے۔ جس کی مثالیں ان کے اکثر دوہوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کے دوہوں میں محبت اور عشقِ حقیقی کے ترانے ہی نہیں زندگی کے تجربے اور مشاہدے بھی ہیں۔ وقت اور حالات کے تیور ہی نہیں جذبات کی نرم آہٹیں بھی ہیں۔

نَدَافِضلی انسانی صلاحیتوں پر بھرپور بھروسہ کرتے ہیں۔ وہ قسمت کے سہارے جینا پسند نہیں کرتے بلکہ انھیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ اگر کوئی انسان کی قسمت بدل سکتا ہے تو وہ خود انسان ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اختیارات دیے ہیں۔ نَدَافِضلی حرکت و عمل کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں اور اسی کو حقیقت مانتے ہیں۔ اس حوالے سے چند ایک دوہے پیش کیے جاتے ہیں:

قسمت و سمت کچھ نہیں، جگ کا ایک ودھان
جگتے کا سنسار ہے، سوتے کا شمشان

خود ہی بنے امیر تو، خود ہی بنے غریب
ایشور اپنے ہاتھ سے، لکھتا نہیں نصیب

نَدَافِضلی نے اپنے دوہوں میں دنیا کی بے ثباتی کو بھی پیش کیا ہے۔ انھیں اس بات کا علم ہے کہ انسان ہمیشہ دنیا میں رہنے والا نہیں ہے۔ آخر کار انسان کو مٹی میں ہی ملنا ہے۔ اس ضمن میں ان کے چند دوہے ملاحظہ کریں:

ماٹی سے ماٹی ملے، کھو کے سبھی نشان
کس میں کتنا کون ہے، کیسے ہو پہچان

کوئی تیرے سامنے، کوئی میرے بعد
کھو جاتا ہے آدمی، رہ جاتی ہے یاد

مذکورہ بالا دو ہوں میں ندافاضلی نے انسانی زندگی کی ناپائیداری کا بیان کیا ہے۔ انسان اس دنیا میں جانے کے لیے آیا ہے۔ انسان اس کردار کی طرح ہے جو کسی تھیٹر یا فلم میں چند منٹوں کے لیے اپنا رول ادا کرتا ہے اور وہ کردار اگرچہ قاری کے ذہن پر اپنا اثر ڈالتا ہے لیکن آہستہ آہستہ اس کی یادیں اور اس کا عکس دھندلا ہو کر ذہن سے نکل جاتا ہے:

سپنا جھرنا نیند کا، جاگی آنکھیں پیاس
پانا، کھونا، کھوجنا، سانسوں کا اتہاس

ندافاضلی کے کلام میں خدا کی وحدانیت سے متعلق بھی دو ہے ملتے ہیں۔ ان کے یہاں خدا کا تصور محدود نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی ذات کو مقدم تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا خدا صرف مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی یا یہودی کا خدا نہیں ہے بلکہ وہ تمام انسانوں کا خدا ہے۔

ملا مت تبدیل کر، اللہ کا فرمان
وہ تو چاروں دھام ہے، کہتا ہے قرآن

ندافاضلی نے اپنے دو ہوں کے ذریعے اردو دوہا نگاری کو ایک نئی سمت دینے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اردو دوہوں کو وسعت اور جلا بخشی ہے اور نئے دوہا نگاروں کے لیے ایک نئی راہ ہموار کی ہے۔ اردو دوہا نگاری کا ذکر ندافاضلی کے بغیر نامکمل ہے۔ ان کے دوہوں کا رنگ و آہنگ دھیمہ، نرم اور ملائم دکھائی دیتا ہے، ان کے دوہوں میں فنی پختگی کے ساتھ ساتھ اسلوب کی دلکشی و شعریت برابر دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے دوہے فن کے تمام لوازمات اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دوہے آج بھی ہر طبقے کے دلوں میں رچے بسے ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر شاہ نواز عالم اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

”انھوں نے دوہے کو بڑی فنی پختگی اور اسلوب کی دلکشی و شعریت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دوہے تخلیق کرتے وقت ان کی نگاہ اپنے زوال پذیر معاشرے پر بھی جمی رہتی ہے۔ ان کے یہاں رومانی دوہے کے ساتھ ساتھ اخلاقی، تہذیبی، ثقافتی اور دور جدید کے مسائل اپنی فنی پختگی کے ساتھ ملتے ہیں اور یہ دوہے اردو دوہے کی تاریخ میں اضافے کی حیثیت

رکھتے ہیں۔“ 6

ندافاضلی کی پہچان اگرچہ ان کی شاعری سے ہے لیکن دوہا نگاری میں بھی انھوں نے کافی شہرت

و مقبولیت پائی۔ ان کے قلم سے لکھے ہوئے دوہے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں مقبول ہوئے۔ ان کے دوہوں میں طبقاتی جبر، مذہبی باغیانہ پن اور سماج کے مظلوم طبقے کی حمایت کے ساتھ ساتھ سماجی پستی کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دوہوں میں قدرتی حسن سے پیار، تہذیب و تمدن سے محبت، نفسیاتی حقائق، رندی و سرمستی، عقل پرستی کا نعرہ اور مسرت و شادمانی کی تلاش جیسے موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انھوں نے دوہوں میں اپنے تجربات، مشاہدات، جذبات و احساسات کو جس بے باکی سے پیرایہ اظہار عطا کیا وہ ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔

حواشی:

- 1۔ ندافاضلی بحیثیت دوہانگار، ڈاکٹر شاہ نواز عالم، مشمولہ ندافاضلی، مرتب پروفیسر علی احمد فاطمی، ص: 123
- 2۔ ایضاً، ص: 124
- 3۔ اردو شاعری میں دوہے کی روایت، ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی، ص: 97-98
- 4۔ کثیر الجہات شخصیت کے مالک ندافاضلی، پروفیسر اسرار اللہ انصاری، نیادور، ص: 112
- 5۔ ندافاضلی کے دوہے، عبدالسمیع، اردو دنیا، ص: 30
- 6۔ ندافاضلی بحیثیت دوہانگار، ڈاکٹر شاہ نواز عالم، مشمولہ ندافاضلی، مرتب پروفیسر علی احمد فاطمی، ص: 138

باب چہارم:
نَدَافِ ضَلٰی کا فلمی سفر

گیت:

گیت ہندی شاعری کی دین ہے۔ نظم کی طرح گیت میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے۔ اس میں ہر نوع کے موضوعات پر خامہ فرسائی کی جاسکتی ہے۔ اس میں محبت اور نغمگی کی آمیزش ہوتی ہے۔ اس کا اپنا ایک تہذیبی مزاج ہے۔ اس کے لیے غنائیت لازمی ہے۔ ترنم، جھنکار اور تھاپ اس کی خصوصیات ہیں۔ اس کا شمار داخلی شاعری میں ہوتا ہے۔ یہ عام طور سے گانے کے لیے لکھا جاتا ہے۔ ریڈیو اور سنیما نے گیتوں کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ عہد حاضر میں گیتوں کا سب سے بڑا سرمایہ فلموں کی صورت میں محفوظ ہے۔ گیت کو اردو کے مزاج سے قریب تر کرنے کی روش کا آغاز عظمت اللہ خاں سے ہوا، لیکن اسے فروغ دینے میں اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری نے اہم رول ادا کیا۔ حفیظ کے گیتوں میں قومیت اور حریت کی لے ابھرتی ہے۔ اختر شیرانی کی شاعری شدید جذباتی شاعری ہے جس میں حسن و عشق کی بجلیاں کوندتی دکھائی دیتی ہیں۔ اردو گیت کی تاریخ میں میراجی کا نام کافی اہم تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے گیت کو نئے افق اور نئے جہان بخشے۔ ان کے گیتوں میں سطحی جذبات کی جگہ سنجیدگی اور گہرائی نظر آتی ہے۔ اقبال نے اپنے گیتوں میں حب الوطنی کا جذبہ، بچوں کی معصوم کلکاریاں اور ہلکے پھلکے مضامین کو اہمیت دی ہے۔

جمیل مظہری، جگر مراد آبادی، فیض احمد فیض، حفیظ ہوشیار پوری، مختار صدیقی، احسان دانش، مجید امجد، اختر الایمان، شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری وغیرہ نے گیت کی روایت کو برقرار رکھنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اسی طرح گیت کو رواج دینے میں جن شعرا نے معاون کردار نبھایا ہے، ان میں قتیل شفائی، بیکل اتساہی، ندا فاضلی، انور جلال پوری، عادل منصوری، اجمل سلطان پوری، وسیم بریلوی اور حسن کمال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جدیدیت کے زیر اثر ان گیتوں کے موضوعات نئے ہیں۔ ان گیتوں کا مستقبل کافی روشن اور تابناک نظر آتا ہے۔ اب گیت روایت کی زنجیریں توڑ کر سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کی طرف مائل ہوا ہے۔ اس میں روایتی حسن و عشق کی داستانیں بھی ہیں اور جدید دور کے انسان کی شکست خوردگی بھی ہے۔

ندا فاضلی نے ایک گیت کار کی حیثیت سے بھی کافی شہرت و مقبولیت پائی۔ انھوں نے بہت سی فلموں کے لیے گیت لکھے ہیں۔ ان کے گیت عوام و خواص میں مشہور و مقبول ہیں۔ انھوں نے گیتوں میں بھی سادہ الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ فلمی شاعروں اور گیت کاروں کے درمیان رہ کر بھی انھوں نے ایک باوقار قلم کار کی زندگی گزاری۔ انھوں نے کبھی بھی شعری روایت اور فنی تقاضوں کو پامال نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنے گیتوں

میں مضامین کی رنگارنگی اور نئی سوچ و فکر کو پیش کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لکھے ہوئے گیت سامعین و قارئین کے دلوں میں گھر کر لیتے ہیں۔ وہ راجندر سنگھ بیدی کے توسط سے فلمی دنیا میں آئے۔ انھوں نے نغمہ نگاری کو صرف روزی روٹی کے لیے اپنایا۔ اس کے باوجود وہ یہاں بھی اپنا معیار قائم رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے گیتوں میں بھی زندگی کے مسائل، گاؤں، شہر کی تہذیب کو برقرار رکھا ہے۔ انھوں نے ان میں نیارنگ پیدا کر کے ایسی فضا کی تشکیل کی جو انسانی ذہن کو معطر کر دیتی ہے۔ گیت کی صنف کو فروغ دینے میں انھوں نے فعال کردار نبھایا ہے۔ ان کے گیت خوش نما اور سریلے ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں پریمی رومانی اپنے مضمون ”ندا فاضلی کے گیت“ میں لکھتے ہیں:

”ندا کے گیت سریلے، صاف اور خوش نما ہیں۔ ان کے گیتوں میں افسردگی، تجر، گھٹن، آرزو مندی، ترنم اور غنائیت سب کچھ ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ اردو گیت کو فروغ دینے میں جوئی تراکیب، فنی تجربے اور علامتی اسلوب اپنایا ہے۔ وہ انہی کا کام ہے۔“¹

ندا فاضلی اپنے گیتوں میں گاؤں کی فضا، رنگ و روپ، نرمی و شیرینی اور شوخیوں وغیرہ کو سمو کر ایک نیا روپ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے گیتوں میں عصری حسیت بھی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے شاعری کی طرح گیتوں کو بھی گاؤں کی مٹی کی خوشبو سے خوب مہکایا ہے۔ وہ اپنے گیتوں میں دیہی زندگی، موسم، رسم و رواج کا ذکر اپنے خاص اور منفرد انداز میں کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا یہ گیت ملاحظہ فرمائیں:

موسم چھیل چھبلا
دیکھ اکیلا گھیرے مجھ کو مانے نہیں نشیلا
موسم / موسم چھیل چھبلا
چھم چھم بر سے بادل بن کر
کبھی گھٹا سا جھومے / ہوا بنے تو آفت ڈھائے
یہاں، وہاں سب چومے
بن بیا ہے لڑکوں سا، نٹ کھٹ بچوں سا شرمیلا
موسم / موسم چھیل چھبلا
سکھپوں سی چنچل دو پہریں

کھٹی میٹھی چھاؤں / ریل کی سیٹی بن میں گونجے

چھن سے ٹوٹے گاؤں

بھولی بری یادیں برسیں، من ہو جائے گیلا

موسم / موسم چھیل چھیل

نَدِ افاضلی کے گیتوں میں ہندستانی مٹی کی بوباس، گاؤں کی زندگی کا حسن اور موسموں کی دل کشی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے گیتوں میں درد و کرب اور ہجر و وصال کی کیفیات کے ساتھ ساتھ زندگی کے تلخ حقائق کا اظہار بڑے فن کا رانہ انداز میں کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کا یہ گیت دیکھیے:

کئی دنوں سے چاند اُگا / نہ سورج نکلا

جب سے تم پردیس گئے ہو / بہت اندھیرا ہے

رات رات بھر پانی بر سے / دھول اُڑائے دن بھر

لوہارن لوہے کو پیٹے / لگے ہتھوڑا من پر

بڑھتی بچار لکڑی چیرے / میں دیکھوں اٹھ اٹھ کر

نئی صراحی میں بھی پانی / ندیا جیسا ہے

جب سے تم -----

ابھی ابھی ٹوٹے گا پیالہ / پھر خود جڑ جائے گا

مڑ کر دیکھا تو / کھڑکی کا سریا مڑ جائے گا

کبھی لگے / پنجرے میں بیٹھا پنچھی اُڑ جائے گا

کیسے کیسے نئے وچاروں نے / آگھیرا ہے

جب سے تم پردیس گئے ہو / بہت اندھیرا ہے

مذکورہ بالا گیت میں نَدِ افاضلی نے ہجر میں تڑپتی ہوئی ایک عورت کے درد کو پیش کیا ہے جو اپنے محبوب کو یاد کر رہی ہے۔ چوں کہ اس کا محبوب اس کی نظروں سے دور ہے۔ اس لیے ساری دھرتی اسے تاریک لگتی ہے۔ لوہارن لوہے کو پیٹے یا بڑھتی لکڑی چیرے، چوٹ اس کے دل پر لگتی ہے۔ نئی صراحی کی موجودگی نے اس کی پیاس کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے۔ اس گیت میں لوہارن، لوہا، بڑھتی، صراحی، ہتھوڑا، لکڑی، ندیا، پیالہ، پنجرہ اور پنچھی جیسے الفاظ دیہات کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ وہ نری جذباتیت کے گیت کار نہیں ہیں۔ ان کے یہاں ارضیت پر بھی بھرپور مکالمہ گیتوں کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ نَدِ افاضلی کا ایک اور گیت پیش

خدمت ہے:

بادل بادل پیاس پکارے
پانی رے او پانی / پیاس بڑی دیوانی
پتھر پتھر پانی چٹے / ریت بنی جل دھارا
گو نگے بہرے سناٹے / میں چیخ چیخ کے بارا
اُتر، دکھن، پورب، پچھم / ہوا کرے من مانی
پیاس بڑی دیوانی / پانی رے او پانی
بیلوں کی شیشہ آنکھوں میں / پتھر پتھر بادل
کہیں بھٹی دھرتی کی چھاتی / دور دور تک جنگل
پر بت پر بت وادی وادی / ویرانی ویرانی
پیاس بڑی دیوانی / پانی رے او پانی

اس نوع کے گیتوں کو ندافاضلی نے علامتوں اور استعاروں سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اسی لیے ان کے گیتوں کے اسرار دھیرے دھیرے کھلتے ہیں۔ اس حوالے سے پریمی رومانی کے مضمون کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

”ندافاضلی کے گیتوں میں ارضی تشبیہات، ارضی کیفیات اور ایک خاص قسم کی امیجری ملتی ہے۔ ان کا مطالعہ کرتے ہوئے تمام پُر پیچ راہیں خود بہ خود کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کے ہم عصر شعرا میں ایسی تشبیہات و استعارات شاذ ہی نظر آتی ہیں، جو ندا کی شاعری میں ملتی ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں مصوری کرتے ہیں۔ ان کے گیت پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے خود بہ خود روح کی پیاس بجھ رہی ہو۔ بیلوں کی شیشہ آنکھیں، دھرتی کی چھاتی، جل دھارا، گو نگے بہرے سناٹے، ریت بنی جل دھارا، آنگن آنگن جلتی جوالا، نگے بول وغیرہ جیسے الفاظ اور تراکیب کے تانے بانے سے وہ ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ اپنے مخصوص سیاق و سباق میں ان تراکیب کا استعمال اس قدر مصورانہ ہے کہ حسین رنگوں کی آمیزش سے بنی ہوئی خوب صورت تصویریں آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں۔ یہ

خصوصیات اردو کے بہت کم گیت کاروں کے حصے میں آئی ہیں۔“ 2

نڈافاضلی کے گیتوں میں علامتی اسلوب پایا جاتا ہے۔ جہاں ایک طرف انھوں نے اپنے گیتوں میں سلیس اور رواں زبان کے ساتھ نئی تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ وہیں دوسری جانب رمزیت اور اشاریت کے پہلو بھی اُجاگر کیے ہیں۔ نیز اس میں انھوں نے لوک شاعری کا رنگ بھی بھر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے گیت سریلے ہو گئے ہیں۔ ان کے گیتوں کی انفرادیت اور عظمت کا اندازہ ان کے لہجے اور اندازِ بیان سے لگایا جاسکتا ہے۔ ان کا یہ گیت دیکھیے:

جنگل بنجاروں کے میت

دیواروں کے گھر کیا جانیں موسم کے سنگیت

ہاتھ میں لے کر آگ نہائے / بیچ ندی میں رات

میلوں دور سے دھرتی سن لے / نیل گگن کی بات

سو کھ پھول / کلی مسکائے / کوئی ہار نہ جیت

جنگل بنجاروں کے میت

تنلی کے اُڑتے رنگوں میں / ساون جھولا ڈالے

ہوا کیلے رستہ بھولے / جگنو دپک بالے

بیچ میں اُکڑ / بن کر پھوٹیں / خاموشی کے گیت

جنگل بنجاروں کے میت

نڈافاضلی نے اپنے گیتوں میں روزمرہ بولی جانے والی زبان کے ساتھ سادہ الفاظ اور آسان لب و لہجہ اختیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گیت دلوں پر اثر کرتے ہیں۔ ان کے گیتوں میں گاؤں کی ندیاں، وادیاں، جھیلیں، پر بت وغیرہ کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان کا لہجہ نرم، کوئل اور احساسات سے بھرپور ہے۔ انھوں نے گیتوں میں جوش، ولولہ، گداحتگی اور گرماہٹ پیدا کی ہے۔ وہ اپنے گیتوں میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک گیت میں عشق و رومان اور ہندوستانی تہذیب کے امتزاج سے ایک دل کش فضا تیار کی ہے۔ گیت ملاحظہ کریں:

کھنکتا ہے رو پہلا دن تو سارا / کہیں سے رات کھوٹی ہو گئی ہے

وہ اب بھی ہنستی رہتی ہے مسلسل / چھما چھم بھاگتی ہے ٹوٹی ہے

کبھی ناراض ہو جائے تو اب بھی / وہ فوراً پھلجڑی سی چھوٹی ہے

وہ باتیں اب بھی کرتی ہے برابر / مگر آواز موٹی ہو گئی ہے
 تکلف سے پرے ہے اب بھی لہجہ / نگاہوں میں وہی بے باکیاں ہیں
 وہی ہے ناپ اس کی چوڑیوں کا / اشاروں میں وہی گولائیاں ہیں
 خیالوں میں ہے اب بھی بھولپن سا / مگر ہر بات چھوٹی ہو گئی ہے
 صراحی اب بھی گر جاتی ہے اس سے / وہ اب بھی کچے ٹانکے ٹانکتی ہے
 گلی سے کوئی بھی آواز آئے / وہ گھر میں سب سے پہلے جھانکتی ہے
 مسالہ اب بھی موٹا پیستی ہے / مگر کچھ گول روٹی ہو گئی ہے
 کھنکتا ہے رو پہلا دن تو سارا / کہیں سے رات کھوٹی ہو گئی ہے

مذکورہ بالا گیت میں نندا فاضلی نے ایک معصوم اور کم عمر لڑکی کا ذکر کیا ہے۔ لڑکی بڑی ہو گئی ہے لیکن اس کے عادات و اطوار میں تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اس کے ہاتھ سے اب بھی صراحی گر جاتی ہے۔ ایک سدھار اس میں ضرور آیا ہے کہ اس نے اب روٹی بنانا سیکھ لیا ہے۔ اس گیت میں میں انھوں نے پھلجڑی، چوڑیاں، صراحی، کچے ٹانکے، مسالہ، روٹی وغیرہ جیسے الفاظ سے کام لیا ہے۔ ان سب کا تعلق گاؤں کی تہذیب سے ہے۔ وہ اپنے گیتوں میں جدت کے نمونے دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے گیتوں میں ایسے انسان کے نازک جذبات کی عکاسی کرتے ہیں جو شہروں کی مصروف کاروباری زندگی میں سانس لینے کے لیے مجبور ہوئے ہیں۔ ان کے گیتوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ جیسے گیت لکھتے ہیں، ان کے لیے الفاظ بھی ویسے ہی تلاشتے ہیں۔ انھوں نے اپنے گیتوں میں مرقع کاری کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔ وہ عام آدمی کی زبان کو اپنے گیتوں میں بروئے کار لاتے ہیں۔ اپنے گیتوں کی زبان کے حوالے سے نندا فاضلی رقم طراز ہیں:

”ان گیتوں میں بھی میں نے اسی زبان کا استعمال کیا ہے جو نہ پنڈتاناہ
 ہندی ہے اور نہ مولویانہ اردو ہے۔ اسے اگر کوئی نام دیا جاسکتا ہے تو وہ
 عام آدمی کی اردو بھی ہو سکتا ہے اور بچھلی قطار والے کی ہندی بھی کہا
 جاسکتا ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو گلی کوچوں میں اپنے پیروں سے چلتی ہے
 اور جذبات و احساسات کے ساتھ اپنا مزاج بدلتی ہے۔ میں نے عام
 آدمی کی ترجمانی عام زبان میں کرنے کا تجربہ کیا ہے۔“ 3

نندا فاضلی کی شاعری کا ایک اہم پہلو انسانی تناؤ ہے جو مشینی قوتوں کے دباؤ اور جنسی زندگی کی گھٹن سے پیدا ہوا ہے۔ ان کے گیتوں میں عمل اور ردِ عمل دونوں کیفیات ملتی ہیں۔ ان کے گیتوں میں قاری اپنے

اندر جھانکنے کی کیفیت پاتا ہے۔ وہ اپنے جذبات و احساسات قاری تک پہنچانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ وہ استعارات و تشبیہات سے بھی کام لیتے ہیں۔ ان کے گیت دلوں کو مسحور کرتے ہیں۔ ان کے گیتوں میں پاؤں کی جھنکار بھی ہے اور گھنگر کی آواز بھی ہے۔ ان کا اسلوب ان کے گیتوں کو خوش نما رنگوں سے مزین کرتا ہے۔ ان کے گیتوں میں ذاتی کرب کے علاوہ معاشرے کا کرب بھی جلوہ افروز دکھائی دیتا ہے۔ انسان دوستی ان کی شاعری کا خاص وصف ہے۔ جوان کے گیتوں میں بھی نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے ایک گیت میں مدر ٹریسا (Mother Teresa) کو موضوع بنایا ہے۔ اس ضمن میں ان کا یہ گیت دیکھیے:

ہر دھوپ میں چھاؤں سی / ہر سر پہ دعاؤں سی
 روتی ہوئی آنکھوں کی / تحریر جو پڑھتی تھی
 انسان کی خاطر جو / بھگوان سے لڑتی تھی
 وہ پیاسی زمینوں پر / اتری تھی گھٹاؤں سی
 بیماروں کے بستر پر! / سوتا تھا خدا اس کا
 لاچاروں کے چہروں سے / روتا تھا خدا اس کا
 روشن تھی اندھیروں میں / وہ ماں کی دعاؤں سی
 وہ پیاس کے مندر میں / برسات کی صورت تھی
 وہ بھوک کی مسجد میں / روٹی کی عبادت تھی
 وہ درد کے گرجا میں / انسان کی خدمت تھی
 نفرت کے اندھیروں میں / رحمت کی ضیاؤں سی

----- ہر سر پہ -----

اس گیت میں نذا فاضلی نے مدر ٹریسا کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ نیز ان کی خوبیوں کو بھی بڑے فن کارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ مذکورہ بالا گیتوں کے علاوہ انھوں نے ایسے نغمے بھی لکھے ہیں جنہیں مختلف گلوکاروں نے اپنی آواز سے سجایا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ گیت ملاحظہ کریں:

دھوپ بھری چھت پہ برس گیا پانی
 آنگن میں آ کے / اٹکیٹھی بجا کے
 ناگن سا لہرا کے۔۔۔ ڈس گیا پانی
 جھولے میں لہرائیں ست رنگے ساون

جاگے پڑوسی جگائے پڑوس
چھم چھم چھما چھم جھنا جھنا جھن
مینا کے تاروں سا کس گیا پانی۔۔۔۔
چھپر کی کٹیا نہ کنجی نہ تالے
جب چاہے برسات نیندیں چرا لے
روٹی کو نیلے یا گھر کو سنبھالے
جلتے توے پر ا جھلس گیا پانی

اس گیت کو چندن داس نے اپنی آواز دی ہے۔ نندا فاضلی کے ذہن میں تصورات ابھرتے ہیں، تجرد عکس بناتے ہیں اور ان عکسوں کے گڈمڈ ہو جانے سے کئی سمعی، بصری اور لمسی پیکر جنم لیتے ہیں۔ یہ پیکر دل کش اور خوب صورت نظر آتے ہیں۔ الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے گیتوں میں ہندوستانی دیہات کی دل کشی سما گئی ہے۔ انھوں نے اپنے گیتوں میں بھی وہی موضوعات پیش کیے ہیں جو غزلوں، نظموں اور دوہوں میں ملتے ہیں۔ اسلوب بھی سادہ، سلیس اور آسان رکھا ہے۔ نیز ان کے گیتوں میں ادب کی چاشنی بھی قائم رہتی ہے۔

فلمی سفر:

نندا فاضلی نے غزلیں، نظمیں، دوہے اور گیت لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ فلم انڈسٹری میں بھی انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ انھوں نے فلموں کے لیے جو نغمے لکھے ان کو بہت پسند کیا گیا۔ اس سفر کا آغاز انھوں نے فلم ”رضیہ سلطان“ سے کیا۔ جس میں انھوں نے دو نغمے تحریر کیے۔ دراصل فلم ساز کمال امر وہی اس فلم کے نغمے جاں نثار اختر سے لکھوا رہے تھے کہ اچانک ان کا انتقال ہو گیا اور یہ ذمہ داری نندا فاضلی کو سونپی گئی۔ انھوں نے اس فلم کے لیے جو دو نغمے تحریر کیے ہیں وہ کافی مقبول ہوئے۔ یہ 1980 کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد وہ فلم انڈسٹری میں اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے اپنے نغموں میں معیار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کے نغموں کی کامیابی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ بڑے بڑے گلوکاروں نے ان کو اپنی آواز سے سجایا ہے۔ ان کے گیتوں میں ادب کی چاشنی، شعریت، تغزل اور ترنم سب کچھ پایا جاتا ہے۔ جگجیت سنگھ، محمد رفیع، کشور کمار، کمار شانو، سونو نگم، اکا یا گنگ، شریا گھوشال، لتا منگیشکر،

سندھی چوہان، آشا بھونسلے، ادت نارائن، شان، ہیم لتا، کین مرزا، کویتا کرشنا مورتی اور بھوپندر جیسے گلوکاروں نے ان کے نغموں کو اپنی آواز سے سجایا ہے۔ جگجیت سنگھ کے ساتھ ان کے گہرے مراسم تھے۔ انھوں نے ان کے ساتھ ایک البم (Insight) بھی بنایا تھا جو کافی مقبول ہوا تھا۔ ان کے نغمے آج بھی بڑے ذوق و شوق سے سنے اور پسند کیے جاتے ہیں۔

وٹھل بھائی ٹیل نے نڈافاضلی کے ساتھ مل کر فلمی نغمہ نگاری جوڑی بنائی تھی۔ ان کے باہم معاہدے کے تحت ان کے لکھے ہوئے گیتوں پر وٹھل بھائی ٹیل کا نام شامل ہوتا تھا۔ وٹھل بھائی اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے فلموں میں نغمہ نگاری کے مواقع حاصل کرتے تھے۔ ہانگ کانگ کے جیٹھوانی نامی ایک سندھی تاجر نے نڈافاضلی اور وٹھل بھائی کی نغمہ نگار جوڑی کو لے کر جو تین فلمیں ”شاید“، ”ہرجائی“ اور ”کنہیا“ بنائی تھیں، وہ پروڈیوسر کی نا تجربہ کاری کی بنا پر بری طرح فلاپ ثابت ہوئی تھیں۔ فلمی مبصروں نے چوں کہ ان فلموں کے گیتوں کو بہت سراہا تھا۔ اس لیے نڈافاضلی کو فلموں میں کام ملنے لگا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کے لکھے ہوئے فلمی نغمے ہندوستانی فلموں کا بیش قیمتی سرمایہ ہیں۔ جن فلموں میں انھوں نے نغمے لکھے ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں:

شاید (1979)

آپ تو ایسے نہ تھے، ریڈ روز (1980)

آہستہ آہستہ، ہرجائی، کنہیا، ناخدا، گہرا زخم، بیوی او بیوی (1981)

انوکھا بندھن، لہنی، دولت (1982)

رضیہ سلطان، سویکا رکیا میں نے، چور پولس (1983)

کنواری بہو (1984)

بے پناہ، امیر آدمی غریب آدمی (1985)

وجے، ایک نیارشتہ، فلک (1988)

بلو بادشاہ (1989)

بے گناہ (1991)

چاہت، بے قابو، اس رات کی صبح نہیں، کرشنا (1996)

تمنا، ہمالیہ پتر (1997)

بھائی بھائی (1998)

سرفروش (1999)

ترکیب، دل کہیں ہوش کہیں (2000)

بس اتنا سا خواب ہے (2001)

سُر، ودھ، لیلیا (2002)

دھوپ (2003)

دیو (2004)

بھاگ متی (2005)

یاترا (2006)

چینی چینی بینگ بینگ، مارنگ واک (2009)

فلم ”آہستہ آہستہ“ کے نغمے نے نہ صرف لاکھوں دلوں کو جیت لیا۔ بلکہ یہ نغمہ شہرت کی اس منزل تک پہنچا کہ فلم کی مقبولیت کا سبب بن گیا۔ اس نغمے کی موسیقی خیام نے مرتب کی تھی۔ آشا بھونسلے اور بھوپندر سنگھ نے اپنی مترنم آواز سے اس نغمے کو وہ دل کشی بخشی جو فلمی ہدایات کے ساتھ ساتھ ادبی تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہوا نظر آتا ہے:

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمین تو کہیں آسماں نہیں ملتا

نہا فاضلی کے اس شعر میں کافی گہرائی نظر آتی ہے۔ یہ شعر بڑا معنی خیز ہے۔ اس شعر کی معنویت کا اندازہ کہنیا لال نندن کے درج ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے جس میں وہ اپنا ایک نجی واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”نہا کا یہ شعر کتنا معنی خیز ہے، اس کا ایک نجی واقعہ کے حوالے سے بیان کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ یہ واقعہ میری نجی زندگی میں نہا کی شاعری کے بے ساختہ لگاؤ کا ایک اتفاق بھی ہے اور اچھی شاعری کی مقبولیت کا ایک نمونہ بھی۔ اپنی چھوٹی بیٹی کے لیے ان دنوں بر

(دولہے) کی تلاش میں تھا۔ کافی بھٹک چکا تھا لیکن دل کے مطابق کوئی لڑکا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اخبار میں اشتہار دے کر کچھ امیدوار تلاش کرنے کی کوشش کی اور جب اے پلس یا اول درجہ میں کچھ ہاتھ نہ لگا تو دوسرے درجہ پر اتر آیا۔ ایک دن ایک خاندان بیٹی کو دیکھنے گھر آیا۔ امیدوار نے اپنی برتری بنائے رکھنے کے لیے اپنی سطح سے اتنا مناسب نہ سمجھا۔ گھر بار اچھا ہوگا ایسا اندازہ تھا۔ معاشی حالت بھی قابل برداشت تھی لیکن بات چیت میں رکھ رکھاؤ اور مصنوعی پن ہونے کی برکی ضد مرے خاندانی ماحول کو اس آتی محسوس نہ ہوئی۔ یہ سوچ کر کہ آئندہ سب ٹھیک ہو جائے گا، میں نے سمجھوتا کرنا چاہا، بیٹی کو بھی والدین کی پریشانی کا احساس تھا، اس لیے وہ بھی اس سمجھوتے پر آمادہ ہو گئی۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد جب میں نے بیٹی سے اس کی رائے جانی چاہی تو اس نے ہاں کرنے سے انکار نہ کیا، لیکن ساتھ ہی نڈا فاضلی کا یہ شعر سناتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی کہ

کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
کہیں زمین تو کہیں آسماں نہیں ملتا

نڈا فاضلی میرے دوست ہیں، یہ بیٹی جانتی تھی لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میری بیٹی کی زندگی کے بارے میں نڈا کا شعر میرے لیے ایک فیصلہ کن موڑ بن جائے گا۔ میں نے اپنا وہ فیصلہ تو بدل ہی دیا۔ اس خاندان سے معذرت چاہ کر فرصت پا گیا، لیکن آئندہ کے لیے ایک سبق بھی سیکھ لیا کہ اب بیٹی کی شادی وہیں کروں گا جہاں اس کے زمین و آسمان دونوں اسے حاصل ہوں۔“ 4

اسی طرح فلم ”رضیہ سلطان“ کا ایک گیت بہت مشہور ہوا۔ نڈا فاضلی نے اپنے فلمی سفر کا آغاز اسی فلم سے کیا تھا۔ اس فلم کے مکمل ہونے میں بہت عرصہ لگا۔ اس مدت کے درمیان انھوں نے بہت سی فلموں کے لیے گیت تحریر کیے تھے۔ اس فلم کا یہ گیت دیکھیے:

تیرا ہجر میرا نصیب ہے، تیرا غم ہی میری حیات ہے
مجھے تیری دوری کا غم ہو کیوں تو کہیں بھی ہو میرے ساتھ ہے

اس گیت کو خیام نے موسیقی دی تھی۔ لیکن مرزا نے اس نغمے کو اپنی آواز سے سجایا تھا۔ نذافا ضلی کی ایک غزل عوام و خواص میں کافی مقبول و مشہور ہوئی جسے جگجگت سنگھ نے اپنی آواز سے سجایا تھا۔ اس غزل کو فلم ”سرفروش“ میں پیش کیا گیا۔ غزل ملاحظہ کریں:

ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے
عشق کیجیے پھر سمجھئے زندگی کیا چیز ہے
ان سے نظریں کیا ملیں روشن فضا میں ہو گئیں
آج جانا پیار کی جادوگری کیا چیز ہے
کھلتی زلفوں نے سکھائی موسموں کو شاعری
جھکتی آنکھوں نے بتایا مے کشی کیا چیز ہے
ہم لبوں سے کہہ نہ پائے ان سے حالِ دل کبھی
اور وہ سمجھے نہیں یہ خامشی کیا چیز ہے

اسی طرح فلم ”آپ تو ایسے نہ تھے“ کا ایک نغمہ بہت دل کش ہونے کے ساتھ ساتھ پسندیدگی کی سند بنا ہوا ہے۔ اس نغمے کو الگ الگ آوازوں میں چار مرتبہ فلما یا گیا۔ لیکن محمد رفیع کی آواز نے اس نغمے کے حسن میں چار چاند لگائے ہیں۔ اس ضمن میں یہ گیت پیش خدمت ہے:

تو اس طرح سے میری زندگی میں شامل ہے
جہاں بھی جاؤں یہ لگتا ہے تیری محفل ہے
تیرے جمال سے روشن ہے کائنات میری
میری تلاش تیری دلکشی رہے باقی
خدا کرے یہ دیوانگی رہے باقی
تیری وفا ہی میری ہر خوشی کا حاصل ہے
جہاں بھی جاؤں یہ لگتا ہے تیری محفل ہے

اس نغمے کا رومانوی آہنگ اپنی مثال آپ ہے جو عام روش سے ہٹ کر ہے۔ اس گیت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے ادبی پیرائے اور عام فہم زبان میں لکھا گیا ہے۔ فلم ”ناخدا“ میں نذافا ضلی نے چھ نغمے تحریر کیے۔ اس فلم کا یہ گانا پسند کیا جاتا ہے:

تمہاری پلکوں کی چلمنوں میں، یہ کیا چھپا ہے ستارے جیسا

حسین ہے یہ ہمارے جیسا شریر ہے یہ تمہارے جیسا
اس نغمے کی موسیقی خیام نے ترتیب دی ہے۔ لتا منگیشکر اور نٹن مکیش نے اسے اپنی مترنم آواز سے
سجایا ہے۔ اسی طرح فلم ”سورکار کیا میں نے“ کا ایک گیت بہت پسند کیا گیا۔ اس گیت میں اوشا کھنہ نے
موسیقی کے فرائض انجام دیے، جب کہ لتا منگیشکر نے اسے اپنی آواز دی ہے۔ گیت ملاحظہ کریں:

اجنبی کون ہو تم جب سے تمہیں دیکھا ہے
ساری دنیا میری آنکھوں میں سمٹ آئی ہے
تم تو ہر گیت میں شامل تھے ترنم بن کے
تم ملے ہو مجھے پھولوں کا تبسم بن کے
ایسا لگتا ہے برسوں سے شناسائی ہے

نڈا فاضلی نے فلم ”ترکیب“ کے پانچ نغمے لکھے۔ جگجیت سنگھ اور الکا یانگ کی آواز میں اس فلم کا ایک
نغمہ پسند کیا گیا۔ نغمے کے بول کچھ اس طرح سے ہیں:

میری آنکھوں نے چنا ہے تجھ کو دنیا دیکھ کر
کس کا چہرہ اب میں دیکھوں تیرا چہرہ دیکھ کر

نڈا فاضلی نے فلم ”سُر“ کے لیے جو نغمے تحریر کیے، انہیں بہت پسند کیا گیا۔ اس فلم کے نغمے آج بھی
بڑے شوق سے سنے جاتے ہیں۔ اس فلم کا یہ نغمہ کافی مقبول و مشہور ہوا:

کبھی شام ڈھلے تو میرے دل میں آ جانا
کبھی چاند کھلے تو میرے دل میں آ جانا
مگر آنا اس طرح تم کہ یہاں سے پھر نہ جانا
تو نہیں ہے مگر پھر بھی تو ساتھ ہے
پاس ہو کوئی بھی تیری ہی بات ہے

اسی فلم کے ایک اور نغمے کو بہت پذیرائی ملی۔ نغمے کے بول کچھ اس طرح ہیں:

آ بھی جا آ بھی جا اے صبح آ بھی جا
رات کو کر وداع دلربا آ بھی جا

نڈا فاضلی نے ادبی اور معیاری فلمی نغمے لکھے ہیں۔ انھوں نے چند فلموں کے مکالمے بھی ضبط تحریر
میں لائے، جن میں فلم ”وجئے“، ”ہر جانی“ اور ”فلک“ کے نام قابل ذکر ہیں۔ انھیں بڑے کمال کے موسیقار

بھی ملے جن میں خیام اور آر۔ ڈی۔ برمن کافی اہم ہیں۔ ایک طرف جہاں ان کے فلمی نغموں میں ادب کی چاشنی شامل ہے۔ وہیں دوسری جانب ان کے نغموں کا آہنگ بھی دل کش اور پراثر دکھائی دیتا ہے۔ بڑے بڑے گلوکاروں نے ان کی غزلوں کو سروں میں ڈھال کر اس دور کے غزل سرائی کے رجحان کو بھی آگے بڑھایا ہے، جس کی وجہ سے فلموں میں گیتوں کے ساتھ ساتھ غزلوں کی شمولیت کی گنجائش بھی بڑھی۔ اس سب کے باوجود ان کی نغمہ نگاری سے سچی فلموں میں کامیاب فلموں کی تعداد دس پندرہ سے زیادہ نہیں ہے۔ چوں کہ نداء فاضلی کو برسوں کی تنگ دستی جھیلنا پڑی۔ اس لیے اس وقت ان کو آمدنی کا یہی ایک ذریعہ راس آیا تھا۔ اس وجہ سے وہ اہل اور نااہل، غرض ہر طرح کے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی چھوٹی بڑی اور اچھی بری ہر طرح کی فلمیں قبول کرتے تھے۔ فلم انڈسٹری میں نغمہ نگاری جگہ سب سے اتر ہوتی ہے۔ اس لیے وہ مختلف طرح کے سمجھوتے برداشت کرتا ہے۔ سہیل وحید نے ایک انٹرویو میں نداء فاضلی سے ایک سوال پوچھا تھا کہ کیا فلم انڈسٹری سے ملنے والی کثیر رقم نے اردو مصنفین کو مختلف طرح کے سمجھوتے کرنے پر مجبور کیا؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے نداء فاضلی کا کہنا تھا:

”سمجھوتے کہاں نہیں ہو رہے ہیں۔ کیا یونیورسٹی، کالج میں نہیں ہو رہے ہیں۔ کس حکومت پر بدعنوانی کے الزامات نہیں لگائے جا رہے ہیں۔ کس کو دودھ کا دھلا کہیں گے آپ۔ جس سسٹم میں زندگی گزار رہے ہیں، اسے شاید بدلانا نہیں جاسکتا۔ آخر مصنفین ہی پر کیوں سمجھوتہ کرنے کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ جب کہ فلم انڈسٹری میں سب سے اتر جگہ مصنف کی ہے۔ یہاں شاستری نگر میں قبرستان ہے، جہاں مدھوبالا بھی دفن ہیں اور محمد رفیع بھی۔ اسی جگہ پر اپنے زمانے کے سب سے مشہور شاعر ساحر لدھیانوی کی قبر بھی ہے۔ محمد رفیع کی قبر گریناٹ کی ہے تو وہ بچی رہ گئی اور ساحر کی قبر کا پتہ بھی نہیں چلا کہ کہاں گئی۔ اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ کس کی کیا اہمیت ہے۔“ 5

نداء فاضلی کے نغموں کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان میں قاری اپنے دل کی دھڑکن صاف طور پر محسوس کرتا ہے اور وہ ان کو گنگناتے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ان کے نغمے دلوں میں عزم و استقلال کی کیفیات پیدا کرتے ہیں۔ ذیل میں ان کے دیگر فلمی نغموں کے علاوہ کچھ غیر فلمی غزلوں کو پیش کیا جاتا ہے جن سے انھوں نے فلمی و

ادبی دنیا میں ایک گہری چھاپ چھوڑی ہے:

گیت / غزل کے بول	فلم کا نام	گلوکار
ایسا ہوتا کیسا ہو	گہرا زخم	کشور کمار
بہت خوب صورت ہیں آنکھیں	ودھ	جگجیت سنگھ
چاہت ندیا چاہت ساگر	چاہت	اکا یا گنگ / ونود راٹھوڑ
دوپٹے کا پلو کدھر کا کدھر ہے	ترکیب	رتیچا شرما
گھر سے مسجد ہے بہت دور	تمنا	سونو نگم
ہر ایک رستہ سجا کے چل	امیر آدمی غریب آدمی	آشا بھوسلے
نہ وہ انکار کرتی ہے نہ	ہمالیہ پتر	اکا یا گنگ / ادت نارائن
جب سے قریب ہو کے چلے	لیلا	جگجیت سنگھ
تم سے مل کے زندگی کو	چور پولس	لتا منگیشکر
آئی زنجیر کی جھنکار خدا خیر کرے	رضیہ سلطان	کبن مرزا
کبھی پلکوں پہ آنسو کبھی لب پہ	ہرجائی	کشور کمار
سفر میں دھوپ تو ہوگی	کنواری بہو	شبیر کمار
بے نام سایہ در دھڑھکیوں نہیں جاتا	----	جگجیت سنگھ
گرج برس پیاسی دھرتی	----	جگجیت سنگھ
اپنی مرضی سے کہاں اپنے	----	جگجیت سنگھ

مذکورہ بالا فلمی نغموں میں آندافاضلی نے جو زبان استعمال کی ہے وہ سہلِ ممتنع کی بہترین مثال پیش کرتی ہے۔ ان میں کہیں بھی پیچیدگی یا الجھاؤ کا احساس نہیں ہوتا۔ انھوں نے جن مسائل و موضوعات کو اپنی شاعری کا محور بنایا ہے۔ وہ ان کے معاصرین میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ عصرِ حاضر کے حقائق کو انھوں نے اپنی شاعری کا ترجمان بنایا ہے۔

فلم ”تمنا“ کے اس گیت ”شب کے جاگے ہوئے تاروں“ پر سرفقے کا الزام لگایا جاتا ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ آندافاضلی نے مخدوم محی الدین کی نظم ”انتظار“ پر ڈاکہ ڈالا ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔ پوری نظم مخدوم

کی ہے، دو ایک لفظوں کی تبدیلی نڈافاضلی نے کی ہے اور پورا گیت نڈا کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے جو کسی بھی طرح سے ٹھیک نہیں ہے۔ مخدوم کے کلام کو اکثر فلموں میں فلمایا گیا ہے لیکن فلم ”تمنا“ میں مخدوم کی مذکورہ بالا نظم پر نڈا نے کھلے عام ڈاکہ ڈالا ہے۔ اس کے بعد مخدوم کے بیٹے نصرت محی الدین نے پروڈیوسر پوجا بھٹ، ڈائریکٹر مہیش بھٹ اور نغمہ نگار نڈافاضلی پر مقدمہ دائر کر ڈالا تھا۔ سرقے کی روایت برسوں سے چلی آرہی ہے مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ کسی بھی تخلیق کار کی تخلیق پر اس طرح ڈاکہ ڈالا جائے، جس طرح نڈا نے مخدوم کی نظم پر ڈالا ہے۔ میری رائے میں یہ نڈافاضلی کی اخلاقی بددیانتی ہے۔ اسی طرح فلم ”ہمالیہ پتر“ کے اس گیت ”نہ وہ انکار کرتی ہے نہ وہ اقرار کرتی ہے“ پر بھی سرقے کا گمان ہوتا ہے۔ اس گیت کو انھوں نے پاکستانی شاعر حسن رضوی کی غزل سے چرا لیا ہے:

نہ وہ اقرار کرتا ہے نہ وہ انکار کرتا ہے
ہمیں پھر بھی گماں ہے وہ ہمیں سے پیار کرتا ہے

حیرانی کی بات یہ ہے کہ نڈافاضلی جیسے باکمال شاعر اور گیت کار کو سرقے کی ضرورت کیوں آن پڑی۔ جو شاعر ”تو اس طرح سے میری زندگی میں شامل ہے“ جیسے لافانی اور بے مثال گیت خود تخلیق کرنے کا ہنر جانتا ہو، اسے سرقہ کرنے کی کیا ضرورت آن پڑی۔ نڈافاضلی زندگی کے آخری دور میں فلمی شاعری سے دور ہو گئے تھے۔ ذاکر خان ذاکر نے ان سے ایک انٹرویو میں پوچھا تھا کہ ”تو اس طرح سے میری زندگی میں شامل ہے“ اور ”ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے“ جیسے گیت لکھنے والا نڈافاضلی آج کہاں ہے؟ آپ آہستہ آہستہ منظر سے ہٹتے کیوں چلے گئے؟ نڈافاضلی نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا:

”بات دراصل یہ ہے کہ مجھے کافی دنوں کے بعد احساس ہوا کہ معجزوں میں تو بیک وقت کئی گھوڑوں کی سواری ممکن ہے لیکن حقیقتاً ایک سواری ایک ہی گھوڑے پر سواری کر سکتا ہے۔ ساحر لدھیانوی کامیاب فلم نغمہ نگار رہے ہیں لیکن دو مجموعوں کے علاوہ تیسرا مجموعہ نہیں آسکا۔ مجروح سلطان پوری کامیاب نغمہ نگار رہے ہیں، لیکن ایک مجموعے کے علاوہ دوسرا مجموعہ نہیں آسکا۔ ناکام رہنے والوں میں جاں نثار اختر بھی ہیں، جن کی کلیات ان دنوں حضرات سے دو گنی یا گنتی ہے۔ نڈافاضلی کی کتابوں کی اگر گنتی کی جائے تو ان کی گنتی ہی سے شاید اس سوال کا جواب ممکن ہو جو

آپ پوچھنا چاہتے ہیں۔“ 6

یہ حقیقت ہے کہ نڈافاضلی کا مجموعی فلمی سرمایہ ان شعرا سے زیادہ ہے۔ انھوں نے کئی سمتوں میں سفر کیا ہے۔ انھوں نے فلمی گانے بھی لکھے اور ڈائلاگ بھی، بی بی سی کے لیے کالم بھی لکھے اور مختلف اصناف میں طبع آزمائی بھی کرتے رہے۔ فلمی صنعت کے علاوہ وہ ٹیلی ویژن کی دنیا سے بھی جڑے رہے۔ ”نیم کا پیڑ“، ”جانے کیا بات ہوئی“، ”سیلاب“ اور ”جیوتی“ جیسے ٹی وی سیریلوں کے لیے انھوں نے ٹائٹل سانگس (Title Songs) بھی تحریر کیے ہیں۔

نڈافاضلی نے دیگر قلم کاروں کی طرح ثابت کر دیا ہے کہ جو اردو زبان و ادب جانتا ہے، وہ ایک بہترین نغمہ نگار اور کامیاب مکالمہ نگار بھی ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اپنے فلمی و غیر فلمی نغموں میں عشق و رومان، غم و مسرت، ہجر و وصال، بچوں کی لوریاں، حب الوطنی، حمد، پوجا، بھجن، دنیا کی بے ثباتی، جیسے موضوعات کو عمل میں لایا ہے۔ وہ فلم انڈسٹری میں اس لیے گئے تھے، کیوں کہ اس وقت یہی ان کے لیے آمدنی اور روزی روٹی کا ذریعہ تھی۔ انھوں نے فلمی غزلوں اور گیتوں میں کلاسیکی اردو زبان کی روایت اور اس کی شائستگی کو زندہ رکھا ہے جس کی بنا پر ان کا کلام ادبی دنیا اور عوامی سطح پر شہرت و مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ان کے فلمی گیتوں میں نہ صرف حسن و عشق کی وارداتیں نظر آتی ہیں بلکہ تغزل و تفکر کے حسین امتزاج کی نغمہ سرائی بھی پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں درد و کرب کا سیلاب اُمڈتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس میں عصری صداقت اور سماجی حقیقت کی چیخ و پکار سنائی دیتی ہے۔ ان کے یہاں کرب حیات دراصل انسانی اقدار یعنی محبت، انسان دوستی، امن، مساوات، آزادی وغیرہ کی ندابن کرا بھرتی ہے۔

اردو کے دیگر فلمی شاعروں کی طرح ان کی فلمی شاعری بالخصوص فلمی غزلوں میں انقلابی تفکر اور اپنے عصری دور کی زندگی کے تضادات، الجھنوں اور مسائل کا گہرا شعور ملتا ہے جو ان کی انفرادیت کو اجاگر کرتا ہے۔ ان کی ادبی شاعری کی طرح فلمی شاعری میں بھی نغمگی اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی حیات کے پُر پیچ سفر کے دوران فلم انڈسٹری کو بہت سے ہٹ (Hit) گانے دیے ہیں۔ نڈافاضلی کی فلمی خدمات کے سلسلے میں انھیں 2003 میں فلم ”سُر“ کی بہترین نغمہ نگاری کے لیے ”اسٹار اسکرین ایوارڈ“ (Star Screen Award) سے نوازا گیا۔ علاوہ ازیں اسی فلم کے بہترین نغمے ”آ بھی جا“ کے لیے انھیں ”بالی ووڈ مووی ایوارڈ“ (Bollywood Movie Award) سے سرفراز کیا گیا۔

ماہیے:

ماہیا پنجابی زبان کا لوک گیت ہے۔ یہ پنجابی لفظ ”ماہی“ سے مشتق ہے۔ بھینس چرانے والے کو پنجابی زبان میں ”ماہی“ کہا جاتا ہے۔ اس کو ”بگڑو“ اور ”پیا“ جیسے ناموں سے بھی جانا جاتا ہے لیکن یہ صنف ”ماہیا“ نام سے مقبول ہوئی۔ یہ بنیادی طور پر گائی جانے والی صنف ہے۔ اس کی اپنی مخصوص لے ہے۔ مختلف دھنوں میں گائے جانے کے باوجود اس میں ہر دھن کا اصل وزن واضح ہو جاتا ہے۔ ماہیا تین مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا پہلا اور تیسرا مصرع مساوی الوزن ہوتا ہے جب کہ دوسرا مصرع اس وزن سے ایک سبب یعنی دو حروف کم ہوتا ہے۔ ماہیے کے لیے جو دو اوزان اپنائے جاتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

فعلن فعلن فعلن

فعلن فعلن فع

فعلن فعلن فعلن

مفعول مفاعیلین

فعل مفاعیلین

مفعول مفاعیلین

اردو میں سب سے پہلے ہمت رائے شرمانے فلم ”خاموشی“ (1936) کے لیے ماہیے لکھے تھے۔ کچھ وقت تک یہ گمان کیا جاتا تھا کہ اردو میں سب سے پہلے چراغ حسن حسرت نے ماہیے کہے لیکن نئی تحقیق کے مطابق ہمت رائے شرما کو اس صنف کا بانی کہا جاتا ہے۔ ان کے چند ماہیے دیکھیے:

اک بار تو مل سا جن

آ کر زرا دیکھ

ٹوٹا ہوا دل سا جن

کچھ کھو کر پائیں ہم

دور کہیں جا کر

اک دنیا بسائیں ہم

چراغ حسن حسرت نے بھی ماہیہ کہے۔ لیکن وہ پنجابی ماہیہ کے وزن کی نزاکت کا خیال نہیں رکھ پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے تین یکساں مصرعوں کے ماہیہ لکھ دیے۔ انھوں نے فلم ”باغبان“ (1937) کے لیے جو گیت لکھا تھا وہ ماہیا کے طرز پر تھا۔ اس کے بعد فلم ”پھاگن“ آئی، جس کے ایک گیت میں قمر جلال آبادی نے پنجابی ماہیہ کے درست وزن کے مطابق اردو ماہیہ پیش کیے۔ ان ماہیوں کو محمد رفیع اور آشا بھونسلے نے اپنی آواز میں گایا تھا۔ اس حوالے سے قمر جلال آبادی کے چند ماہیہ پیش کیے جاتے ہیں:

تم روٹھ کے مت جانا
مجھ سے کیا شکوہ
دیوانہ ہے دیوانہ

کیوں ہو گیا بے گانہ
ترا مرا کیا رشتہ
یہ تو نے نہیں جانا

قمر جلال آبادی کے بعد اردو کے ممتاز شاعر ساحر لدھیانوی کا نام آتا ہے۔ انھوں نے فلم ”نیا دور“ کے لیے بہترین ماہیہ لکھے جن کو محمد رفیع نے اپنی آواز میں گایا تھا۔ اس ضمن میں ان کے ماہیہ پیش خدمت ہیں:

دل کے لیے دغا دیں گے
یار ہیں مطلب کے
یہ دیں گے تو کیا دیں گے

دنیا کو دکھا دیں گے
یاروں کے پسینے پر
ہم خون بہا دیں گے

ساحر لدھیانوی اور قمر جلال آبادی نے پنجابی ماہیہ کے وزن کے مطابق اردو ماہیہ لکھے کیوں کہ انھوں نے اردو ماہیہ لکھتے وقت پنجابی ماہیہ کو کسی عروضی حوالے سے سمجھنے کے بجائے اسے اس کی دھن کے

ذریعے سمجھنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ قمر جلال آبادی کو بھی کچھ وقت تک اردو کا پہلا ماہیا نگار ہونے کا شرف حاصل تھا جب کہ ڈاکٹر مناظر عاشق کی نئی تحقیق کے مطابق ہمت رائے شرما کو اردو کا پہلا ماہیا نگار قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی تائید کرتے ہوئے حیدر قریشی اپنی کتاب ”اردو ماہیہ کی تحریک“ میں لکھتے ہیں:

”۔۔۔ تمام شواہد اور حقائق کی بنیاد پر یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ قمر جلال آبادی اور ساآر لدھیانوی سے بھی پہلے اردو ماہیہ کے درست وزن کا اولین اظہار ہمت رائے شرما جی نے 1936 میں کیا تھا۔ تحقیقی اور تاریخی لحاظ سے انھیں چراغ حسن حسرت کے ثلاثی گیت پر بھی اولیت اور فوقیت حاصل ہے۔ سو بلا شک و شبہ ہمت رائے شرما جی اردو ماہیہ کے بانی ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہر گانوی اس انکشاف اور دریافت پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔“ 7

اس کے بعد ماہیہ کی لوک لے کے مطابق اس کے وزن کی بحث چلی۔ پھر اس کے مزاج اور موضوع پر مباحثہ ہوا جس کے نتیجے میں اس کے خط و خال نمایاں ہوئے۔ ان مباحث کی موافقت اور مخالفت میں بہت سارے ادیبوں اور شاعروں نے حصہ لیا، جن میں افتخار احمد، ناصر عباس نیر، عرش صدیقی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہر گانوی، سعید شباب، ریاض احمد، نثار ترابی اور غزالہ طلعت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس حوالے سے حیدر قریشی کے موقف کو بڑے پیمانے پر سراہا گیا۔ اس کے بعد اردو شعرا درست وزن کی ماہیا نگاری کی طرف مائل ہو گئے۔

جہاں تک ماہیا کے موضوعات کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ محبت اس کا بنیادی اور محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ اس کے تحت اس میں محبوب کے حسن کی تعریف، پیار کے اظہار اور اقرار، عہد و پیمان، ملن اور جدائی، گلے شکوے اور چھیڑ چھاڑ جیسے مضامین پیش کیے جاتے ہیں۔ شادی بیاہ کے مختلف جذبات، دیہاتی ماحول اور دھرتی سے وابستگی بھی اس کے اہم موضوعات بنتے ہیں۔ ان موضوعات کے علاوہ حمد، نعت، منقبت، میلے ٹھیلے، بزرگان دین کی تعریف، روزمرہ زندگی کے معاملات و مسائل بھی ماہیہ میں بیان کیے جاتے ہیں۔ عوام کے دل میں سما جانے والے مزاج کے باعث ماہیا فکر سے زیادہ جذبے کو اہمیت دیتا ہے۔ یہ عوامی گیت اپنی ظاہری صورت میں انفرادی ہونے کے باوجود اپنے سماج

کی ترجمانی کرتا ہے۔

نَدَافِضَلٰی نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلیات میں کل بارہ (12) ماہیے ملتے ہیں جو ان کے پانچویں شعری مجموعے ”شہر میرے ساتھ چل“ میں شامل ہیں۔ انھوں نے پنجابی کے درست وزن کے مطابق ماہیے کہے ہیں۔ ان کے ماہیے مختلف موضوعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے چند ماہیے ملاحظہ فرمائیں:

پاگل ہے مراقی ہے

مردہ ہے نہ زندہ

یہ بچہ عراقی ہے

اللہ کہاں ہے تو؟

پھر بھی جہاں ہے تو

کیا سچ ہے وہاں ہے تو؟

ہر دوار پہ میلا ہے

دوار کے پیچھے تو

ہر کوئی اکیلا ہے

کیا خوب زمانہ ہے

جتنی حقیقت ہے

اتنا ہی فسانہ ہے

حق گوئی کا حامی ہے

نالائیں ہیں سب اس سے

آئینہ حرامی ہے

مذکورہ بالا ماہیوں میں نَدَافِضَلٰی نے مختلف مضامین برتے ہیں۔ ان کے ماہیوں میں سیاسی، سماجی اور

روزمرہ زندگی کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے اگرچہ تعداد کے لحاظ سے بہت کم ماحیے کہے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ان میں اپنا معیار برقرار رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

حواشی:

- 1۔ نڈا فاضلی کے گیت، ڈاکٹر پریمی رومانی، مشمولہ سہ ماہی عالمی میراث، ص: 28
- 2۔ عصر حاضر کا منفرد گیت کار، ڈاکٹر پریمی رومانی، مشمولہ اعتراف، ص: 193
- 3۔ میرا تخلیقی سفر، نڈا فاضلی، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 47
- 4۔ زمین، جو کہیں دھوپ کہیں سایہ ہے، کنہیا لال نندن، مشمولہ سہ ماہی اردو، ص: 19
- 5۔ ہم نے عام آدمی کی زبان کو قبول ہی نہیں کیا، سہیل وحید، مشمولہ نیا دور، ص: 29
- 6۔ نڈا فاضلی کا آخری انٹرویو، ڈاکٹر خان ذاکر، روزنامہ انقلاب
- 7۔ اردو ماہیہ کی تحریک، حیدر قریشی، ص: 125

﴿مَاحْصَلُ﴾

ادب اپنے دور کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس آئینے میں ہمیں خارجی ماحول اور زندگی کا بنتا بگڑتا ہوا عکس روز روشن کی طرح صاف نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خارجی عوامل ادیب و شاعر کی زندگی سے اس طرح جڑ جاتے ہیں کہ وہ کبھی حصولِ مسرت کا جو یا ہوتا ہے تو کبھی افسردگی اور غم کی تصویر بن جاتا ہے۔ وہ سماج سے فطری طور پر خود کو منسلک کر لیتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے آئینے میں پوری کائنات کا عکس دیکھتا ہے اور مسرت و غم کا محاسبہ کرتا ہے۔ وہ حیرت و غم کی دولت کو مساوی اصول پر سماج میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔

آئے دن حادثات و واقعات جنم لیتے ہیں۔ فن کار ان حادثات و واقعات کو خود سے الگ نہیں رکھتا بلکہ ان سے کسی نہ کسی طرح حسیاتی اور جذباتی طور پر منسلک اور ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ فن کار بھی عام انسان کی طرح اپنے ماحول و معاشرہ اور مخصوص نظامِ تمدن کا فرد ہوتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے تجربات و مشاہدات کو عام انسان کی بہ نسبت زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔ پھر سنجیدگی سے غور و فکر کرتا ہے اور اپنی فکر و نظر کے اظہار کے لیے کوئی نہ کوئی فنی وسیلہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ وہ جس ماحول اور معاشرے کا پروردہ ہوتا ہے اس پر اثر انداز بھی ہوتا ہے اور اثر پذیر بھی۔ معاشرے کا فرد ہونے کے رشتے سے فن کار سماجی انسلالات سے بے خبر نہیں رہتا ہے۔ فن کار چوں کہ زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس لیے وہ نہ تو خاموشی سے تجربات کو جھپکتا ہے اور نہ ہی مشاہدات کو نظر انداز کرتا ہے بلکہ احساس کی سطح پر غور و فکر کے مراحل سے گزرتا ہے اور پھر کسی نتیجے پر پہنچ کر اپنے فکر و خیال کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح حیات اور معاشرے کے انسلالات فن کے آئینے میں نمود پذیر ہوتے ہیں۔

شعر و ادب کا مقصد بالعموم یہ ہے کہ انسان کے جذبہ تجسس کو تسکین کے مواقع فراہم کیے جائیں اور مسرت و بصیرت میں اضافہ ہو۔ فن کار اپنے تجربات و مشاہدات کی سطح پر داستانِ زندگی اور رودادِ کائنات کی پیش کش میں ان اسرار و رموز کی نشان دہی کرتا ہے جن کا تعلق حیات و کائنات کے مسائل سے وابستہ ہے۔ شاعر و ادیب کا ذہن جب تخلیق کی جانب راغب ہوتا ہے تو وہ اپنے افکار و خیالات کو شعر و ادب کے قالب میں ڈھالنے کے لیے موزوں و مناسب الفاظ و استعارات کا انتخاب کرتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کی تخلیق میں فنی اعتبار سے وہ بلندی اور ہمہ گیری پیدا نہیں ہوگی جو اعلا ادب کا طرہ امتیاز ہے۔

نہاد فاضلی کا شمار اردو کی ان بلند قامت و ہمہ جہت شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو ادب کو مختلف حیثیتوں سے متاثر کیا ہے۔ وہ اپنی متنوع دل چسپیوں کی بدولت ادبی اور سماجی حلقوں میں کافی مشہور و

معروف تھے۔ وہ بیک وقت ایک اچھے شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ ایک گیت کار بھی تھے اور مترجم بھی۔ جس چیز کی وجہ سے وہ ادبی دنیا میں سب سے زیادہ جانے اور پہچانے جاتے ہیں، وہ ان کی شاعری ہے۔ شاعری میں ان کا اصل میدان غزل اور نظم ہے۔

نڈا فاضلی کا اصل نام مقتدی حسن ہے۔ لیکن وہ اردو شعر و ادب میں نڈا فاضلی کے نام سے مشہور ہوئے۔ نڈا ان کا تخلص ہے جس کے معنی ”صدایا آواز“ کے ہوتے ہیں۔ نڈا فاضلی کے نام سے مشہور ہونے والے مقتدی حسن کی تاریخ پیدائش میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق نڈا فاضلی کی پیدائش 12 اکتوبر 1938 کو دہلی میں ہوئی۔

نڈا فاضلی کا بچپن بڑے ہنگامہ خیز ماحول میں گزرا۔ انھوں نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ افرا تفری اور سیاسی انتشار کا زمانہ تھا۔ پورے ملک میں سیاسی انتشار اور بالچل کا زمانہ تھا۔ ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورا بھارت مذہبی، علاقائی اور تہذیبی لڑائی سے دوچار تھا۔ ہندوستانی لوگ تقریباً اپنی دو سو سالہ آزادی کی لڑائی کا ثمر آور حل چاہتے تھے اور اس کے قریب بھی آگئے تھے۔ جہاں ایک طرف آزادی قریب تھی وہیں دوسری طرف ہندوستان کے بیچ ایک خونی لکیر کھینچ رہی تھی جس نے ہندوستان کے ہر فرد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہندوستان کے ہر فرد کے ساتھ نڈا فاضلی اور ان کا خاندان بھی اس آگ کی لپیٹ میں آگئے۔ ان سب حادثات کا اثر ان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری پر بھی پڑا۔

نڈا فاضلی کو شاعری کا فن وراثت میں ملا تھا۔ ان کے گھر پر اکثر شعری نشستوں کا انعقاد ہوتا تھا۔ جس سے ان میں شعری ذوق پیدا ہو۔ اسی ذوق نے ان میں شعر کہنے کا ہنر پیدا کیا۔ انھوں نے محض 13 سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ وکٹوریہ کالج (گوالیار) میں طالب علمی کے زمانے میں ان کی ہم جماعت لڑکی (مس ٹنڈن) کا اچانک انتقال ہو جاتا ہے۔ نڈا فاضلی پر اس حادثے کا بہت گہرا اثر ہو جاتا ہے۔ اس شدید کرب کا اظہار وہ شاعری میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کو مناسب الفاظ نہیں مل پاتے۔ اسی زمانے میں ایک ڈوبتی ہوئی شام وہ کسی پہاڑی پر واقع ایک مندر سے سوراخ کے بھجن کو سنتے ہیں۔ بھجن کے بول کچھ اس طرح کے تھے:

”مدھوبن تم کت رہت ہرے

ورہ دیوگ شیا مندر کے ٹھاڑھے کیوں نہ جڑے

کون کاج کھڑے رہے بن میں، کیوں نہ اُکٹی پرے“

(مدھو بن تم کیسے ہرے بھرے ہو۔ میں تو اپنے شیانم کے فراق میں جل رہی ہوں اور تم پر کوئی اثر نہیں ہے۔ میری طرح تم بھی اس آگ میں کھڑے کھڑے کیوں نہیں جل گئے۔ تمہارے اس طرح کھڑے رہنے کا کیا کارن ہے۔ اتنے بھاری غم میں تم جڑ سے کیوں نہیں اکھڑ گئے۔) اس بھجن سے متاثر ہو کر نندا فاضلی کئی مہینے خاموش رہنے کے بعد شاعری کی طرف مائل ہو گئے۔

نندا فاضلی نے بھرپور اور مصروف ادبی زندگی گزاری۔ انھیں ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں کئی انعامات و اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ 1998 میں ان کے شعری مجموعے ”کھویا ہوا سا کچھ“ پر انھیں ساہتیہ اکادمی انعام سے سرفراز کیا گیا۔ 2002 میں انھیں غالب ایوارڈ برائے نثر سے نوازا گیا۔ 2003 میں نندا فاضلی کو فلم ”سُر“ کے بہترین نغمہ نگار کے لیے اسٹار اسکرین ایوارڈ (Star Screen Award) دیا گیا۔ 2003 میں ہی انھیں Bollywood Movie Award سے نوازا گیا۔ مدھیہ پردیش حکومت نے 2004 میں انھیں اپنے سب سے بڑے ادبی ایوارڈ ”شکھر سمان“ سے سرفراز کیا۔ 2013 میں نندا فاضلی کو حکومت ہند کی طرف سے پدم شری ایوارڈ (Padmashri Award) سے نوازا گیا۔ نندا فاضلی کو امیر خسرو ایوارڈ کے علاوہ میر تقی میر ایوارڈ بھی ملا۔ اردو اکادمی لکھنؤ کی جانب سے 2016 کا اول انعام مشترکہ طور پر نندا فاضلی اور اجمل سلطان پوری کو دیا گیا۔ انھیں دہلی سے جے دیال ہارمونی ایوارڈ برائے شاعری سے بھی سرفراز کیا گیا۔ نثری کتاب ”ملاقاتیں“ پر انھیں ایم پی شاسن ساہتیہ پریشد پرسکار دیا گیا۔ اس کے علاوہ ان کی شاعرانہ صلاحیت کے اعتراف میں مختلف ریاستوں نے انھیں انعامات و اعزازات سے نوازا جن میں مہاراشٹر، اتر پردیش، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، راجستھان اور بہار قابل ذکر ہیں۔

نندا فاضلی کا شمار اردو کے ان جدید شعرا میں ہوتا ہے جنہیں ترقی پسند تحریک کے دم توڑنے کے بعد شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایک طرف ان کی شاعری روایت سے توانائی حاصل کرتی ہے تو دوسری جانب جدیدیت سے یاری بھی نبھاتی ہے۔ ایک طرف ان کی شاعری میں ترقی پسند تحریک کے اثرات دکھائی دیتے ہیں تو دوسری جانب اسی تحریک کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نندا کی شاعری کو روایت، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی اصطلاحی خانہ بندیوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اتنا

ضرور ہے کہ انھوں نے ان تحریکات و رجحانات سے اکتساب فیض کیا۔

نڈافاضلی فروری 2016 کے پہلے ہفتے میں ”جشن لکھنؤ“ کے مشاعرے میں شرکت کے لیے لکھنؤ گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے لوٹے تو ٹھنڈ نے انھیں بری طرح جکڑ لیا تھا۔ دو دن تک وہ بخار اور زکام میں مبتلا رہے، اس کے بعد ان کی طبیعت مسلسل بگڑتی گئی۔ آخر کار ان کا انتقال 8 فروری 2016 کو ممبئی میں دل کا دورہ پڑنے سے ہوا۔ نڈافاضلی 77 سال، 3 مہینے اور 27 دن کی عمر گزارنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہو گئے۔

اس کو رخصت تو کیا تھا مجھے معلوم نہ تھا
سارا گھر لے گیا گھر چھوڑ کے جان والا

نڈافاضلی اپنی تحریروں اور اپنی شاعری سے ہمارے ذہن و دل میں اس طرح سے رچ بس گئے ہیں کہ صدیوں تک انھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

نڈافاضلی نے اپنی شاعری کے ذریعے حب الوطنی، بھائی چارے اور امن کو فروغ دیا۔ انھوں نے انسانیت کے درد کو اپنا درد سمجھ کر اظہار کے نئے پیرائے تراشے۔ وہ انسان کے اندر انسانیت کو دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ انسان کو مذہب اور فرقے میں تقسیم ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی شاعری انسان کے اندر محبت اور بھائی چارگی پیدا کرنے کی طرف مائل کرتی ہے۔ ان کے نزدیک رنگ، نسل یا مذہب کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق کرنا روا نہیں ہے۔ اس ضمن میں ان کا یہ شعر دیکھیے:

کوئی ہندو، کوئی مسلم، کوئی عیسائی ہے
سب نے انسان نہ بننے کی قسم کھائی ہے

نڈافاضلی کے معاصرین میں فضیل جعفری، زبیر رضوی، محمد علوی، عادل منصوری جون ایلیا، احمد فراز، منیر نیازی، ظفر اقبال، بشیر بدرد، محمود سعیدی، عرفان صدیقی، افتخار عارف اور بمل کرشن اشک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

نڈافاضلی نے نظم و نثر دونوں میں اپنے قلم کی سیاہی صرف کر دی۔ اس کے علاوہ انھوں نے فن ترجمہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔ اردو شاعری میں ان کے قلم سے سات مجموعے تحریر ہوئے جب کہ اردو نثر میں ان کی پانچ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ہندی میں بھی ان کی کئی کتابیں منصہ شہود پر آ چکی ہیں۔ نڈافاضلی کا

کلیات ”شہر میں گاؤں“ کے نام سے 2012 میں شائع ہوا جس کی اشاعت معیار پبلی کیشنز دہلی سے عمل میں آئی۔ ان کا کلیات 662 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ان کے 6 شعری مجموعے شامل ہیں۔ اس کلیات میں 6 شعری مجموعوں کے علاوہ ”کچھ اور“ کے نام سے 34 صفحات پر مشتمل غزلیں اور نظمیں بھی شامل ہیں۔ ”کچھ اور“ میں 19 غزلیں اور 8 نظمیں موجود ہیں۔ نذافاضلی کا آخری شعری مجموعہ ”سب کا ہے ماہتاب“ ان کے کلیات میں شامل نہیں ہے کیوں کہ اس مجموعے کی اشاعت ”شہر میں گاؤں“ کے دو سال بعد عمل میں آئی۔ ”شہر میں گاؤں“ میں غزلوں کی تعداد 160 اور نظموں کی تعداد 219 ہے۔ گیتوں کی تعداد 36 ہے جب کہ دوہوں کی تعداد 64 ہے۔ اس کے علاوہ اس کلیات میں 12 مایہ بھی موجود ہیں۔ ان کے نثری سرمائے میں دس نامور شعرا اور ادبا سے لیے گئے انٹرویوز کا مجموعہ ”ملاقاتیں“، دو جلدوں پر مشتمل خودنوشت ”دیواروں کے بیچ“ اور ”دیواروں کے باہر“، ان کے دور کے متوفی شعرا کا تذکرہ ”چہرے“ اور دیگر ہم عصر شاعروں، ادیبوں، فلمی شخصیات اور متفرق موضوعات پر لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ ”دنیا میرے آگے“ شامل ہیں۔

”ملاقاتیں“ نذافاضلی کی پہلی نثری تصنیف ہے۔ یہ کتاب 1986 میں منصہ شہود پر آئی۔ یہ کتاب 152 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اردو زبان و ادب کے دس نامور شعرا و ادبا سے اپنی ملاقاتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی خوبیوں کو ہی بیان نہیں کیا بلکہ ان کی خامیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اشتہاروں کے ذریعے اس کی شہرت ہوئی اور ادبی حلقوں میں شور و غل پیدا ہوا۔ یہ کتاب شائع ہونے کے بعد بھی کافی دنوں تک بحث کا موضوع بنی رہی۔ اس کتاب کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں نذافاضلی نے سفاکانہ طور پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جس سے بہت سے لوگ خفا بھی ہو گئے۔ اس کتاب میں انھوں نے مشاہیر ادب سے جو سوالات قائم کیے ہیں ان سے ان مشاہیر کے فکرو فن اور نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔

”دیواروں کے بیچ“ نثر میں نذافاضلی کی سب سے اہم تصنیف ہے جسے قارئین اور ناقدین نے یکساں طور پر سراہا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے جنم سے لے کر اپنے خاندان کے پاکستان ہجرت کرنے تک کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ ”دیواروں کے بیچ“ اپنے اندر زبان کی ندرت اور اسلوب کی بے پناہ کشش رکھتی ہے۔ اس کتاب میں ایک حزن نیک کیفیت شروع سے آخر تک اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔

اس کیفیت کے باعث اس میں شعریت بھی در آئی ہے۔ ندانے کہیں کہیں جو اشعار یا نظموں کے ٹکڑے اس میں بروئے کار لائے ہیں ان پر پیوند کاری کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ اردو کی خود نوشتوں یا سوانحی ناولوں میں یہ کتاب اپنے منفرد اسلوب اور بے باکانہ اظہار کے سبب کافی عرصے تک یاد رکھی جائے گی۔ دراصل یہ ایک مخلص انسان کی زندگی اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا کی روداد ہے۔ ندافاضلی کی یہ نثری کاوش بے حد دلچسپ، معلوماتی، فکر انگیز اور قابل مطالعہ تخلیق ہے۔ اس کاوش سے ان کا منصب بلند ہوا ہے۔

”دیواروں کے باہر“ ندافاضلی کا سوانحی ناول ہے۔ یہ اردو نثر میں ان کی تیسری تصنیف ہے۔ اس کی اشاعت 2000 میں ہوئی۔ یہ سوانحی ناول 239 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں انھوں نے اپنی پیدائش سے لے کر چھ دہائیوں تک کے اپنے تجربات و مشاہدات کا حال بیان کیا ہے۔ انھوں نے راوی بن کر اپنے بیانیے میں خود کو ضمیر غائب میں پیش کرنا پسند کیا ہے۔ ان کی سوانح میں بے جا مبالغے اور تصنع کا عمل دخل نہیں ملتا۔ اس ناول میں وہ کرداروں کے درمیان گوالیار کی گلیوں میں گھوم پھر کر تلاشِ معاش کے سلسلے میں دہلی پہنچتے ہیں۔ ندافاضلی نے اس ناول میں ترقی پسندی، تقسیم ہند، جدیدیت، سیاست اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے تغیر زمانہ، بدلتی ہوئی انسانی سوچ، امیری غربی کے مسائل، مذہبی عقائد، زندگی کے مختلف تقاضے وغیرہ جیسے مسائل کو استعاراتی اور علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی زبان نہایت شگفتہ اور اسلوب توانا اور جان دار ہے۔ ندافاضلی نے جس بے باکی اور ایمان داری سے فن کاروں اور مشہور ہستیوں پر قلم اٹھایا ہے وہ ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔

”چہرے“ ندافاضلی کی چوتھی نثری تصنیف ہے۔ یہ کتاب 2002 میں معیار پہلی کیشنز، دہلی کے توسط سے منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب 216 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے مشاعروں کے شاعروں کے خاکے قلم بند کیے ہیں۔ اس میں انھوں نے یاد رفتگاں کے طور پر ایسے شاعروں کی زندگی کے حالات اور فن کے بارے میں لکھا ہے، جو اس کتاب کے تحریر کیے جانے کے وقت تک وفات پا چکے تھے۔ اس کتاب میں ندافاضلی نے 23 شعرا کے خاکے تحریر کیے ہیں۔ اس کتاب کے کئی شاعروں کی شہرت تو صرف ان کے دور کے مشاعروں ہی کے دم سے قائم تھی۔ سہا مجددی، اسد بھوپالی، تاباں جھانسونی، فیاض الدین فیاض اور شمیم فرحت وغیرہ کا کلام تو ان کی زندگی میں کتابی صورت میں یکجا بھی نہیں ہو پایا تھا اور آج

بھی ان میں سے کئی شاعروں کے شعری مجموعے دستیاب نہیں ہیں۔ ایسے میں نندا کی کتاب ”چہرے“ کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کی انھوں نے ان شاعروں کی شخصیت، فن اور سوانح کی تفصیلات کو سمیٹ کر اس کتاب میں محفوظ کر لیا۔ انھوں نے اس کتاب میں جن چہروں کی تصویر کشی کی ہے ان میں چھوٹی چھوٹی باتوں میں حیرت انگیز نکتوں کی فراوانی، انسانی نفسیات کی گرہ کشائی، تقابلی اشارے، دلچسپ مشاہدات، مزاح کی رنگینی اور چھیڑ چھاڑ وغیرہ کی چاشنی بڑے دلچسپ انداز میں ملتی ہے۔ نندا فاضلی نے ”چہرے“ میں مشاعروں کے شاعروں کے خاکے اس طرح بیان کیے ہیں کہ جیسے ہم اپنی آنکھوں سے ان شاعروں کو دیکھ رہے ہیں۔

”دنیا میرے آگے“ نندا فاضلی کی پانچویں اور آخری نثری تصنیف ہے جو 2008 میں معیار پہلی کیشنز دہلی سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب 160 صفحات پر مشتمل ہے۔ نندا نے ہندی کے قارئین کے لیے ایک کتاب ”تماشا میرے آگے“ لکھی تھی جو 2006 میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں ابتدائے کے علاوہ 31 مختصر مضامین شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر مضامین میں انھوں نے اپنے ہم عصر ادیبوں اور فن کاروں کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ اس کتاب میں شامل چند مضامین کا تعلق متفرق موضوعات سے ہے۔ نندا فاضلی نے اس کتاب کا نام غالب کے ایک شعر سے اخذ کیا ہے۔ شعر دیکھیے:

باز بچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

”دنیا میرے آگے“ ان کی ہندی کتاب ”تماشا میرے آگے“ کا اردو ورژن ہے۔ اس کتاب میں بھی ابتدائے کے علاوہ 31 مضامین شامل ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کتاب کے اکتیس مضامین میں سے دو مضامین بدلے ہوئے ہیں۔ وہ اس طرح کہ ہندی ایڈیشن میں شامل ’ایک تھے خمار بارہ بنکوی‘ اور ’ایک تھے انور صابری‘ کو ہٹا کر ان کی جگہ یہاں ’عصمت‘، چار حرفوں کا نام‘ اور ’یادوں کا شہر‘ (گوالیار) کو شامل کر لیا گیا ہے۔ نندا فاضلی نے اپنی کتاب ”دنیا میرے آگے“ میں اپنے مخصوص انداز میں اپنے ہم عصر بزرگوں اور دوستوں کو ان کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ نہایت بے باکی سے بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جانے پہچانے فن کاروں کا ذکر اور نندا کے افسانوی انداز نے اس کتاب کو دل چسپ ہی نہیں بلکہ یادگار بھی بنا دیا ہے۔

نَدَافَضلی فن ترجمہ نگاری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انگریزی ادب سے ان کو ایک خاص انسیت تھی۔ انھوں نے جاپانی، روسی، پرتگالی، چینی، اطالوی، پولش اور مشرقی افریقہ کے شاعروں کی نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ نظموں کا ترجمہ کرنے سے پہلے نَدَافَضلی نے ان شاعروں کا مختصر تعارف بھی پیش کیا ہے۔ ان ترجموں میں انھوں نے یہ کوشش کی ہے کہ ان میں اصل زبان کی چاشنی برقرار رہے۔

راقم الحروف نے نَدَافَضلی کی غزلیہ شاعری کو جانچنے، پرکھنے اور سمجھنے کے لیے مختلف موضوعات کے تحت تقسیم کیا ہے۔ جیسے عشق و رومان، سیاسی مسائل، سماجی مسائل، رشتوں کی اہمیت، یاد، تنہائی، عصر حاضر کے مسائل، مشترکہ تہذیب، قومی یکجہتی، گھر، آدمی، سفر، بچہ، مذہبی مسائل، تصورِ خدا وغیرہ۔ ان کے یہاں عشق کی مختلف کیفیات کا بیان ملتا ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے یہاں غمِ عشق کی جلتی خاموش شمع کا ذکر بھی ملتا ہے اور عشق کے پرخطر راستوں کا بیان بھی۔ ان کا دل افسردہ بھی ہے اور خوش بھی۔ کبھی وہ زخم خوردہ عاشق کے روپ میں نظر آتے ہیں تو کبھی بیدارِ عشق سے بہت دور دکھائی دیتے ہیں۔ وہ عشق کی آگہی اور عرفان سے بہ خوبی واقف ہیں۔ وہ عشق کے درد کی اہمیت سمجھنے میں کبھی بھی غفلت سے کام نہیں لیتے ہیں۔

دل میں نہ ہو جرأت تو محبت نہیں ملتی
خیرات میں اتنی بڑی دولت نہیں ملتی

نَدَافَضلی کی شاعری کا ایک اہم پہلو سیاسی و انقلابی رہا ہے۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ انھوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ افراتفری کا دور تھا، تقسیمِ ہند کا المیہ سامنے تھا جس کے اثرات ملک کے عام انسانوں پر بھی پڑے۔ وہ تقسیمِ ہند اور فسادات سے پیدا شدہ صورتِ حال سے بہ خوبی واقف تھے۔ ایسے حالات میں نَدَافَضلی بھلا چپ کہاں بیٹھتے۔ انھوں نے سیاسی مسائل پر قلم اٹھایا جس سے ان کی شاعری کا دائرہ اور بھی زیادہ وسیع ہو گیا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عام انسانوں پر ہو رہے ظلم و ستم کو بے باکی سے بیان کیا۔

ہر ایک گھر میں دیا بھی جلے اناج بھی ہو
اگر نہ ہو کہیں ایسا تو احتجاج بھی ہو

نڈافاضلی کا احتجاج سماج کے خلاف بھی ہے اور اپنوں کے خلاف بھی۔ وہ ہر مورچے پر ظلم و جبر کے خلاف اپنی صدا بلند کرتے ہیں کیوں کہ وہ پورے معاشرے کو خوش حال دیکھنا چاہتے ہیں۔ جہاں وہ زمنوں پر مرہم کے تمتائی ہیں وہیں صحرا میں ٹھنڈی چھاؤں کے متلاشی بھی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ جب تک سماج میں تبدیلی نہیں آئے گی تب تک عوام پر ظلم و ستم ہوتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عوام کو اپنی شاعری کے ذریعے بیدار کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ وہ اکثر سوچتے تھے کہ کیا وجہ ہے کہ دونوں (ہندو مسلم) کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت کے جذبات فوری طور پر بھڑک جاتے ہیں؟ اس سوال پر انھوں نے گہرائی سے سوچا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ سیاست دانوں نے اپنے سیاسی مفادات کے لیے لوگوں کو آپس میں لڑایا اور عوام بغیر سوچے سمجھے ان کی سازشوں کا شکار ہوتے رہے۔ ہمارے ادبا و شعرا ان ظالم سیاست داں حکمرانوں کے خلاف لکھتے آرہے ہیں جنھوں نے انسان اور انسانیت کا قتل کیا ہے اور ان کی لاش پر چل کر اپنی حکومت کا قصر تعمیر کرایا ہے۔ تقسیم ملک کے کچھ ہی برسوں بعد فسادات کے پیش نظر نڈافاضلی کا خاندان پاکستان منتقل ہو گیا مگر نڈافاضلی نے پاکستان جانے کے بجائے ہندستان میں رہنے کو ترجیح دی۔ ان کا ماننا تھا کہ زمین کی تبدیلی مسائل کا حل نہیں تھا۔ ان کا نظریہ تھا کہ ہمارے مسائل اسی وقت دور ہو سکتے ہیں جب ہم اس متزلزل معاشرے میں رہ کر اپنی کاوشوں سے ان مسائل کا حل تلاش کریں گے۔ اس کم عمری میں فسادات کے حل سے متعلق گہری فکر ان کی دوراندیشی اور ذہانت کا پتہ دیتی ہے۔ فسادات کی وجہ سے انسان پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا ہے اور ہر طرف گلی کوچوں کو سنسان کر دیا گیا ہے۔ عورتوں کی عصمت دری کی گئی، معصوم بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا اور سارے شہر کو خوف و دہشت کا منظر بنا دیا گیا۔ نڈافاضلی نے اس صورت حال کو اپنی شاعری میں جا بہ جا بیان کیا ہے۔

سماج کے حالات و واقعات پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔ انھوں نے سماجی اور معاشرتی زندگی کے توسط سے ایک منفرد انداز نگارش اپنایا ہے۔ آج جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ ایک مہذب سماج میں نہیں ہونا چاہیے۔ آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ اس صورت حال میں انسان کرے بھی تو کیا کرے۔ وہ اپنے لبوں کو حرکت بھی نہیں دے سکتا ہے کیوں کہ حالات اتنے خراب اور سنگین ہیں کہ لب کھولنا گویا آفت مول لینا ہے۔ اب کسی میں ہمت نہیں کہ برائی کے خلاف آواز اٹھائے۔ جرم کے خلاف اپنی صدا سے حکمرانوں کے در و دیوار ہلائے۔ ان سنگین حالات میں نڈافاضلی کی آواز فہم و ادراک کے پردوں کو چاک

کرتی ہوئی، احساس کو جگاتی ہوئی اور قلب کو گرماتی ہوئی نمودار ہوتی ہے۔ آج کافن کار اپنے سیاسی، سماجی اور اقتصادی ماحول کی وجہ سے ذہنی انتشار اور تناؤ کا شکار ہے۔ اس کو گھر میں اور نہ گھر سے باہر چین و سکون حاصل ہوتا ہے۔ بے چینی اور بے قراری اب اس کے ساتھ مستقل ہو گئی ہے۔ زندگی میں اسے ٹھہراؤ نظر نہیں آتا، ثبات کا احساس بھی نہیں ہو رہا۔ یہ ساری چیزیں جدیدیت کی دین ہیں۔ رشتوں میں بھی اب درار ہے۔ اب وہ پیار، محبت، ہمدردی اور بھائی چارہ نہیں رہا جو پرانے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ ہمارے سماج کی حالت ایسی ہو گئی ہے کہ اب ہمسایوں کے درمیان دیواریں کھڑی ہو گئی ہیں۔

نڈا ایک ایسے فن کار ہیں جن کی تخلیقات میں ہندوستانی مشترکہ تہذیب موج دریا کی مانند رواں دواں ہے۔ ہندوستانی مٹی کی بوباس اور اس کی خوشبو کی مہک ان کی شاعری میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ نڈا فاضلی اپنے معاصرین میں اس لیے منفرد ہیں کہ انھوں نے ہندوستانی تہذیب، وحدانیت، بھگتی اور تصوف کے فکری عناصر کو اپنی ذات میں سمو لیا تھا۔ وہ مذہبی منافرت، فرقہ بندی اور دہشت گردی کے شدید مخالف تھے۔ ان کے ادبی فکر و نظر میں قدیم روایات، تاریخ، ثقافت اور تہذیب کی یکجائی کی صورتیں بہت واضح نظر آتی ہیں۔ ان کے نزدیک ہندو مسلم برابر ہیں۔ اللہ، رام، کرشن کنہیا میں کوئی فرق نہیں وہ سب کا نام ایک ساتھ لیتے ہیں۔ ان کی شاعری کا خمیر ہندوستان کی مٹی سے اٹھا ہے۔ وہ کبیر اور میرا کے نقش قدم پر چلنے والے شاعر ہیں۔ انھوں نے انسان کے وقار کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا۔ حق و صداقت کا پرچم بلند کرنا ان کا شیوہ بن گیا تھا۔ انھوں نے اپنے جذبات و احساسات اور تجربات و مشاہدات کو بڑی بے باکی اور غیر جانبداری سے پیش کیا۔ انھوں نے اپنے افکار و خیالات سے جمود کا طلسم توڑ کر ایک نیا جہاں آباد کیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے انسانیت کا پیغام دیا۔ وہ ہندو مسلم میں ایکتا کے خواہش مند تھے۔

نڈا فاضلی کی شاعری میں ان کے بچپن کی یادوں کا کرب نظر آتا ہے۔ یہی یادیں ان کی شاعری کی اساس بنیں اور ان کی شاعری میں پختگی آ گئی۔ اپنوں سے بچھڑ جانے کا احساس ان کی شاعری کا متحرک پہلو ہے۔ ان کی غزلیں قنوطیت کے منفی پہلو سے بالاتر ہو کر رجائیت کے مثبت میلان کی غماز ہیں۔ اسی لیے ان کے اشعار ناامیدی میں بھی امید کی کرن بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی شاعری دراصل ان کی زندگی کے تجربات و مشاہدات کا آئینہ ہے۔ ان کی شاعری میں ناامیدی کی کیفیت نہیں ملتی بلکہ زندگی گزارنے کا ایک ایسا طرز ملتا ہے جو عام آدمی کو بھی نامساعد حالات میں جینے کا حوصلہ اور سلیقہ عطا کرتا ہے۔ نڈا فاضلی اپنی

شاعری سے کچھ ایسا دانشمندانہ سمجھوتا کرتے ہیں کہ احساس اور فکر پر جینے کا ایک نیا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک اہم پہلو ان کی مثبت سوچ (Positive Thinking) ہے جو ان کی شاعری کو موثر اور جاندار بناتی ہے۔ عصرِ حاضر میں یوں تو آدمی خود اپنی ذات کے حصار میں قید ہے لیکن نڈافاضلی کو یقین ہے کہ یہ صورتِ حال ہمیشہ نہیں رہے گی۔ حالات ایک دن ضرور بدلیں گے اور ہواؤں کا رخ تبدیل ہوگا۔ اسی مثبت سوچ کو لے کر وہ نئے چراغ جلانے اور پھر سے آشیاں بنانے کے عمل میں جڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعے مشورہ بھی دیتے ہیں اور حوصلہ شکنی بھی کرتے ہیں:

اب وقت بچا ہے کتنا جو اور لڑیں دنیا سے
دنیا کی نصیحت پر بھی تھوڑا سا عمل کر دیکھیں

تنہائی ایک پیچیدہ اور ناخوش گوار جذباتی ردِ عمل ہے جو سماجی اکیلے پن کی وجہ سے ابھرتا ہے۔ آج کی مصروف دنیا میں تنہائی ایک ٹریجڈی بن گئی ہے۔ اب حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ انسانوں کی بے تحاشا بھیڑ میں بھی انسان خود کو تنہا اور اکیلا محسوس کرتا ہے۔ اپنوں کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بھی اس کو فرصت نہیں اور نہ ہی ان کے دکھ درد میں شریک ہونے کی مہلت ہے۔ اخلاقی قدریں پامال ہو رہی ہیں۔ سماجی و تہذیبی صداقتوں کی دیواریں کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ تنہائی، بیگانگی اور اکیلا پن سماج و معاشرے کی صداقت بنتی جا رہی ہیں۔ یہ تنہائی، بیگانگی اور اکیلا پن صرف خارجی ہی نہیں بلکہ داخلی جذبات کو بھی محیط ہے۔ نڈافاضلی نے اس ہجومِ بیکراں میں انسان کی تنہائی اور مایوسی کے کرب کو اپنی غزلیہ شاعری میں یوں بیان کیا ہے:

ہر طرف ہر جگہ بے شمار آدمی
پھر بھی تنہائیوں کا شکار آدمی

تنہائی، اجنبیت اور کمشدگی کا احساس ان کی غزلیہ شاعری میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مایوسی، ناکامی، خوف و ہراس اور خود شکستگی جیسے عناصر عصرِ حاضر کی غزل میں شامل ہیں۔ یہی عناصر نڈافاضلی کی غزلوں میں اپنا کردار بہ خوبی ادا کر رہے ہیں۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعے قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ اس بات سے بہ خوبی واقف تھے کہ دنیا میں انسان کے پاس جو دھن، دولت اور عیش و عشرت ہے، سب کچھ یہیں چھوڑنا ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو مصروف رکھتا ہے۔ کبھی کبھی یہ مصروفیت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ موت کے کتنے نزدیک ہے۔ دنیا راہِ فنا

میں کسی کا ساتھ نہیں دیتی۔ چاہے کوئی بڑا ہو یا چھوٹا، بہادر ہو یا بزدل، امیر ہو یا غریب، غرض سب کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ دنیا میں کتنے بڑے بڑے بادشاہ اور دولت مند گزرے ہیں لیکن آج ان کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ گورکن جو دوسروں کے لیے قبریں کھودتا ہے۔ وہ بھی اپنے کام میں اتنا مصروف ہو جاتا ہے کہ جیسے اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔ حالاں کہ وہ بھی قضا کی قطار میں کھڑا ہے لیکن اسے اس بات کا احساس ہی نہیں ہے۔ اس مضمون کو نفاضلی نے اپنے ایک شعر میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ برتا ہے۔

مصروف گورکن کو بھی شاید پتہ نہیں

وہ خود کھڑا ہوا ہے قضا کی قطار میں

نفاضلی کے یہاں خدا کا تصور محدود نہیں ہے بلکہ وہ خدا کی ذات کو مقدم تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا خدا ہر مخلوق کا خدا لگتا ہے۔ یہ خدا صرف مسلمان، ہندو، عیسائی یا یہودی کا خدا نہیں ہے بلکہ انسانوں کا خدا ہے۔ جو لوگ خدا کی خرید و فروخت کرتے ہیں یا اس کی تجارت کرتے ہیں۔ ایسے ڈھونگی مذہبی لوگوں کو نفاضلی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے خدا کی تمام مخلوقات سے عشق کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کا خدائی تصور مندر و مسجد کے حصاروں سے بہت بلند نظر آتا ہے۔ ان کی نظر میں خدا کی بندگی کے لیے مؤذن کی اذان، پنڈت کی پوجا، مزدور کی ہیا ہیا اور چڑیوں کی چہکار میں کوئی فرق نہیں ہے۔

نفاضلی کی غزلیہ شاعری میں رشتوں کی افادیت و اہمیت پر کافی زور ملتا ہے۔ آج جب رشتوں میں دوریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایسے وقت میں بھی وہ اپنی شاعری کے ذریعے رشتوں کو استوار کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ”گھر“ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ گھر سے بے گھر ہونا ہے۔ بے گھر ہو جانے کا احساس اور در بدری کا کرب ان کے حواس پر تا عمر چھایا رہا۔ ان کا کہنا ہے کہ بے گھری ان کا ذاتی انتخاب نہیں تھا بلکہ اس انتخاب کی وجہ ان کے والدین کی گوالیار سے پاکستان ہجرت تھی۔ جب انسان کو سب سے زیادہ ضرورت اس کے گھر والوں کی ہوتی ہے اگر اسی وقت گھر والے اس کو چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو جائیں تو بہت ساری پریشانیاں اس کو جھیلنا پڑ سکتی ہیں۔ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ بے گھری کا عذاب اس وقت ان کا نصیب بنا جب انھیں گھر والوں کی اشد ضرورت تھی:

گھر سے نکلے تو ہو سوچا بھی کدھر جاؤ گے

ہر طرف تیز ہوائیں ہیں بکھر جاؤ گے

”آدمی“، نذافاضلی کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ آج آدمی بے بس نظر آتا ہے کیوں کہ آج آدمیت اور انسانیت کی بے حرمتی ہر طرف ہو رہی ہے۔ نذافاضلی آدمی کی بے حرمتی سے بہت مایوس ہو جاتے ہیں۔ وہ آدمی کی عظمت سے واقف ہیں۔ ”آدمی“ ان کے یہاں ایک تلازمے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے ہر طرح کے اشعار قلم بند کیے ہیں۔ آدمی کی تنہائی، اس کی بے چارگی، اس کی بے چینی و بے قراری، اس کا خانوں میں بٹ جانا، اس کا بوجھ اٹھانا، کڑی محنت کرنا اور جینا مرنا جیسی کیفیات کو انھوں نے بڑے فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ دراصل نذافاضلی کا یہ آدمی نامہ نظیر اکبر آبادی کے آدمی نامہ کی توسیع بھی ہے اور تکمیل بھی۔ جہاں سب کچھ حاصل کرنے کے بعد آخری سانس تک کچھ پالینے کا انتظار آنکھوں میں ہے۔ آج انسان کو انسان سے ہی خطرہ لاحق ہے۔ یہ بھی سچائی ہے کہ آج کا انسان شام ہونے کے ساتھ اگلی صبح کا انتظار نہیں کرتا کیوں کہ حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ پتا نہیں کل اسے میسر ہو یا نہ ہو۔ جس طرف بھی ہم نظر دوڑاتے ہیں، کسی نہ کسی صورت میں انسان پریشان حال نظر آتا ہے۔ انسان تمام عمر سفر میں رہتا ہے۔ ایک کام پورا ہوتے ہی اس کے ذہن میں دوسرا کام کرنے کی خواہش ابھرنے لگتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ انسان کی خواہشات کی تکمیل کبھی نہیں ہوتی۔ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے وہ پوری عمر گنوا بیٹھتا ہے۔ اس طرح ہر وقت بے چینی اور بے قراری اسے ستاتی رہتی ہے۔ نذافاضلی نے اس سچائی کو سادہ الفاظ میں شعر کا جامہ پہنا کر پیش کیا ہے:

زندگی کا مقدر سفر در سفر
آخری سانس تک بے قرار آدمی

نذافاضلی نے عالمی سطح پر عصری حسیت کی بہترین عکاسی کی ہے۔ آج جس طرح سے طاقت کے بل بوتے پر دنیا کے کچھ ممالک انسانی زندگیاں برباد کرتے جا رہے ہیں، اس سے اخلاقی قدروں کا زوال ہو رہا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری میں اپنے عہد کے تمام پیچیدہ مسائل کو بڑی بے باکی سے پیش کیا ہے۔ آج انسانوں کی ترقی یافتہ دنیا اور مہذب سماج نے انسانی حیات اور اس کی داخلی کائنات کو کسبِ معاش کے مسائل سے متاثر کیا ہے۔ اس طرح انسان اپنی مقامی زمین سے دور جانے پر مجبور ہوا ہے۔ شہروں میں کسبِ معاش کا مسئلہ تو اس نے حل کر لیا مگر اسے اپنے دیس کی خوشبو کا فقدان ستاتا رہا۔ جب اس نے پنجرہوں میں پرندے بند پڑے دیکھے تو اسے اپنے پرسکون ماحول کی یاد نے ستایا، جس میں اس نے پیڑوں اور درختوں پر

پھدکتی چڑیوں کو دیکھا تھا۔ اس المیے کو نذا فاضلی نے صفحہ قرطاس پر یوں بکھیر دیا ہے:

جنگل سے محفوظ تھا پنجرہ لیکن اسی حفاظت میں

کھلی فضا کا ایک پرندہ پروں سے اڑنا بھول گیا

نذا فاضلی کی غزلیہ شاعری کے مطالعے سے یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں کو کسی ایک زاویے تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان کے یہاں ہر طرح کے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے سماج میں تبدیلی لانے کے خواہش مند تھے۔ ان کی شاعری آج کے حالات پر بہترین تبصرہ ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں فکر و آگہی کے جوہر دکھائے ہیں۔ وہ اپنے دور کے انتشار سے بہت متاثر ہوئے۔ عصری مسائل نے انھیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اسی کے سبب ان کی شاعری میں فکر و آگہی، ندرت خیال، تجربات و مشاہدات اور جذبات و احساسات کا پرتو نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو ہندستانی تہذیب سے ہم آہنگ کر کے ایک نیا تصور پیش کیا۔ ان کی شاعری گزرتے ہوئے وقت اور حالات کا آئینہ ہے۔ ان کی شاعری زندگی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر اپنا سفر طے کرتی ہے۔ ان کا اختصاص یہ ہے کہ وہ فلسفہ حیات و مرگ کے متفرق پہلوؤں، احساس کے مختلف رنگوں اور انسان کے مختلف جذبوں کو شعری قالب میں کچھ اس طرح ڈھالتے ہیں کہ ان کی ہر تخلیق قاری کے فہم و ادراک کو مسرور و محصور کرتی ہے۔ انھوں نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت زبان، موضوع اور فکر کے اعتبار سے ادب میں تجربے ہو رہے تھے۔ اس دور میں جدیدیت کے زیر اثر ابھرنے والے علامتی اور تجریدی رجحان کے تحت انھوں نے تجربے کے طور پر کچھ اشعار کہے جو اس زمانے میں کافی مشہور ہوئے اور ساتھ ہی بدنام بھی۔ جدیدیت کے عروج کے زمانے میں ان کے اس شعر پر بہت چرچا ہوا:

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا

کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہو گئی

مذکورہ بالا شعر پر کافی بحث و مباحثہ ہوا۔ بعض معترضین کا کہنا تھا کہ اگر یہی جدیدیت ہے تو اس سے بچنا چاہیے۔ اس شعر کو مضحکہ خیز بھی کہا گیا۔ کسی نے اس شعر کو فیشن پرستی کہا تو کسی نے اسے مبہم شعر سے تعبیر کیا۔ کئی ادبی محفل میں یہ شعر موضوع بحث رہا۔ نذا نے اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ دیہاتوں میں صبح کی آمد کا اعلان مرغ اپنی بانگ سے کرتا ہے، جس سے عموماً لوگ بیدار ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس

شہروں میں فلیٹ میں رہنے والوں کو صبح ہونے کا پتہ ہی نہیں چلتا، دن چاہے جتنا گزر گیا ہو۔ ان کے فلیٹ کی کھڑکی کے پردے اگر گرے ہوئے ہوں تو انھیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ دن کتنا گزر چکا ہے۔

نڈا فاضلی کی غزلوں میں ہندی شاعری کا واضح اثر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ہندی شعرو ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اپنے ابتدائی دنوں میں وہ جس حلقے میں رہے وہ ہندی ادیبوں اور شاعروں کا حلقہ تھا۔ جدید غزل کی تشکیل میں انھوں نے اہم کردار نبھایا ہے۔ جدید دور کے پیدا شدہ مسائل سے انسان کا ذہن انتشار کا شکار ہو گیا ہے۔ خوف و دہشت، بغاوت، اجنبیت، مایوسی، تنہائی اور اقدار کی پامالی وغیرہ کو انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے ملک اور بیرون ملک میں بھی اپنی شاعرانہ صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔

نڈا فاضلی کی غزلوں کا اسلوب نیا ہونے کے ساتھ ساتھ غیر معمولی بھی ہے۔ انھوں نے سادہ اسلوب، قادر الکلامی، ندرت خیال اور سچے جذبات و احساسات سے اپنی غزلوں کا دامن تاب دار موتیوں سے بھر دیا ہے۔ انھوں نے اپنے معاصرین میں اپنا اسلوب سب سے جدا رکھا اور ایسی لفظیات کا استعمال کیا جو سادہ ہونے کے ساتھ عام فہم بھی تھی۔ انھوں نے نئی لفظیات اور موضوعات کے تنوع سے اپنی الگ شناخت قائم کی۔ زبان اور لفظیات کی سطح پر بھی انھوں نے الگ روش اپنائی۔ ان کے یہاں کلاسیکیت کا رچاؤ بھی ہے اور جدیدیت کا رنگ بھی ہے۔ عرفان صدیقی، محمد علوی اور ظفر اقبال کے برعکس نڈا فاضلی لوک ادب اور ہندی شاعری سے بھی کسب فیض کرتے ہیں۔ یہی وصف انھیں امتیازی شان عطا کرتا ہے۔ وہ مزاج سے باغیانہ، سرشت سے رندانہ اور رواج سے صوفیانہ نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں سورج، شہر، سفر، بچہ، فرشتے، تنہائی، گھر، مندر، مسجد، چراغ، پپیل، فاختہ، آدمی وغیرہ جیسی لفظیات کو بروئے کار لایا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو دل کش اور مؤثر بنانے کے لیے تشبیہات و استعارات اور صنعتوں کا استعمال کیا ہے۔

نڈا فاضلی نے اپنی غزلیہ شاعری میں عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ انھوں نے صاف، سلیس اور سادہ الفاظ میں اپنی بات قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی زبان میں تصنع نہیں ہے۔ ان کی شاعری کا حاوی رنگ سادگی و پرکاری ہے۔ ان کی زبان شیریں ہے۔ دراصل انھوں نے اپنی شاعری میں صوفی سنتوں کی زبان اور گھر آنگن میں بولی جانے والی زبان کو وسیلہ اظہار بنایا۔ انھوں نے اردو شاعری

کی روش کو بعض نئی جہت دینے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ جدیدیت سے وابستگی کے باعث اور اپنے لب و لہجے کی ندرت کو قائم رکھنے کے سبب ان کے یہاں ایسے الفاظ، ترکیبیں اور کہیں کہیں مصرعے بھی آگئے ہیں جن میں ان کے لب و لہجے کی اختراعی قوت اور سلامت روی کلی طور پر قائم نہیں رہ سکی۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں زندگی کی صداقتوں اور انسانی رشتوں کی نزاکتوں کو نہایت عمدگی اور فنی مہارت کے ساتھ برتا ہے۔ اردو کی جدید شاعری نڈا فاضلی کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔

راقم الحروف نے مطالعے کی آسانی کے لیے نڈا فاضلی کی نظموں کو مختلف موضوعات میں منقسم کیا ہے جیسے عشقیہ موضوعات، سماجی و آفاقی موضوعات، فرقہ وارانہ فسادات اور سیاسی موضوعات، مذہبی موضوعات، ہندوستانی تہذیب اور رشتوں کی اہمیت وغیرہ۔ نڈا فاضلی سیکولر ذہن کے شاعر ہیں۔ انھوں نے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شہرت و مقبولیت پائی۔ ان کا شمار اپنے دور کے صفِ اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری عوامی عناصر، غنائیت اور انسان دوستی کے رویے کی وجہ سے عوام و خواص میں مشہور و مقبول ہے۔ ان کی شاعری میں احساس کی لطافت اور فکر کی گہرائی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی غزلوں کی طرح ان کی نظموں میں بھی موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں قدرتی مناظر سے ہم آہنگی کا احساس بھی ملتا ہے۔ وہ اپنی نظمیں شاعری میں سوز و غم، ظلم و ستم اور حالات کے جبر کو بڑے فن کارانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظمیں شاعری میں خیال و احساس کو جس خوبی سے بیان کیا ہے، وہ اپنے آپ میں منفرد ہے۔ ان کی نظموں میں تہذیبی و ثقافتی نقوش کی مرقع کشی نظر آتی ہے۔ زندگی کے تمام رموز اور محرکات کو وہ اپنی نظموں کا موضوع بناتے ہیں۔ ان کی شاعری تصنع سے کوسوں دور دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس کا اظہار اپنی شاعری میں کیا۔ انھوں نے روایتی موضوعات کو نئے اسلوب میں پیش کیا ہے۔

نڈا فاضلی نے اپنی نظمیں شاعری میں جو عشقیہ موضوعات سمیٹے ہیں، وہ غم اور نشاط کی ہم آہنگی سے ایک نئی دنیا کی تعمیر کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں حسن و عشق کی ظاہری و باطنی دونوں کیفیات کو بروئے کار لایا ہے۔ ان کی رومانی نظموں کا غائر مطالعہ کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ان میں جنسی جذبہ نہیں ابھرتا بلکہ شائستگی اور پاکیزگی ابھرتی ہے۔ ان کی رومانوی نظموں میں ”وقت سے پہلے“، ”ایک خط“، ”اسے سمندر بلا رہا ہے“، ”شکایت“، ”بے خبری“، ”فاصلہ“، ”دیوانگی رہے باقی“، ”انتظار“، ”سمجھوتا“، ”ایک مسکراہٹ“ اور ”چھوٹی سی ہنسی“ قابل ذکر ہیں۔ ان کی رومانی نظموں میں اختر شیرانی یا دوسرے شعرا

جیسی رومانیت نہیں ہے بلکہ ان میں ایک طرح کا انتشار پایا جاتا ہے۔ نیز ان نظموں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ زندگی سے جڑی پریشانیوں، الجھنوں، روزمرہ کی ضرورتوں، اس سے جڑے مسائل کا سامنا اور ان کے حل کی تلاش بھی پائی جاتی ہے۔

نڈافاضلی نے سماجی مسائل کو اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔ نیز قومی و بین الاقوامی موضوعات و مسائل پر بھی اپنے قلم کی سیاہی صرف کی ہے۔ انھوں نے سماج میں ہونے والی نا انصافیوں کے خلاف کھل کر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی نظموں میں سماجی شعور کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کی نظمیں ”نئے گھر کی پہلی نظم“، ”گلاب کا پھول“، ”پیسے کا سفر“، ”سماجی شعور“، ”کامیاب آدمی“، ”انتشار“، ”تماشا“، ”سونے سے پہلے“ وغیرہ سماجی موضوعات پر مشتمل ہیں۔

نڈافاضلی نے اپنی شاعری میں قومی یکجہتی اور قومی ایکتا کے پیغام کو واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح مشترکہ تہذیب کو بھی انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی نظموں میں بھائی چارگی اور مذہبی رواداری کا علم کافی اونچا نظر آتا ہے۔ ان کی نظم ”مردہ گھر میں بٹوارہ“ بھائی چارہ اور قومی یکجہتی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کو انھوں نے جس طرح اپنی نظموں میں پیش کیا ہے وہ انھیں اپنے معاصرین میں انفرادیت عطا کرتی ہے۔ انھوں نے کبیر اور نظیر اکبر آبادی کی طرح اپنی شاعری میں قومی یکجہتی کا تصور پیش کیا۔

نڈافاضلی نے اپنے زمانے کے چند تلخ تجربات اور حادثات کو موضوع بنا کر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے سیاسی موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات اور سیاسی مسائل پر مشتمل نظموں میں ”ایک قومی رہنما کے نام“، ”جنگ“، ”پہچان“، ”رنگ محل“، ”ستمبر 1965“، ”ایک لٹی ہوئی بستی کی کہانی“، ”پاسپورٹ آفیسر کے نام“، ”شرط“ اور ”انسان“ وغیرہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

نڈافاضلی کی شاعری بالخصوص نظموں میں ہندوستانی تہذیب کی روح نظر آتی ہے۔ گاؤں کی مٹی کی بو باس اور خوشبو ان کی نظموں کی فضا کو معطر کر دیتی ہے۔ انھیں اپنے وطن کے ندی نالوں، پہاڑوں، جنگلوں، جھاڑیوں، ہرے بھرے کھیت کھلیانوں، درختوں، پرندوں وغیرہ سے پیار ہے۔ گاؤں سے وابستگی دراصل ان کے خون میں شامل ہے۔ ان کی نظمیں لوگوں کے جذبات و احساسات، ان کے رسم و رواج، رہن سہن اور ہندوستانی تہذیب کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔ ”ایک دن کی سیر“، ”سردی“، ”پہلا پانی“، ”نیا دن“،

”چھوٹے شہر کی رات“، ”میرا شہر“، ”برسات“، ”نیا روگ“، ”مجھے یاد ہے“، ”دوسہیلیاں“، ”بمبئی“، ”پکھلتا دھواں“، ”سحر“، ”گھٹن“، ”جیب کٹنے کے بعد“، ”کسان“ وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔

ندا فاضلی کی شاعری میں خاندانی رشتوں کی اہمیت پر کافی زور ملتا ہے۔ گھر اور رشتوں کے تصور کو انھوں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ ان کی ایک نظم ایسی ہے جس کو بڑے بڑے نقادوں نے سراہا ہے۔ غزل کے فارم میں ان کی اس نظم کا عنوان تو نہیں ہے لیکن اس کو ”ماں“ کا عنوان دیا جاسکتا ہے۔ اس نظم کو اردو کی چند بہترین نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے والد کو اپنی ایک نظم میں موضوع بنا کر انھیں خراج تحسین پیش کیا۔ جب ان کے والد کا انتقال کراچی میں ہوا تو دونوں ہمسایہ ملکوں میں سرحدی کشیدگی کے باعث وہ اپنے والد کے جنازے میں شامل نہیں ہو سکے۔ اس سانحے کو انھوں نے اپنی نظم ”والد کی وفات پر“ میں پیش کیا ہے۔

ندا فاضلی کے دوہے فنی پختگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کے تمام دوہے ماتراؤں کے شماری نظام پر کھرے اترتے ہیں۔ انھوں نے دوہوں میں بھی آسان اور سادہ الفاظ کا انتخاب کیا جس سے ان کے دوہے بوجھل محسوس نہیں ہوتے۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں اپنے مزاج کے اعتبار سے رنگ آمیزی کی ہے۔ یہی رنگ آمیزی کبیر اور سورداس کے یہاں پائی جاتی ہے۔ اس رنگ آمیزی میں انھوں نے اپنی زبان اور لہجے کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کا شمار ہندستان میں دوہانگاری کے ارتقا میں دلچسپی رکھنے والے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے دوہے قاری کو زندگی کے اسرار و رموز کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان کے دوہے فن کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ ان کے دوہوں کی بندش نہایت چست ہے۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں روزمرہ زندگی کے عام مسائل کو موضوع بنایا ہے:

میں رویا پردیس میں، بھیگا ماں کا پیار
دکھ نے دکھ سے بات کی، بن چھٹی بن تار

ندا فاضلی کی پہچان اگرچہ ان کی شاعری سے ہے۔ لیکن دوہانگاری میں بھی انھوں نے کافی شہرت و مقبولیت پائی۔ ان کے قلم سے لکھے ہوئے دوہے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں مقبول ہوئے۔ ان کے دوہوں میں طبقاتی جبر، مذہبی باغیانہ پن اور سماج کے مظلوم طبقے کی حمایت کے ساتھ ساتھ سماجی پستی کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دوہوں میں قدرتی حسن سے پیار، تہذیب و تمدن سے

محبت، نفسیاتی حقائق، رندی و سرمستی، عقل پرستی کا نعرہ اور مسرت و شادمانی کی تلاش جیسے موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انھوں نے دوہوں میں اپنے تجربات، مشاہدات، جذبات و احساسات کو جس بے باکی سے پیرایہ اظہار عطا کیا وہ ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔

نذرا فاضلی نے ایک گیت کار کی حیثیت سے بھی کافی شہرت و مقبولیت پائی۔ انھوں نے بہت سی فلموں کے لیے گیت لکھے ہیں۔ ان کے گیت عوام و خواص میں مشہور و مقبول ہیں۔ انھوں نے گیتوں میں بھی سادہ الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ فلمی شاعروں اور گیت کاروں کے درمیان رہ کر بھی انھوں نے ایک باوقار قلم کار کی زندگی گزاری۔ انھوں نے کبھی بھی شعری روایت اور فنی تقاضوں کو پامال نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنے گیتوں میں مضامین کی رنگارنگی اور نئی سوچ و فکر کو پیش کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لکھے ہوئے گیت سامعین و قارئین کے دلوں میں گھر کر لیتے ہیں۔ وہ راجندر سنگھ بیدی کے توسط سے فلمی دنیا میں آئے۔ انھوں نے نغمہ نگاری کو صرف روزی روٹی کے لیے اپنایا۔ اس کے باوجود وہ یہاں بھی اپنا معیار قائم رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے گیتوں میں بھی زندگی کے مسائل، گاؤں، شہر کی تہذیب کو برقرار رکھا ہے۔ انھوں نے ان میں نیا رنگ پیدا کر کے ایسی فضا کی تشکیل کی جو انسانی ذہن کو معطر کر دیتی ہے۔ گیت کی صنف کو فروغ دینے میں انھوں نے فعال کردار نبھایا ہے۔ ان کے گیت خوش نما اور سریلے ہوتے ہیں۔

نذرا فاضلی نے غزلیں، نظمیں، دوہے اور گیت لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ فلم انڈسٹری میں بھی انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ انھوں نے فلموں کے لیے جو نغمے لکھے ان کو بہت پسند کیا گیا۔ اس سفر کا آغاز انھوں نے فلم ”رضیہ سلطان“ سے کیا جس میں انھوں نے دو نغمے تحریر کیے۔ دراصل فلم ساز کمال امر وہی اس فلم کے نغمے جاں نثار اختر سے لکھوا رہے تھے کہ اچانک ان کا انتقال ہو گیا اور یہ ذمہ داری نذرا فاضلی کو سونپی گئی۔ انھوں نے اس فلم کے لیے جو دو نغمے تحریر کیے ہیں وہ کافی مقبول ہوئے۔ یہ 1980 کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد وہ فلم انڈسٹری میں اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے اپنے نغموں میں معیار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان کے نغموں کی کامیابی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ بڑے بڑے گلوکاروں نے ان کو اپنی آواز سے سجایا ہے۔ ان کے گیتوں میں ادب کی چاشنی، شعریت، تغزل اور ترنم سب کچھ پایا جاتا ہے۔ جگجیت سنگھ، محمد رفیع، کشور کمار، کمار شانو، سونو نگم، الکا یا گنک، شریا گھوشال، لتا منگیشکر، سنیدھی چوہان، آشا بھونسلے، ادت نارائن، شان، ہمیتا، کبن مرزا، کویتا کرشنا مورتی اور بھوپندر جیسے گلوکاروں نے ان کے

نغموں کو اپنی آواز سے سجایا ہے۔ جگجگیت سنگھ کے ساتھ ان کے گہرے مراسم تھے۔ انھوں نے ان کے ساتھ ایک البم (Insight) بھی بنایا تھا جو کافی مقبول ہوا تھا۔ ان کے نغمے آج بھی بڑے ذوق و شوق سے سنے اور پسند کیے جاتے ہیں۔

اردو کے دیگر فلمی شاعروں کی طرح ان کی فلمی شاعری بالخصوص فلمی غزلوں میں انقلابی تفکر اور اپنے عصری دور کی زندگی کے تضادات، الجھنوں اور مسائل کا گہرا شعور ملتا ہے جو ان کی انفرادیت کو اجاگر کرتا ہے۔ ان کی ادبی شاعری کی طرح فلمی شاعری میں بھی نغمگی اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی حیات کے پُر پیچ سفر کے دوران فلم انڈسٹری کو کئی معروف گانے دیئے ہیں۔

نہدافاضلی نے ماہیا جیسی صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی کلیات میں کل بارہ (12) ماہیے ملتے ہیں جو ان کے پانچویں شعری مجموعے ”شہر میرے ساتھ چل“ میں شامل ہیں۔ انھوں نے پنجابی کے درست وزن کے مطابق ماہیے کہے ہیں۔ ان کے ماہیے مختلف موضوعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

اللہ کہاں ہے تو؟

پھر بھی جہاں ہے تو

کیا سچ ہے وہاں ہے تو؟

مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نہدافاضلی نے نظم و نثر میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ان کی آواز عصر حاضر کی مقبول اور معتبر آواز ہے۔ ان کی شاعری میں زندگی کی سچائیاں نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری ان کی زندگی سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ ہندوستانی سماج پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کی شاعری کا خمیر اپنے سماج اور معاشرے سے اٹھا ہے۔ وہ غیر مانوس الفاظ سے اجتناب کرتے ہیں اور سادہ و آسان الفاظ کا استعمال کر کے اپنی شاعری کو دل کش اور پُر اثر بناتے ہیں۔ تنگ نظری اور فرقہ واریت کو وہ پسند نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ اس سے کوسوں دور نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری ایکتا، رواداری، بھائی چارہ اور یکجہتی کا پیغام دیتی ہے۔ نہدافاضلی اور ان کے معاصرین اپنے عہد کے تجربوں میں شریک رہے، ایک جیسے مسائل سے دوچار رہے لیکن نہدافاضلی نے اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اپنی ایک الگ دنیا بنائی جہاں کسی اور کا حکم نہیں چلتا۔ انھوں نے نظم و نثر میں جس خوبی اور مہارت سے کام لیا ہے، اس سے ان کے معاصرین عام طور پر محروم نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تنوع کے ساتھ ساتھ مفکرانہ شان بھی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے منفرد

اسلوب سے اپنی انفرادیت قائم کی۔ وہ موضوع اور لہجے کو ہم آہنگ کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی شاعری میں فکر کی گہرائی اور آفاقیت نظر آتی ہے۔ زندگی کے مسلسل سفر میں نڈا فاضلی جن تجربات و مشاہدات سے دوچار ہوئے، وہ پوری طرح سے ان کی شاعری میں روشن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری آج بھی زندہ ہے اور اس کا مستقبل تاب ناک دکھائی دیتا ہے۔

﴿کتابیات﴾

﴿کتابیات﴾

بنیادی ماخذ:

- (1) نَدَافِ ضَلٰی، آنکھ اور خواب کے درمیان، نئی آواز پبلی کیشنز، نئی دہلی، 1986
- (2) نَدَافِ ضَلٰی، چہرے، معیار پبلی کیشنز، دہلی، 2002
- (3) نَدَافِ ضَلٰی، دنیا میرے آگے، معیار پبلی کیشنز، دہلی، 2008
- (4) نَدَافِ ضَلٰی، دیواروں کے باہر، معیار پبلی کیشنز، دہلی، 2000
- (5) نَدَافِ ضَلٰی، دیواروں کے بیچ، معیار پبلی کیشنز، دہلی، 1992
- (6) نَدَافِ ضَلٰی، زندگی کی طرف، نئی کتاب پبلشرز، نئی دہلی، 2007
- (7) نَدَافِ ضَلٰی، سب کا ہے ماہتاب، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2014
- (8) نَدَافِ ضَلٰی، شہر میرے ساتھ چل تو، نئی آواز جامعہ نگر، نئی دہلی، 2004
- (9) نَدَافِ ضَلٰی، شہر میں گاؤں، معیار پبلی کیشنز، دہلی، 2012
- (10) نَدَافِ ضَلٰی، کھویا ہوا سا کچھ، معیار پبلی کیشنز، دہلی، 1996
- (11) نَدَافِ ضَلٰی، لفظوں کا پل، نیورائٹرس پبلی کیشنز، ممبئی، 1969
- (12) نَدَافِ ضَلٰی، ملاقاتیں، نیورائٹرس پبلی کیشنز، ممبئی، 1971
- (13) نَدَافِ ضَلٰی، مورناچ، نیورائٹرس پبلی کیشنز، ممبئی، 1978

ثانوی ماخذ:

- (1) اختر انصاری، غزل اور غزل کی تعلیم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2010
- (2) اختر انصاری، غزل کی سرگذشت، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2000
- (3) اسیم کاویانی، نَدَافِ ضَلٰی، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 2018
- (4) انیس اشفاق، اردو غزل میں علامت نگاری، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1995
- (5) اومکار کول / مسعود سراج، اردو اصناف (نظم و نثر) کی تدریس، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی

دہلی، 2010

- (6) حفیظ رحمانی، آئینہ تلفظ، ادارہ ادب اسلامی ہند، دہلی، 2005
- (7) حیدر قریشی، اردو ماہیہ کی تحریک، فرہادی پبلی کیشنز، راولپنڈی، 1999
- (8) حیدر قریشی، اردو میں ماہیانگاری، فرہادی پبلی کیشنز، اسلام آباد، 1997
- (9) خالد علوی، ڈاکٹر، غزل کے جدید رجحانات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2006
- (10) خلیل الرحمن اعظمی، نئی نظم کا سفر (1936 کے بعد)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2011
- (11) خواجہ اکرام، ڈاکٹر، اردو کی شعری اصناف، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
- (12) راحت بدر، ڈاکٹر، جدید اردو غزل (1971-2010)، ایم آر پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2011
- (13) رشید احمد صدیقی، جدید غزل، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2010
- (14) رشید حسن خان، انشا اور تلفظ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2011
- (15) ساجد حسین انصاری، ڈاکٹر، شہریار: حیات و خدمات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2014
- (16) سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (آغاز سے 2010 تک)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2013
- (17) سمیع اللہ اشرفی، ڈاکٹر، اردو شاعری میں دوہے کی روایت، اردو بک سینٹر، علی گڑھ، 1990
- (18) سید احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2014
- (19) سیفی سرونجی، ڈاکٹر، نفاذی کا تخلیقی سفر، اسٹار گرافکس اور پرنٹرس، ایم پی، 2010
- (20) شمس الرحمن فاروقی، اردو غزل کے اہم موڈ، غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین، نئی دہلی، 1997
- (21) شمس الرحمن فاروقی، تنقیدی افکار، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2004
- (22) ضیاء الحسن، ڈاکٹر، جدید اردو نظم آغاز و ارتقا، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، 2012
- (23) ظہور الدین، پروفیسر، فن ترجمہ نگاری، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی، 2006
- (24) عبادت بریلوی، اردو تنقید کا ارتقا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1996
- (25) عبادت بریلوی، جدید شاعری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1973
- (26) عبادت بریلوی، غزل اور مطالعہ غزل، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، 1955
- (27) عتیق اللہ، ڈاکٹر، آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم، اردو اکادمی، دہلی، 2011

- (28) علی احمد فاطمی، پروفیسر، مرتبہ نذافاضلی شخصیات سیریز ۲، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 2017
- (29) عنوان چشتی، اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت، اردو سماج جامعہ نگر، نئی دہلی، 1997
- (30) عنوان چشتی، اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، 1975
- (31) فراق گورکھپوری، اردو غزل گوئی، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، 1998
- (32) فرمان فتحپوری، ڈاکٹر، اردو شاعری کا فنی ارتقا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1999
- (33) قاضی مشتاق احمد، اردو شاعری میر سے پروین شا کرتک، ایچ ایس آفسیٹ پریس، دہلی، 2002
- (34) کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1985
- (35) گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ایڈیٹڈ پبلی کیشنز، ممبئی، 2004
- (36) گیان چند جین، ڈاکٹر، ادبی اصناف، گجرات اردو اکادمی، گاندھی نگر، 1989
- (37) محمد حسین شاہد رضوی، اردو کی دلچسپ اور غیر معروف صنعتیں، نورانی آفسیٹ پریس، مالیگاؤں، 2005
- (38) درسِ بلاغت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2014
- (39) محمد ذاکر، نذافاضلی شخص اور شاعر (تحقیقی مقالہ) جموں یونیورسٹی، جموں، 2016
- (40) محمد عسکری، آئینہ بلاغت، صدیق بک ڈپو، لکھنؤ، 1937
- (41) محمد یوسف رضا، نذافاضلی: حیات و جہات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2019
- (42) مسعود حسن رضوی ادیب، ہماری شاعری، مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ، 1935
- (43) مسعود حسین خان، مقدمہ تاریخ زبان اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2015
- (44) مظفر حنفی، جہات و جستجو، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1982
- (45) ممتاز الحق، ڈاکٹر، اردو غزل کی روایت اور ترقی پسند غزل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1999
- (46) ممتاز الحق، ڈاکٹر، جدید غزل کا فنی سیاسی و سماجی مطالعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1998
- (47) نثار احمد فاروقی، مرتبہ میر کی آپ بیتی، مکتبہ برہان اردو بازار، دہلی، 1957
- (48) وزیر آغا، نظم جدید کی کروٹیں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2000
- (49) وسیم بیگم، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو غزل تہذیبی مضمرات، ادبی تحریکات اور اہم شعرا، ایجوکیشنل

پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2009

رسائل و جرائد:

- (1) آج کل ماہنامہ، نئی دہلی، جلد: 74، شمارہ: 09، اپریل/2016
- (2) آج کل ماہنامہ، نئی دہلی، جلد: 74، شمارہ: 10، مئی/2016
- (3) اردو سہ ماہی، وسیم فرحت کارنجوی، نندا فاضلی نمبر، امراتوی، جلد: 04، شمارہ: 01، اکتوبر تا مارچ 2014-15/
- (4) اردو دنیا ماہنامہ، نئی دہلی، جلد: 18، شمارہ: 04، اپریل/2016
- (5) اردو دنیا ماہنامہ، نئی دہلی، جلد: 18، شمارہ: 12، دسمبر/2016
- (6) اردو دنیا ماہنامہ، نئی دہلی، جلد: 20، شمارہ: 10، اکتوبر/2018
- (7) اعتراف، وقار قادری، نندا فاضلی نمبر، ممبئی، اپریل/2005
- (8) انتساب عالمی سہ ماہی، ایم پی، شمارہ: 102، مئی تا جولائی/2016
- (9) انقلاب روزنامہ، ممبئی، فروری/2016
- (10) ایوان اردو ماہنامہ، دہلی، جلد: 29، شمارہ: 12، اپریل/2016
- (11) ایوان اردو ماہنامہ، دہلی، جلد: 30، شمارہ: 11، مارچ/2017
- (12) بیباک ماہنامہ، مالیگاؤں، جلد: 10، شمارہ: 118، اگست/2016
- (13) تمہید ماہنامہ، نظام آباد، جلد: 06، شمارہ: 09, 10, 11، ستمبر تا نومبر/2016
- (14) خبرنامہ ماہنامہ، اتر پردیش اردو اکادمی، جلد: 44، شمارہ: 11, 12، مئی جون/2016
- (15) سب رس ماہنامہ، حیدرآباد، جلد: 66، شمارہ: 05، مئی/2004
- (16) سب رس ماہنامہ، حیدرآباد، جلد: 78، شمارہ: 03، مارچ/2016
- (17) سب رس ماہنامہ، حیدرآباد، جلد: 78، شمارہ: 12، دسمبر/2016
- (18) شاعر ماہنامہ، ممبئی، جلد: 37، شمارہ: 01، سالنامہ/1966
- (19) شاعر ماہنامہ، ممبئی، جلد: 56، شمارہ: 06، سالنامہ/1985

- (20) شاعر ماہنامہ، ممبئی، جلد: 78، شماره: 09، 10، ستمبر اکتوبر/ 2016
- (21) عالمی میراث سہ ماہی، پونے، جلد: 02، شماره: 06، جولائی تا ستمبر/ 2019
- (22) فکر و تحقیق سہ ماہی، نئی دہلی، غزل نمبر، جلد: 16، شماره: 01، جنوری تا مارچ/ 2013
- (23) فکر و تحقیق سہ ماہی، نئی دہلی، نظم نمبر، جلد: 18، شماره: 01، جنوری تا مارچ/ 2015
- (24) فکر و تحقیق سہ ماہی، نئی دہلی، جلد: 21، شماره: 01، جنوری تا مارچ/ 2018
- (25) قومی زبان ماہنامہ، حیدرآباد، جلد: 01، شماره: 09، ستمبر/ 2016
- (26) کتاب نما ماہنامہ، نئی دہلی، ستمبر/ 2017
- (27) نیادور ماہنامہ، لکھنؤ، جلد: 71، شماره: 05، 06، اگست ستمبر/ 2016
- (28) نیادور ماہنامہ، لکھنؤ، جلد: 72، شماره: 11، فروری/ 2018
- (29) نیاورق سہ ماہی، ممبئی، شماره: 31، 2009
- (30) ہندستان روزنامہ، نئی دہلی، فروری/ 2016
- (31) ہندستانی زبان سہ ماہی، ممبئی، شماره: 02، اپریل تا جون/ 2016

انٹرویوز:

- (1) فون پرائیویٹ، تحریر فاضلی، سہ پہر 3 بجے، 11 نومبر/ 2019
- (2) فون پرائیویٹ، مالتی جوتی، شام 5 بجے، یکم جون/ 2019
- (3) ندافاضلی سے ایک انٹرویو، از ٹام آلٹر، 19 اگست/ 2017 (ادبی کاک ٹیل)
- (4) ندافاضلی سے ایک انٹرویو، از حسن کاظمی، 28 نومبر/ 2011 (اردو منزل)
- (5) ندافاضلی سے ایک انٹرویو، از رند رکول، 02 جون/ 2013 (ٹیک ون ٹی وی)
- (6) ندافاضلی سے ایک انٹرویو، از مرمدغل، 28 اگست/ 2014 (ریختہ شاعری)